مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
کے فکر انگیز خطبات کا مجموعہ

خطباتِ علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

جمع و ترتیب
مولوی محمد رمضان میاں صاحب
جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن - کراچی

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی ۱

خطباتِ علی میاںؒ

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
کے فکر انگیز خطبات کا مجموعہ

خطباتِ علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

جلد ششم

علم و دانش

جمع و ترتیب:
مولوی محمد رمضان میاں نیپالی
جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی

دار الاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی

طباعت : اکتوبر ۲۰۰۲ء علمی گرافکس پرنٹنگ پریس، کراچی۔

ضخامت : 424 صفحات

......ملنے کے پتے.........

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
کشمیر بکڈپو۔ چنیوٹ بازار فیصل آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔ اردو بازار لاہور
ادارۂ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی

مکتبۃ الحرمین، مدرسۃ الحرمین للت پور (کاٹھمنڈو) نیپال
حاجی بک شاپ نیپالی جامع مسجد، دربار مارگ، کاٹھمنڈو
دارالعلوم ہدایت الاسلام، انروا بازار، سنسری، نیپال

فہرست عنوانات

عنوان	صفحہ

صفحہ	عنوان

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ
اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی	۲۹۷
فراغت کا غلط تخیل:	۲۹۸
اخلاص:	۲۹۸
جذبۂ قربانی:	۲۹۹
جوہر ذاتی:	۲۹۹
آخری بات:	۳۰۰
علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں	۳۰۱
علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں:	۳۰۱
مسلم حکومتوں میں علماء کا کارنامہ:	۳۰۲
مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح:	۳۰۲
یہ دین جہالت سے نہیں بلکہ علم سے پیدا ہوا ہے:	۳۰۳
عیسائیت مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی:	۳۰۴
اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے:	۳۰۵
اسلام زمانہ کا رفیق ہی نہیں بلکہ راہنما ہے:	۳۰۵
اسلام کو ہر مفاد پر ترجیح دیجئے:	۳۰۶
ایثار و قربانی:	۳۰۸
اسلام اور علم کا دائمی رشتہ	۳۱۱
اسلام اور علم کا رابطہ	۳۱۱
پہلی وحی میں علم و قلم کا تذکرہ	۳۱۲
تعلیم و تعلم کی ضرورت اور اس کا انتظام	۳۱۳
حفاظت قرآن کا مفہوم	۳۱۳

عنوان	صفحہ

انتساب

خطبات علی میاں جلد ششم کو اپنے ان تمام مہربان اساتذہ
کے نذر کرتا ہوں جن کی شفقت اور خصوصی توجہ کے سایۂ عاطفت
تلے بندہ علوم نبوت کی پیاس بجھاتا رہا، میں تو باد سموم کا شکار تھا
انہی قابل احترام شخصیات نے مجھے انتہائی محنت کے نسیم جانفزا
کے جھونکوں سے ہمکنار کیا!

ے اک توشۂ امید کرم لے کے چلا ہوں
کچھ اس کے سوا پاس نہیں زاد سفر اور

محمد رمضان میاں نیپالی عفا اللہ عنہ

خطبات کی اہمیت

قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم :

علیکم بمجالسة العلماء واستماع کلام الحکماء ، فان الله تعالیٰ یحی القلب المیت بنور الحکمة کما یحی الارض المیتة بماء المطر ۔ (الحدیث)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا!

اہل علم کی ہم نشینی اور اہل حکمت کا کلام سننے کو خود پر لازم کرلو، اس لئے کہ حق تعالیٰ جل شانہ قلبِ مردہ کو نورِ حکمت سے ایسے زندہ فرماتے ہیں جیسے مردہ زمین کو بارش کے پانی سے۔

بحوالہ منبہات ابن حجر عسقلانیؒ

خامہ فرسائی

سراپا شکر وامتنان ہوں اس ذات بابرکت کا جس نے اس ناچیز کو اپنے ایک محبوب بندے کے ارشادات وخطبات کو جمع کرنے کی توفیق بخشی۔ وماتوفیقی الاباللہ العلی العظیم۔

خطبات علی میاںؒ کی چھٹی جلد (علم ودانش) آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جس قدر روحانی اور قلبی اطمینان ہورہا ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے۔

مولانا علی میاںؒ کی ہشت پہلو شخصیت میں سے سب سے نمایاں اور واضح پہلو ان کا ایک داعی ومربی ہونا ہے، حضرت مولاناؒ کی ساری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے، بیس برس کی عمر سے شروع ہونے والا سفر حیاتِ عارضی کے آخری لمحے تک جاری رہا، انہوں نے جس بے تکلفی، سادگی اور برجستگی کے ساتھ علماء وطلبہ کے مجمع میں تقریریں فرمائی ہیں شاید ہی کوئی دوسرا طبقہ اس وصف میں ان کا ہمسر ہو، خود مولانا علی میاںؒ کے ان الفاظ میں جو وہ اکثر طلبہ کے سامنے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ ''آپ سے مجھے کسی قسم کا تکلف نہیں اس لئے کسی بناوٹی یا تصنع آمیز بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں''

اس چھٹی جلد کی اکثر وبیشتر تقریریں عصری درسگاہوں میں کی گئی ہیں اور مذہبی جامعات ودارالعلوم میں بھی، ان کے مخاطب جہاں مذہبی ودینی جامعات کے اہلِ فضل علماء کرام اور طالبانِ علوم نبوت ہیں وہیں عصری علوم وفنی درسگاہوں کے طلبہ اور ماہر اساتذہ بھی شامل ہیں اور کسی درجہ میں ان جامعات کے خیر خواہ مخلص اور معاونین بھی حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ کے مخاطب ہیں، اس جلد میں طلبہ وعلماء کی علمی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مولاناؒ کی علمی ومطالعاتی زندگی سے متعلق ایک چھوٹا سا مضمون بھی شامل کیا گیا ہے، نصاب تعلیم سے متعلق چند مفید ودقیق سوالوں کے جوابات کو بھی شامل کیا گیا، انشاءاللہ یہ مضامین کافی مفید ثابت ہونگے۔

الحمدللہ مجھے پچھلی جلدوں کی طرح اس جلد میں بھی اپنے سابقہ معاونین کا ہر قسم کا تعاون حاصل رہا، ان منتشر خطبات کو ترتیب کی لڑی میں پروکر منصۂ شہود پر لانے کی تمام عرق ریزیوں اور دلسوزیوں میں میرے رفقاء برابر کے شریک رہے ہیں۔

خصوصاً مولوی سید عدنان کاکاخیل[1] سلمہ اللہ کہ موصوف نے کتاب کی ترتیب میں وہ قابل قدر معاونت فرمائی جس کا بندہ صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ زادہ اللہ علما و شرفا۔ اسی طرح ادارۂ تحقیقات اسلامی (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی) اسلام آباد کے کتب خانہ[2] کے ناظم اوران کا تمام عملہ جو تلاش بسیار کے دشوار کام میں مخلصانہ معاونت کرتے رہے اور سب سے اخیر میں سب سے زیادہ سپاس گزار ہوں اپنے محترم استاذ جناب علاء الدین فلاحی حفظہ اللہ کا جنکی رہنمائی واصابت رائے ہر قدم پر دستگیر رہی۔ اللہ تعالی ان تمام مخلصین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

والسلام
راقم عاجز محمد رمضان میاں (نیپالی) عفا اللہ عنہ
یکے از کفش بردار مولانا علی میاں رحمہ اللہ
۵/شوال المکرم ۱۴۲۳ھ
۱۰/دسمبر ۲۰۰۲ء بروز منگل

---

(۱) نبیرۂ حضرت مولانا عبدالحق نافع گل رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ، سابق شیخ الحدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی۔
(۲) ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری شعبہ مجلات

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

۱۹۴۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ترجمان الندوہ نے برصغیر کے مشاہیر اہل علم و دانش کو دعوت دی تھی کہ وہ طلبہ اور اہل ذوق کے لئے ان کتابوں کی نشاندہی کریں جنہوں نے ان کی سوچ اور اخلاق و کردار کی تعمیر میں خاص حصہ لیا ہے۔ مولانا علی میاں نے بھی (جب ان کی عمر ۳۳ برس تھی) اپنے تاثرات و تجربات قلم بند کئے۔ یہ مضمون دوسرے مضامین کی ساتھ مولانا محمد عمران خان نے مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں (اعظم گڑھ مطبع معارف، س۔ن) میں شامل کرلیا تھا۔ بعدازاں ۱۹۷۲ء میں ماہنامہ الحق (اکوڑہ خٹک) کے مدیر کی فرمائش پر مولانا علی میاں نے ۱۹۴۵ء میں لکھے گئے مضمون پر نظر ثانی کی اور اس میں جا بجا اضافے کئے تاہم جن کتابوں کا تذکرہ پہلی بار کیا گیا تھا، کم وبیش وہی رہیں، بعد میں انہوں نے اپنی علمی و تصنیفی اور تدریسی زندگی میں بلاشبہ سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا جن پر تبصرہ کیا جانا مشکل تھا مضمون پر نظر ثانی کرتے ہوئے مولانا علی میاں نے بجا طور پر لکھا تھا اس کا طرز واقعاتی اور سوانحی ہے تنقیدی اور تحقیقی نہیں، اس لئے ذہن پر مطالعہ کے جو اثرات پڑے ان کو بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کردیا ہے مصنفین کے خیالات، مسلک اور طرز فکر کی پوری ذمہ داری نہیں لی گئی اور نہ کسی ایسی کتاب اور مصنف کا ذکر محض اس کے مفید یا بلند پایہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے جس کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی یا ذہن وشعور نے اس سے کوئی گہرا اور دیرپا تاثر قبول نہیں کیا، اس لئے اس فہرست میں سے کسی کتاب یا مصنف کے نظر انداز ہوجانے کے معنی اس کی عدم افادیت یا تنقیص نہیں ہے۔ مولانا نے نظر ثانی کرتے ہوئے جو چند حواشی لکھے تھے، وہ ان کے نام کے اظہار کے ساتھ باقی حواشی سے الگ کردیے گئے ہیں۔ (مرتب)[1]

خاکسار کا خاندان ایک خزاں رسیدہ دینی خانوادہ ہے[2] جس کے بزرگوں نے کبھی فصل خزاں میں بھی دنیا کو پیام بہار سنایا تھا، ہندوستان میں جب دین کی بہار آخر ہوئی تو اس

(۱) حیات افکار کے چند پہلو، مصنفہ جناب سفیر اختر صاحب

خاندان پر بھی تنزل آیا، ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دین داری جوانوں سے زیادہ بوڑھوں میں، اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔

میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی نے ۱۹۲۳ء کے شروع میں انتقال کیا، میری عمر اس وقت دس سال کی تھی، میرے بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب لکھنؤ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا، اور بھائی صاحب کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بعض بزرگوں سے فارسی کتابیں پڑھتا تھا اور لکھنؤ بھائی صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔

خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و مشغلہ کی ضرورت ہوتی، ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں اور ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق صاحب کلامی، م ۱۳۳۴ھ۔۱۹۱۶ء) کی منظوم ''فتوح الشام''۳ پڑھی جاتی۔

سید عبدالرزاق صاحب کلامی مرحوم، حضرت سید احمد شہید کے ہمشیر زادہ منشی سید حمید الدین صاحب کے پوتے اور ان کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمٰن صاحب کے نواسے تھے۔ واقدی کی عربی ''فتوح الشام'' کو کلامی صاحب نے بڑی قادر الکلامی اور جوش و دلی جذبہ کے ساتھ پچیس ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے چونکہ ان کو اس کا طبعی ذوق تھا، اور جہاد و حرارت ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے منتقل ہوئی تھی جس نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو گرما دیا تھا اس لئے نظم میں جوش و اثر اور کلام میں آمد ہے۔ حضرت خالد سے شاعر کو عشق تھا، اور خواب میں بار بار ان کی زیارتیں ہوئی تھیں، اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اشعار میں خاص روح اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بڑی خالہ سیدہ صالحہ مرحومہ جو قرآن مجید کی بھی حافظہ تھیں، یہ منظوم ''فتوح الشام'' بڑے پر اثر و دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہوگئی تھی۔ عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام لئے آجاتے، اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے کبھی بارادہ بیٹھ جاتے اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقعہ دیتیں، پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔

میری خالہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف، لیکن پر اثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل امنڈ آتے، حضرت خالدؓ، حضرت ضرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہؓ بنت الازور اور دوسرے صحابہ کرامؓ و مجاہدین شام کی جاں بازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا، کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا چھینٹا ہمارے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا، اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا "فتوح الشام" کی ان زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت و عظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق، اور جہاد کو مدافعانہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی۔ خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکے جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کیے جائیں، پھر وہ نقش جس کو بچپن کے پاک آنسوں نے پائیداری بخشی ہو۔

اتانی هو ا هاقبل ان اعرف الهویٰ
فصادف　قلباً　خالیاً　فتمکنا

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب (عیسائیوں) کے خلاف جس کے مقدر میں قیامت تک کے لئے اسلام کا عالم گیر حریف و مد مقابل بننا لکھ دیا گیا ہے، اور جس کی قائم مقامی اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے، ایک حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہو گیا جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و حالات کبھی غالب نہیں آسکے۔

اس وقت شرفاء کے خاندانوں میں "مسدس حالی" کا عام رواج تھا۔ اس کے اشعار لوگوں کے نوک زبان تھے، تقریروں اور مواعظ میں جا بجا اس کے اشعار سے کام لیا جاتا، مضامین میں نقل کیے جاتے۔ میں نے بھی "مسدس" کو بڑے جوش و لطف سے بار بار پڑھا، اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں، اور ان انعامی مضامین میں جو مقابلہ کے لئے لکھے جاتے، بار بار نقل کیے۔ اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ دل و دماغ پر "مسدس" کا اچھا خاصا اثر رہ چکا ہے، عام استعداد و معلومات میں اضافہ کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ برسوں بعد مغربی مورخین و مصنفین کی یہ کوشش بالکل بے اثر رہی کہ جاہلیت عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خوردبین سے

دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی، اور کوہ آتش فشاں پھٹنے کو تھا کہ موقع شناسی سے بروقت اس کو چنگاری دکھادی گئی۔ اسلامی انقلاب کی پیغمبرانہ عظمت اور رسول اللہ ﷺ کے معجزہ کی اہمیت کو گھٹانے کی یہ علمی سازش مولانا حالی کے ان پراثر اور سادے چند بندوں پر غالب نہ آسکی جن میں انہوں نے جاہلیت کا نقشہ اور اس کی اخلاقی پستی کی تصویر کھینچی ہے۔ نہ بعض قوم پرست عربوں کے مضامین اور تالیفات متاثر کرسکیں جو اپنی قومیت کے جوش میں کبھی کبھی جاہلیت کی طرف سے مدافعت کرنے لگتے ہیں، اور اس کے روشن پہلو کے دکھانے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

میرے گھر کا ماحول دادا صاحب (مولوی سید فخر الدین صاحب خیالی) اور والد صاحب کی وجہ سے جو جید عالم اور عربی کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیب و نقاد بھی تھے، دینی کے ساتھ ادبی بھی تھا۔ بہت بچپن ہی سے اردو نثر و نظم کی درسی و غیر درسی کتابیں ہم بھائی بہنوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری کی بہت سے کتابیں اس زمانہ میں پڑھ لیں، اس زمانہ میں عام طور پر مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی کا اردو نصاب ''کمک اردو'' سوادِ اردو اور سفینہ اردو'' رائج تھا۔ ہندوستان کا سر رشتہ تعلیم ان کتابوں سے بہتر کتابیں مرتب نہیں کرواسکا، ان میں سفینہ اردو کا اثر آج تک دل و دماغ پر باقی ہے۔ تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد اور ذہنی بلوغ وارتقاء کی بہت سی منازل طے کرلینے کے باوجود اب بھی اگر وہ کتاب ہاتھ آجائے (جو افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے) تو شاید سب کام چھوڑ کر اسی کو پڑھنے لگوں اور بچپن کی یاد تازہ کروں اور کم سے کم اپنی چند پسندیدہ نظمیں اور مضامین، مولوی ظفر علی خاں بی۔اے علیگ کی نظم راجہ دسرت کی کہانی'' اور حیدرآباد کے طوفان پر ان کی نظم ''اونا مرادندی'' سید سجاد حیدر یلدرم کا مضمون ''مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ'' کو ایک بار بڑھے بغیر کتاب ہاتھ سے رکھنی مشکل ہو جائے۔ اس غیر شعوری مطالعہ کا یہ فائدہ ہوا کہ زبان کا لطف اور ذوق زندگی کے ہر دور میں ساتھ رہا اور تحریر وانشاء میں کبھی مولویانہ خشکی پیدا نہ ہونے پائی۔ میرے خیال میں ابتدائے عمر میں سلیس وشگفتہ زبان اور اچھے مصنفین کی کتابوں کا پڑھنا جو سلیس و شیریں زبان میں اپنے خیالات ادا کرنے کے عادی ہیں، بہت مفید اور ایک حد تک ضروری ہے، ورنہ نئی نسل اور نئے عہد سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور دعوت وتلقین کا

پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالب علمی کے اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے پڑھا اور جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ قاضی سلیمان صاحب منصور پوری مرحوم کی سیرت رحمۃ للعالمین کا پہلا حصہ ہے، مجھے یہ کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اسکی دونوں جلدوں کا بعض دوسری کتابوں کے ساتھ وی۔ پی رائے بریلی آیا ہے اور اس کے چھڑانے کے لئے اس وقت روپیہ نہ تھا، تو میں نے بے اختیار رونا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی، بار بار پڑھی کئی جگہ اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ بعض خاص مقامات کا ہمیشہ خاص اثر پڑتا تھا۔ اسلام کے ابتدائی مبلغین کے واقعات حضرت مصعب بن عمیر کی مکی و مدنی زندگی کا مقابلہ، ان کی والہانہ کیفیت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ میں تشریف آوری اور حضرات انصار کی مسرت استقبال اور جان نثاری، انصار کا ایثار اور مہاجرین کے ساتھ ان کی دینی محبت آنحضرت ﷺ کی وفات کے واقعات و حالات کا دل پر خاص اثر پڑتا تھا ٹہل ٹہل کر کران کو پڑھتا تھا، لوگوں کو سناتا تھا اور اسی زندگی کی تمنائیں دل میں پیدا ہوتی تھیں قاضی سلیمان صاحب کے درجات اللہ بلند فرمائے، اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے، اس نے سب سے پہلے سرور کائنات ﷺ کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی اور عالم خس و خاشاک ہے۔

در خرمن کائنات کردیم نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

انہی دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی الفاروق آ گئی۔ مطبع نامی۔ کانپور کی چھپی ہوئی، سراپا تصویر پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ عراق کی جنگوں بویب، جسر، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ و برجستہ جملوں میں کھینچی ہے، شاید اس سے زیادہ فردوسی ''شاہنامہ'' میں مسلسل اشعار اور پرشکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کر سکا ''الفاروق'' کے جاندار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر و سناں کا کام کرتے ہیں۔ مولانا نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے، اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی، اور اب اس سے کوئی

دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔

مولانا کی دوسری کتاب جو اس دور میں پڑھی، سفرنامہ روم ومصر وشام، تھی۔ اتفاق سے یہی دو کتابیں ہمارے گاؤں کے محدود ذخیرہ کتب میں تھیں۔ آخر الذکر کتاب سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا، ذہن میں وسعت پیدا ہوئی، اور کیا عجب ہے کہ اول اسی کتاب سے دنیائے اسلام کی سیاست کا شوق پیدا ہوا ہو جس کی نوبت برسوں بعد آئی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کی سوانحی تصنیفات ''الغزالی''، ''سوانح مولانا روم'' اور ''المامون'' پڑھیں۔ غالباً اسی وقت سے ذہن نے یہ اثر قبول کیا کہ سوانح حیات اور تذکرہ نگاری کے لئے اس سے بہتر اسلوب اور زبان جدید اردو میں پائی نہیں جاتی، اور غیر ارادی طریقہ پر ان تذکروں اور تاریخ دعوت وعزیمت کے سلسلہ میں جو راقم کے قلم سے نکلا، اس کو اختیار کیا گیا۔ افسوس ہے کہ شعر العجم کے پڑھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی جس کو میں اپنے موضوع پر منفرد اور مولانا کا شاہکار سمجھتا ہوں۔ اس تاخیر میں غالباً میری فارسی کی کم لیاقتی کو دخل تھا۔

عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب حسنی مرحوم ایم۔اے، استاد اورینٹل کالج۔ لاہور کی صحبت اور مجلسوں میں ''آب حیات'' سے تعارف ہوا سنی اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گیا جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔ گل رعنا، گھر کی کتاب تھی، اس کو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہو گئی کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برق لکھنؤ کی ٹکسالی زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ لکھنؤ کے محاورات اور صحت وصفائی زبان میں وہ سند کا درجہ رکھتے تھی سخن شناس بھی تھے اور سخن سنج بھی، ابتداء میں شمس لکھنوی کو کلام دکھاتے تھے، پھر آغا ثاقب قزلباش لکھنوی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے اور انہیں کے رنگ کی پیروی کی، ان کی صحبت میں زبان کا ذوق اور اچھے برے کی تمیز پیدا ہوئی۔ ان کے چھوٹے بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر وشاعری کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں

سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر تحریر کے مقابلے کرواتے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر مومن غالب، ذوق اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتش اور امیر مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔ اس زمانہ میں اودھ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرہ کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان وادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر اردو کا ایک مرصع نمونہ ہے، بہت اثر پڑا۔ بہت دنوں تک نیرنگ خیال اور آب حیات'' کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کیے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدہ سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دیجائے بے کار و بے اثر نہیں رہتی، اپنا اچھا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لئے اس کا دعوی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب یاد ایام کا تھا جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے، اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ، زبان بانکپن بھی موجود ہے جو میرے علم میں مصنف'' گل رعنا، اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے اس طرز پر میرا مضمون جواب یاد آتا ہے اندلس پر تھا۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے استاد شیخ خلیل عرب بن محمد بن شیخ حسین یمنی (محدث بھوپال) نے ہمیشہ کے لئے دل پر توحید کا نقش قائم کر دینے کے لئے سورۂ زمر بڑی توجہ اور ذوق وشوق سے پڑھائی، عربی ادب اور بالخصوص عربی شعر کا عرب صاحب مرحوم کو اللہ نے ایسا فطری ذوق بخشا تھا، جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ وہ اس قوم کے فرد تھے جس کے متعلق زبان نبوت نے شہادت دی ہے کہ ایمان اس کے گھر کی دولت ہے (الایمان یمان) عجم کا

حسن طبیعت نھیال سے اور عرب کا سوز دروں انہوں نے ددھیال سے پایا تھا۔ قرآن مجید پڑھتے تھے تو خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے، قصائد پڑھتے تھے، تو سوق عکاظ کا نقشہ کھینچ دیتے تھے۔ توحید ان کا ذوقی مضمون تھا، دل کھول کر پڑھایا اور دل کو توحید کے لئے کھول دیا وہ دن ہے اور آج کا دن، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ **الا لله الدين الخالص** (سورہ زمر) کا نقش قائم ہے، اور اس کے سامنے **مانعبد هم الا ليقر بو نا الى الله زلفا** (زمر) (مشرکین کہتے ہیں کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کردیں) کا حیلہ اور دعویٰ، جو ہمیشہ کے نظام شرک کا سب سے بڑا فلسفہ ہے، تارعنکبوت معلوم ہوتا ہے۔ ادب میں شیخ خلیل عرب کا ایک مجتہدانہ نصاب تھا، جو ہندوستان میں بالکل نیا تھا، ان کو اپنا ذوق تلامذہ کی طرف منتقل کرنے میں خاص کمال حاصل تھا، انہوں نے مبادی صرف اور تحریر وانشاء کی مشق کے ساتھ مصر و بیروت کے سلسلہ قرأت (ریڈرس) المطالا العربیہ الطریقۃ المبتکر ۃ (۱۵اجزاء)، مدارج القراءۃ (ایک جزء) کے بعد ابن المقفع کی ''کلیلہ ودمنہ''، ''مجموعۃ من النظم والنثر'' حصہ نثر کا ایک حصہ حفظا اور حصہ نظم نہج البلاغہ حصہ کتب، اور نظم میں ''حماسہ'' اور معری کی ''سقط الزند'' اور ''دلائل الاعجاز للجر جانی'' بڑے ذوق وشوق سے نیز ''مختصر تاریخ ادب اللغۃ العربیہ'' پڑھائی، عربی کے قواعد زبان کی مشق میں سب سے بڑا احسان اس گمنام کے نامور ہم نام ابوالحسن علی الضریر کے رسالہ ''الضریری'' کا ہے، جو چند اوراق کی کتاب ہے۔ عرب صاحب نے اس کی عملی مشق کرائی، اور یہی مشق اس وقت تک کام آرہی ہے۔ اس تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک وقت میں مختلف علوم وفنون اور زبانوں کی تعلیم نہ تھی صرف عربی زبان وادب کی تعلیم تھی اور وہی اوڑھنا بچھونا، وہی مقصد حیات اور وہی ذوق طبع۔

عرب صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے محبوب ومنتخب مصنفین اور ان کی محبوب ومنتخب تصنیفات کو اس طرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے، گویا وہی زبان وادب اور طرز ادا کا واحد نمونہ اور ادب وذوق کا منتہٰی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیل پر حاوی ہوجاتے تھے، اور طالب علم ان کا رنگ اتارنے لگتے تھے۔ ابن المقفع اور جاحظ نثر میں، عبدالقاہر جرجانی ذوق، نقد ادب اور سخن فہمی میں متنبی وبختری شعر میں ان کے منتخب لوگ تھے، اس لئے ان کے طلبہ اپنی بڑی سعادت اور کمال سمجھتے تھے کہ ان میں ان کا رنگ اور انداز پیدا

ہو جائے۔ راقم الحروف نے ابن المقفع اور صاحب نہج البلاغہ نیز کبھی کبھی جرجانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی اور اس کا بڑا فائدہ ہوا۔ عرب صاحب کا ایک تعلیمی نکتہ یہ بھی تھا کہ وہ طلبہ کے دماغ پر یہ نقش قائم کر دیتے تھے کہ ادب ونثر کا ترکہ صاحب ذوق طلبہ کی میراث ہے، جس کے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں انہیں باک نہیں ہونی چاہیے، چنانچہ ان کی ہمت افزائی سے کبھی کبھی ان صاحب طرز انشاء پردازوں کے بعض بعض جملے اور تعبیریں اپنی تحریر میں نگینہ کی طرح جڑ کر انعام حاصل کیا۔

اس تعلیم کے انتہائی مرحلہ پر مصر کے مشہور صاحب طرز نثار سید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کی کتاب ''النظرات'' عرب صاحب نے دیکھنے کو دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا، اس کے عنوانوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار ہوا کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اڑائی۔

میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب جیسا متبحر استاد نصیب ہوا، جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوئلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد، اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے مجاز تھے۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے، مولانا کی صحبت تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ تھے، اور ندوۃ العلماء کا نادر علمی ذخیرہ اور مولانا کے علمی مآخذ تھے۔

مولانا کے یہاں تعلیم کی دوسری خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے فن کا ذوق اور اس کا کچھ (بہ قدر استعداد وتوفیق) عملی ملکہ حاصل ہو جایا کرتا تھا ایک یہ کہ تعلیم بالکل ناقدانہ اور محدثانہ اصول پر تھی، مولانا کو مذہب حنفی پر کلیۃً اطمینان تھا اور وہ اس کے زبردست وکیل وترجمان تھے، لیکن ان کا درس حدیث محدثانہ طرز اور نقد حدیث اصول حدیث ورجال کے بحثوں پر مبنی تھا، اور اس میں ہندوستانی طرز تدریس حدیث سے زیادہ یمنی طرز حدیث، اور شوکانی کے طرز تالیف کا اثر تھا۔ شوکانی کی تالیف نیل الاوطار اس کا ایک نمونہ ہے۔ محدثین میں خصوصاً محمد بن ابراہیم الوزیر اور محمد بن اسمٰعیل الامیر اور علامہ مقبلی کی تالیف اور اصول حدیث کے بعض نوادر ان کے خاص مآخذ تھے جن میں تنقیح الانظار اور توضیح الافکار کے قلمی وشرح کے مسودات خاص طور پر

قابل ذکر ہیں۔ دوسری چیزوں کے مقابلہ میں علامہ ابن الترکمانی کی الجوہر النقی امام زیلعی کی نصب الرایہ سے بہت مدد لیتے تھے اور حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقد حدیث کے علم استاد کے ساتھ شریک عمل ہوتے تھے۔ مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول مذاہب کے دلائل رجال پر نقد وجرح کی بحثیں نکلواتے تھے اس طرح تدریس وتالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے۔

درس حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نووی کی ''شرح مسلم'' سے ہوا، جو ایک مبتدی طالب علم کے لئے بڑا اچھا استاد ہے۔ شروح حدیث سے فائدہ اٹھانے اور ذہن پر زور ڈالنے کا ملکہ اسی سے پیدا ہوا فتح الباری سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں آئی، اس وقت حافظ ابن حجر کی وسعت نظر فن حدیث پر ان کی قدرت اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احتواء دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے جس کی نظیر سے دوسری ملکوں کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں وجد وسرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، قلبی طور پر سب سے زیادہ اثر ابوداؤد کی ''کتاب الادعیہ'' اور ترمذی کی ''کتاب الزہد والرقاق'' نے ڈالا۔

اسی زمانہ میں احیاء العلوم دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس میں بڑے بھائی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

۱۹۳۰ء میں شیخ خلیل عرب کی تجویز اور بھائی صاحب کی دعوت پر دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریس ادب کے لئے ایک فاضل ومحقق صاحب زبان مراکشی عالم تشریف لائے، یہ علامہ شیخ تقی الدین ہلالی تھے، جن کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان وادب کے بہت سے مبادی وبدیہیات، زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق واصول نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے، اور عجمیت وہندیت کے اثر سے کلیۃ آزادی نصیب نہ ہوتی۔ ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو قرن ثانی وثالث کی زبان کو مردہ اور صرف کاغذ کے نقش ونگار سمجھتے، اس ایک شخص میں سلف کی احتیاط اور علمی تورع (عدم تحقیق کی حالت میں بے تکلف لا ادری کہہ دینا)، مغرب اقصیٰ خصوصا اہل شنقیط کا حفظ و استحضار اہل لغت کا اتقان، علمائے نحو کی پختگی اور اہل زبان کی شیریں نوائی اور خوش گفتاری جمع تھی بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر جملہ ادب کی جان ہوتا تھا جس کو آدمی

جس ادب کی کتاب کے حاشیہ پر چاہے لکھ لے، میں نے "اغانی" اور جاحظ کی کتابوں کی زبان بولتے ہوئے ان کے سوا کسی کو نہیں سنا، جو لکھتے تھے، وہی بولتے تھے اور جو بولتے تھے وہی عربی زبان کا روزمرہ اور محاورہ ہے۔

ہلالی صاحب سے عربی ادب وشعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس سے زیادہ مفید ان کی صحبت اور مجالس وسفر کی رفاقت تھی، ان کی صحبت وافادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں، ایک تو یہ کہ زبان اور ادب میں فرق ہے۔ زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان کی بنیاد کے کاخ وایوان اور زبان کی دیوار کے نقش ونگار ہیں، ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے جو تمدن وتخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان کی تعلیم وتربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے۔ ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جارہی ہے، جو اکثر اوقات بے بنیاد اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ ہلالی صاحب کہتے تھے کہ حریری اور متنبّی وحماسہ ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں جو بلاد عربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں، اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلاء ان کو پڑھتے ہیں، لیکن ہندوستان میں یہی کتابیں ادب کا کل سرمایہ اور جمع خرچ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھا جائے، ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ زبان کو انسانی زبان کی طرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہئے، اس پر شیخ نے دارالعلوم میں مسلسل تقریریں کیں، اور اپنے مدعا کو دلائل سے ثابت کیا۔

دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ صرف ونحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں، جن کا درجہ زبان کے بعد ہے۔ زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف ونحو کے قواعد بے کار ہیں۔ مفردات، الفاظ وجمل مکان کی اینٹیں ہیں، اور نحو کا علم اصول تعمیر کے قواعد اور انجینئری کا فن۔ اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں تو انجینئرنگ اور اصول تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

ہلالی صاحب سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زبان کا بہترین نمونہ تاریخ کی مستند کتابیں اور عہد عباسی کے ادباء کی غیر مصنوعی تصنیفات ہیں، اس کے لئے انہوں نے ابن قتیبہ کی

الامامۃ والسیاسۃ، ابن المقفع کی کلیلہ ودمنہ ابوالفرج الاصبہانی کی کتاب الاغانی اور جاحظ کے رسائل کی سفارش کی۔

یہ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار کا تھا۔ ادھر ہلالی صاحب کا فیض عام تھا، ادھر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی عربی کا رسالہ الضیاء نکال رہے تھے، عربی زبان و تحریر نقد وتبصرہ گویا اوڑھنا بچھونا ہو رہا تھا۔ مصری، شامی عراقی اور مغربی (الجزائری ومراکشی) رسائل و جرائد تبادلہ میں آتے تھے، پڑھے جاتے تھے، اوان پر گفتگو رہتی تھی۔ یہ میری عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا۔ عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے اور عرب اساتذہ کی صحبت میں رہنے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصہ سمجھ میں نہ آتا اس لئے نہیں کہ ہندوستانی علماء کے بقول (جو سراسر غلط فہمی ہے)

یہ کسی جدید عربی میں ہوتے تھے، بلکہ طرز ادا اور اشتقاق کی ناواقفیت کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ اور تعبیر اور اظہار خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی، ادب وزبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔ مصری وشامی ادباء وفضلاء کے مضامین پڑھ کر ان کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکہ دل پر بیٹھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خزانہ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سربمہر تھے، وہ اپنے اخبارات ورسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے ہیں، اور امیر شکیب ارسلان کے بقول عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا، وہ اس عصر کا ادیب وصحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے لیکن معنوی وذہنی حیثیت سے ذوق ودماغ پر ان مضامین کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا اور ہمارے ہندی ذوق نے جس نے ہندوستان کے زیادہ سنجیدہ زیادہ گہرے اور زیادہ طاقتور اسلامی ادبیات اور ماحول میں نشو ونما پائی تھی، عربوں کے قوم پرست اور وطنی افکار مغرب سے ذہنی مرعوبیت اور خیالات کی سطحیت کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا اور ذہن نے اس کی پستی اور کمزوری صاف محسوس کی۔ ان مضامین کو میں نے ہمیشہ روحانی اذیت اور ذہنی کوفت کے ساتھ پڑھا اس حیثیت سے امیر شکیب ارسلان کی تحریروں اور خیالات میں نسبتاً کچھ گہرائی اور پختگی اور اسلامیت معلوم ہوئی، لیکن امت اسلامیہ کے امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز میں اس وقت جس شخص کے خیالات وافکار میں نسبتاً زیدہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی، اور

جس کی فراست نے متاثر کیا، وہ سید عبدالرحمٰن الکواکبی کی تخیلی کتاب ''ام القریٰ'' ہے، جواب پرانی ہو چکی ہے، اور اس کے لائق مصنف کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں لیکن بعد میں یہ دیکھ کر کہ وہ قومیت عربیہ کے اولین نقیبوں میں ہیں، اور انہوں نے سب سے پہلے دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں میں بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی، دل پھیکا ہو گیا اور عقیدت میں کمی آئی۔

۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں رسالہ توحید'' امرتسر میں جو مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا، تیرھویں صدی کا مجدد اعظم'' کے عنوان سے حضرت سید احمد شہید کے متعلق مولوی محی الدین قصوری مرحوم کا ایک سلسلہ مضمون شائع ہوا۔ بھائی صاحب کے حکم سے ۱۹۲۹ء۔۱۹۳۰ء میں میں نے اس کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو ہلالی صاحب کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار میں بھی شائع کیا، اور ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید کے نام سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی چھاپ دیا، اس موضوع سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔

میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا، اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیم کی ''زادالمعاد میرا کتب خانہ، میری رفیق سفر اور میری گویا اتالیق و معلم تھی۔ دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی ایک کتاب میں ملنا مشکل ہے۔ اگر مجھے کبھی پورے ذخیرۂ علمی سے محروم کر دیا جائے، اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے، تو میں کتاب اللہ اور ''زادالمعاد'' اپنے ساتھ رکھوں گا، اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے، روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے، اور سنت کا ضروری علم بخشا۔

ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتہ رحمت بن کر سامنے آئیں، ان میں سے زیادہ موثر اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب ''قیام اللیل ہے۔ اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں، بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رخ بدل دیتی ہے اور سارا کھیل دلچسپی اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے موثر واقعات لکھے ہیں، اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پر اثر تفسیر اور قیام لیل کے فضائل جمع کیے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں، اور اپنا اثر کر جائیں تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہ کی تفسیر سورۃ النور نے بھی اس پرآشوب زمانہ میں دستگیری کی یہ اور حافظ

ابن قیم کی "الجواب الکافی" نوجوانی میں بہترین نگران اور اتالیق، اور اخلاقی محتسب و ناصح ہیں۔ زمانہ تعلیم کے بے شعور دور میں جس کتاب نے تعلیم سے اور معلمین سے نفع اٹھانے اور ان کے احترام اور طالب علمی کے آداب کا لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا وہ صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی چھوٹی سی کتاب "تعلیم المتعلم" ہے۔ اسی طرح تحصیل علم میں علوئے ہمت، عزیمت اور ذوق علم پیدا کرنے میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کی کتاب "علمائے سلف" نے مہمیز کا کام دیا اور دل و دماغ پر علمائے سلف کی عظمت و عزیمت کا نقش ثبت ہوگیا۔ میرے نزدیک ہر سچے طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کو حرز جان بنا کر رکھنا چاہیے۔

والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی تصنیفات کو الٹتے پلٹتے، ان کا ایک مسودہ ارمغان احباب ۴ کے نام سے ہاتھ آ گیا جو انہوں نے اپنی ۲۶ سال کی عمر میں لکھا ہے، اور ۱۳۱۲ھ کے طالب علمانہ سفروں کا روزنامچہ ہے، نہایت سادہ اور بے تکلف، لیکن اسنے میرے دل پر بڑا اثر کیا، مردان خدا کی محبت اور دین کی چاشنی محسوس ہوئی، حضرت سید احمد شہید سے اصل قلبی تعلق اسی رسالہ سے پیدا ہوا جہاں والد مرحوم حضرت سیدنا لکھتے ہیں، وہاں دل جھوم جاتا تھا، اور دل ایک خاص کیف محسوس کرتا تھا۔

دوسری چیز جس نے حضرات اہل اللہ کی محبت و عقیدت پیدا کی اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، حضرت مولانا محمد علی بانی ندوۃ العلماء کا چھوٹا سا رسالہ ارشاد رحمانی ہے جس میں شیخ وقت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے کچھ حالات حکایات وملفوظات اور سلوک و طریقت کے کچھ نکات ہیں۔ حضرت مولانا گنج مرادآبادی میرے والد مرحوم کے شیخ تھے اور بچپن سے گھر میں آپ کا ذکر خیر سنا تھا۔ اس روحانی تعلق اور ذہنی ربط سے کتاب ذوق وشوق سے پڑھی، محبت کے اشعار، اور عاشقانہ کلمات دل میں چبھ گئے اور تیر و نشتر کی طرح دل میں اتر گئے۔ اس سے کچھ پیشتر یا بعد والد مرحوم کا ایک مختصر سا رسالہ یا مقالہ جو استفادہ کے نام سے شائع ہوا تھا بار بار پڑھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے گنج مرادآباد کی حاضری کے حالات، اور وہاں کے مشاہدات، اور مولانا کے الطاف و عنایات کے واقعات قلم بند کئے تھے، اس نے مولانا کی محبت و عقیدت، اور اہل اللہ

سے ملاقات اور استفادہ کے شوق میں اور اضافہ کیا۔

مشائخ و بزرگان دین کے ملفوظات کے مجموعے بھی نظر سے گزرے۔ ان مجموعوں میں حضرات چشتیہ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات فوائد الفوائد اور حضرات نقشبندیہ کے ملفوظات میں حضرت شاہ غلام علی کے ملفوظات درالمعارف کا قلب پر اثر پڑا۔ اگرچہ ذہن نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت و مطالعہ کی وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی، لیکن قلب نے واقعات، اور بے ساختہ گفتگو اور خلوص کی گرمی و نرمی محسوس کی۔

فلسفہ تصوف اور فلسفہ اخلاق کے نکات و مباحث نے جو متاخرین صوفیہ کی کتابوں میں بہ کثرت ملتے ہیں، کبھی متاثر نہیں کیا، البتہ دردو محبت اور سوز و گداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں اور یہ تیر کم خطا جاتے تھے، دردو محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے۔

ہم نے اپنے آشیانہ کے لئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

بزرگوں کی مجالس و ملفوظات کے سلسلہ میں تاریخی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر یہ کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا کہ عرصہ کے بعد جب مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی کی مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور ان کی التفات و عنایات سے سرفراز ہوا تو ان کی زبان سے دینی حقائق و نکات، اور سلوک و تصوف کی نادر تحقیقات سن کر عالم حیرت میں پڑ گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ملفوظات و مجالس کے قلم بند کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی۔ اپنے علم و فہم کے مطابق یہ کہنے میں ذرا مبالغہ معلوم نہیں ہوتا کہ عرصہ دراز سے تزکیہ و احسان اور دینی حقائق کے سلسلہ میں ایسے بیش قیمت ملفوظات اور ایسے گہرے علوم و مضامین سننے میں نہیں آئے۔ والغیب عند اللہ (اور) وفوق کل ذی علم علیم۔

طالب علمی کے باقاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا، اور دو کتب خانے دیکھے ایک زندہ و متکلم، ایک جامد و خاموش۔ زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب ؒ، اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ۔ شاہ صاحب کے

واسطہ سے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب اور ابن عبد الہادی وغیرہ کی بعض کتابیں دیکھیں، پھر وطن واپس جا کر "احیاء العلوم مع تخریج عراقی"، "فضل علم السلف علی الخلف"، "دفائن الکنوز"، "تلبیس ابلیس"، "مختصر منہاج القاصدین" وغیرہ منگوائیں۔ "تلبیس ابلیس" کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن و موثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی ادوار کے لحاظ کے بغیر ان کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں، جنہوں نے بعض خاص حیثیتوں سے دل و دماغ پر کوئی اثر کیا اور کوئی قابل ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔

نظام و نصاب تعلیم کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا تخم شیخ خلیل عرب و شیخ تقی الدین الہلالی کی مجالس درس میں دماغ پر پڑا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشو ونما کیا، ندوۃ العلماء کا تخیل اور دین و دنیا کی بہم آمیزی، اور علماء و اہل دین کی قیادت و اقتدار کی ضرورت و اہمیت کا احساس نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے اس خطبہ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ ہوا جو موصوف نے ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں پڑھا تھا، اور میں نے اس کو غور سے بعد میں چھپا ہوا پڑھا، پھر مزید مطالعہ سے اس پر یقین اور اطمینان بڑھتا رہا اور یہ دونوں چیزیں میرے علمی عقائد و نظریات کا جزو بن گئیں۔

مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب مرحوم بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی، جو اس سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے، اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اس کی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی، اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب و ثقافت کی فتح مندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے "سچ اور صدق" کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب "معرکہ مذہب و سائنس (مترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم) اور لیکی کی "تاریخ اخلاق یورپ (مترجمہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی) نے بڑی مدد دی اور اس

سے بڑا مواد ملا جس سے اپنے مضامین واستدلال میں بہت کام لیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے مضامین ترجمان القرآن اوران کی کتاب تنقیحات نے اور زیادہ وضاحت وتقویت پہنچائی۔ مولانا ابوالاعلیٰ کے ''ترجمان القرآن'' کے مضامین نے طرز استدلال اورطرز تحریر پر بھی اثر ڈالا، اوران کی تحریروں نے ذوق وفکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اوراس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی واصولی تضاد اوردونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پر مغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب معلوم ہوئی جس کا لفظ لفظ دل نشیں ہوا۔ عرصہ دراز کے بعد ان کی دوسری فکر انگیز لیکن دلچسپ کتاب شائع ہوئی جس کا عربی ترجمہ ''الطریق الی مکۃ'' انہوں نے ازراہ عنایت مجھے خود بھیجا، یہ اس اجمال کی تفصیل اوراس نظریہ کی عملی تطبیق تھی جو انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں پیش کیا تھا۔ میں نے ان کی اجازت سے اسکا ترجمہ اور تلخیص ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب ہر جویائے حق اورصاحب ذوق کے پڑھنے کی ہے۔

۳۹-۱۹۳۸ء میں مصر کے فاضل مولف ڈاکٹر احمد امین کی ''فجر الاسلام'' (جلد-۱) اور'' ضحیٰ الاسلام'' (جلد-۳) کے مطالعہ کا موقعہ ملا، یہ عہد نبوی اور عہد اموی وعباسی کی فکری، ادبی، اخلاقی، سیاسی وعلمی تاریخ ہے جس میں واقعات سے نتائج اخذ کیے ہیں، جزئیات سے کلیات قائم کیے ہیں اور ہر دور اور حیات انسانی کے ان مختلف شعبوں پر مجموعی نگاہ ڈالی ہے۔ کتاب مصنف کی قوت ملاحظہ اورحسن استنتاج کا اچھا نمونہ ہے، اور اگرچہ موجودہ عصری ومغربی تاثرات سے کلیۃ پاک نہیں، اوراس کے مطالعہ سے ذخیرۂ حدیث پر اعتماد کسی حد تک متزلزل ہوجاتا ہے، اوراس کی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اورعقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہیے، مگر میری سادہ لوحی کہیے یا ناقدانہ نظر کی کمی کہ مجھے مصنف کی اس کمزوری کا پورا احساس اس وقت نہیں ہونے پایا، اس کا صحیح احساس وعلم اور اس سے اذیت اس وقت ہوئی جب میں نے ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ السباعی کی فاضلانہ کتاب '' السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی'' پڑھی جس کے مطالعہ کی سفارش فن حدیث کے ہر طالب علم سے ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر احمد امین سے خیالات میں بڑا توارد معلوم ہوا کئی جگہ حواشی پر اختلاف یا اظہار خیال کیا، یا مصنف کو بے اختیار داد دی، لیکن سب زیادہ فائدہ جو ان

کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوا، وہ شگفتہ شیریں اور علمی طرز تحریر کا ہے جس میں احمد امین اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کے تذکرہ سے امام احمد بن حنبل اور محدثین کی عمومی عظمت دل و دماغ پر قائم ہوئی تذکرہ اور الہلال کے ادبی سحر حلال نے مسحور کیا۔ ترجمان القرآن کی دوسری جلد سے تفسیر اور فہم قرآن کے بعض نئے گوشے سامنے آئے، اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔ سورہ یوسف پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ نہ صرف قرآنی نکتہ شناسی کی ایک مثال، بلکہ ادب عالی کا ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔

جب ترجمہ قرآن اور تفسیر کی تدریس کی خدمت دار العلوم میں سپرد ہوئی تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے حواشی کی قدر آئی جن میں انہوں نے مفسرین کے اقوال کا عطر اور ان کی تحقیق کا وہ حصہ نقل کر دیا ہے جس کو اس زمانہ کا سلیم ذہن آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ اس میں مولانا کی سلامت فکر، حسن انتخاب اور تحریر کی شگفتگی بخوبی عیاں ہے۔ میں نے دیوبند کی ایک ملاقات میں مولانا سے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا، مولانا کو بڑی مسرت ہوئی، اور بعض صاحبوں سے اس کو نقل کیا۔ جدید معلومات وتحقیقات نے تفسیر کے سلسلہ میں جو نئے سوالات پیدا کر دیے ہیں، ان کا حل تلاش کرنے میں اور قرآنی اعجاز کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں "تفسیر ماجدی" اور اس کے مصنف مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تفسیری مضامین و تحقیقات سے بڑی مدد ملی، اور اپنے مطالعہ و معلومات میں تحقیقی اضافہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی تمام تصنیفات نقد کامل عیار اور علم وانشاء کے لحاظ سے معیار ہیں لیکن اس بے بضاعت کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خطبات مدراس ہے۔ اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف یہی تصنیف آئے تو اس کو زندہ جاوید بنا دے اور اگر مقبول ہو (جیسا کہ آثار سے بھی ظاہر ہے) تو مغفرت کے لئے تنہا کافی ہے۔ بار بار مزے لے لے کر پڑھی، حدیث وسیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث وسیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی کتابوں میں بڑی معلومات اور مواد ہے، بہت سے لوگوں کا ان کے مخصوص طرز تحریر اور بات سے بات نکلنے کی وجہ سے جی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ

ان کی کتابوں میں جی لگا اور اپنے علم میں اضافہ ہوا۔ خاص طور پر ان کی کتاب ''النبی الخاتم'' سیرت پر بڑی انمیلی کتاب ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' بڑی پر از معلومات اور موثر کتاب ہے۔ تیسری کتاب ''تدوین حدیث'' بڑی مبصرانہ اور نکتہ دارانہ تصنیف ہے۔ ان کا مضمون ''مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'' بھی بڑی بصیرت ومعلومات کا ذریعہ بنا، اور اس سے ان کے دوسرے مقالے جو ''الفرقان'' شاہ ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا تھا، تاریخ ہند کے نئے گوشے سامنے آئے۔

''حیات جاوید''، ''وقار حیات'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے پرانے فائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی وسیاسی رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی، جس کی تکمیل ''حیات شبلی'' سے ہوئی۔ مولوی سید طفیل احمد صاحب کی ''حکومت خود اختیاری'' اور ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' سے ہندوستان کی برطانوی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی تنزل اور ذہنی تغیر کی توجیہ ہوئی۔ ہندوستان کی اسلامی، دینی وعلمی تاریخ کا سب سے بڑا خزانہ گھر میں موجود تھا کبھی خیال نہیں آیا تھا، حیدرآباد سے اشاعت کی تحریک ہوئی تو والد مرحوم کی تصنیف اور سرمایہ حیات ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد بار پڑھیں۔ ان کتابوں سے ہندوستان کی آٹھ سو برس کی جیتی جاگتی تاریخ آنکھوں کے سامنے آگئی، علماء ومشائخ، اہل درس واہل تصنیف، اہل ذوق واہل کمال، سلاطین ووزراء، امراء، وروٴسا کے ایسے حالات اور ہندوستان کی علمی تاریخ کے ایسے قیمتی نوادر ونکات مفت میں مل گئے، جن کے لئے سینکڑوں کتابیں الٹنے اور ہزاروں صفحات کھنگالنے سے بھی کام نہ چلتا۔ یہ ایک بہت بڑی ثقافت اور معلومات کا خزانہ تھا، جس کو ہندوستان کا کوئی طالب علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو، نظر انداز نہیں کرسکتا، اور جس کے بغیر آدمی اپنے ملک ہی میں اندھیرے میں رہے گا۔ علمی طور پر کسی کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا کام نہیں لیا، جتنا ''نزہۃ الخواطر'' کی ان ضخیم آٹھ جلدوں کے تاریخی معلومات سے جن کی تلاش کے لئے تاریخ وتصوف کی کتابوں کے ہزاروں صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت اور نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہئے، اور کس جگہ سے وہ دستیاب ہوسکتے ہیں۔ میری محرومی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد سے کوئی استفادہ نہ کرسکا، لیکن اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ ایسا علمی سرمایہ چھوڑ گئے

ہیں کہ ساری عمر اس سے استفادہ کا موقع ہے۔

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ پر نہیں پڑا جتنا علامہ اقبال کے کلام کا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان خیالات اور تمناؤں کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح و جسم میں پیوست ہو چکی ہیں۔ اقبال اور ان کے کلام پر اردو میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو شاید کسی معاصر شخصیت اور اس کے فکر پر شائع نہیں ہوئیں لیکن ان میں سب سے زیادہ پر مغز اور روح پرور کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ''روح اقبال'' معلوم ہوئی۔

علامہ مرحوم سے ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء میں دوسری ملاقات کی، اور کئی گھنٹے ان کے التفات و ارشادات سے محظوظ رہا، جس کا خلاصہ پنجاب کے ایک رسالہ میں ''عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بلاد عربیہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی اور ناشناسی پر دل کھول کر رہتا اور ٹیگور کی قدر افزائی پر غصہ آتا۔ علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر میں پڑھے جانے کے لئے ایک مفصل و طویل مضمون علامہ مرحوم کی زندگی و خصوصیات پر لکھا اور بعد میں عالم عربی میں ان کے تعارف کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش کی توفیق ''روائع اقبال'' کے ذریعہ ہوئی، جس نے بلاد عربیہ کے نوجوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ابتدائی استغراق و انہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں۔ اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے، اور جس کو جو کچھ ملا ہے، اسی سے ملا ہے، لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں، اور عالم اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اب بھی اس کو طاقت و خود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ''مذہب و عقلیات'' پر نظر پڑی جو ''بقامت کہتر و بقیمت بہتر'' کی صحیح مصداق ہے۔ ذوق و ذہن نے اس کو پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی نارسی اور کوتاہی و ناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا۔ اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ، اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا،

پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تنزل واقع نہیں ہوا۔ بلکہ جس قدر پڑھا "ان هم الا یخرصون" اور "بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه ولما یاتهم تأویله" کی تفسیر وتوضیح ہوتی رہی۔ حافظ ابن تیمیہ کی "تفسیر سورۂ اخلاص" اور "کتاب النبوأت" کے اشارات سے مزید مدد ملی، لیکن اس نقش کو پختہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نے کیا۔

میرے معلم ومربی، میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی مرحوم، جن کی اصابت رائے، خداداد سلامت فکر، استقامت اور گہرا علم زندگی کی ہر منزل اور ہر موڑ پر میرا دستگیر رہا، برابر حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور حضرت شاہ ولی اللہ کی "ازالۃ الخفاء" کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہے، لیکن نوعمری کی سطحیت اور کم سنی کی عجلت کی وجہ سے کبھی دو چار صفحے سے زیادہ نہ پڑھ سکا۔ دفتر اول کا پہلا مکتوب جو حضرت نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھا ہے، اور جس میں اپنے بہت سے واردات اور راہ سلوک کے تجربات لکھے ہیں، ہمیشہ ہمت شکن ثابت ہوا اور جس طرح بدشوق بچے ہمیشہ قرآن کی تلاوت میں پہلا پارہ پڑھ کر چڑھ دیا کرتے ہیں، میں بھی اس مکتوب کے چند صفحات پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیا کرتا تھا، لیکن ایک بار اس کا عزم کرلیا کہ "مکتوبات" کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا، چاہے بڑا حصہ سمجھ میں نہ آئے، چنانچہ اس کی چاروں "کذا، تینوں" دفتر پڑھے، لفظ بہ لفظ، دل لگا کر اور لطف لے لے کر پڑھے۔ بے استعدادی، قوت مطالعہ کی کمی اور علوم عقلیہ وآلیہ کی بے بضاعتی قدم قدم پر عناں گیر رہی، لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا، اس پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ:

آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

ایک عرصہ کے بعد حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت مجدد اور حضرت مخدوم بہاری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کا ایک نیا عالم آنکھوں کے سامنے آ گیا، وحی ونبوت کی قطعیت، مقام نبوت ومنصب رسالت کی بلندی وبرتری اور خصائص نبوت وانبیاء، اور نبوت وولایت کے لوازم وما بہ الامتیاز چیزوں کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھتے ہیں، ان پر دقت فکر کے لحاظ سے یونان وعجم کا پورا فلسفہ سو بار قربان اور وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء کے دواوین اور ادب کی بیاضیں ہزار بار نثار۔ مکتوبات مجددی کے تذکرہ کے آخر میں سنت وبدعت کے بارے میں جو مجددانہ

کلمات و تحقیقات قلم سے نکلی ہیں، ان سے بڑا شرح صدر اور یقین کا اضافہ ہوا، نیز دور اکبری و جہانگیری میں دین کی نصرت وحمایت کے سلسلہ کے مکتوبات نے دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا اور افسردہ قلب و جسم میں دین کی حرارت پیدا کی۔ انسانی تصانیف اور تحریروں میں جن پر زمانہ گزر چکا ہے، کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی حرارت دیکھی جتنی ان دونوں حضرات کے مکتوبات میں پائی جن میں صدیاں گزر چکیں، مگر وہی زندگی اور تاثیر موجود ہے جو عموماً لکھتے وقت ہوتی ہے۔

میرے محترم دوست اور دینی کاموں میں رفیق کار مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ''الفرقان'' کا شاہ ولی اللہ نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو اس بے بضاعت سے بھی فرمائش کی کہ اس میں حصہ لے۔ میں نے ''شاہ ولی اللہ بحیثیت مصنف'' کا عنوان اپنے لئے منتخب کیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ شاہ صاحب کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالی جائے، کچھ پہلے دیکھی تھیں، کچھ نہیں دیکھی تھیں۔ اس سلسلہ میں ''ازالۃ الخفاء'' کی بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی۔ یہ اپنی نکتہ آفرینی کا دوسرا نمونہ تھا۔ انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں گا، جتنا مکتوبات اور ''ازالۃ الخفاء'' سے، علم کا چشمہ ابلتا نظر آتا ہے، آدمی ایک نکتہ کا لطف نہیں لینے پاتا کہ دوسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے، اور دوسرے سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ آیات کی تفسیر و تطبیق میں اور خلافت کے خصائص، نیز دینی انحطاط و تغیر کی تدریجی تاریخ کی تدوین میں جو کچھ لکھا ہے وہ علمی پختگی کی ساتھ کیا لطف و لطافت میں ادب و شاعری سے کم ہے؟

''حجۃ اللہ البالغہ'' میں نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے تلمیذ رشید اور پنجاب کے مشہور عالم و مصلح حضرت مولانا احمد علی لاہور سے پڑھی تھی اور دماغ پر اس کی عقلیت، محکوم استدلال اور شاہ صاحب کی باریک بینی کا اثر اسی سے قائم ہوا ''حجۃ البالغہ'' سے علمی واصولی مباحث اور متکلمانہ وفلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی، اور اس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور اس کی تحقیقات سے اتنا متفق نہیں، جتنا شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی کتابوں سے۔ اگر اپنے فکر و مسلک کے لئے کسی مکتب خیال کا تعین ضروری ہے، تو میں انہیں کا نام لے سکتا ہوں، اور

درحقیقت ہمارا تعلیمی وفکری نسب وشجرہ انہیں پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے نامور پوتے شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے، لیکن ان کی شہرہ آفاق اور مسلم ذکاوت اور وفورِ علم کا اندازہ صرف "منصبِ امامت" سے ہوا، جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنی طرز کی منفرد تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی مختصر تصنیف "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" (جس کو میں شاہ صاحب کی قلمی بیاض کہتا ہوں) کے بعض علمی اشاروں اور مختصر نکتوں نے قرآن مجید کے مطالعہ وتفسیر میں بڑی رہنمائی کی، اور شاہ صاحب کے بعض مختصر جملوں، اور تھوڑے لفظوں سے پورے پورے مضامین کے راستے، اور مطالعہ قرآن میں ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔

حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات کے مجموعہ "صراطِ مستقیم" (مرتبہ مولانا اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی) کو بہت دیر میں دیکھا، مگر تصوف کے اچھے ذخیرے اور ائمہ تصوف کے ملفوظات، خصوصاً حضرات چشت کے پورے سلسلہ ملفوظات کے مطالعہ کے بعد دیکھا اور معلوم ہوا کہ تصوف کے لٹریچر میں یہ بالکل ایک انقلابی کتاب ہے، سلوک راہ نبوت اور تقرب بالفرائض کے موضوع کے علاوہ جس کے سید صاحب امام تھے، اور جو اس عصر کے لئے تزکیہ نفس اور قرب الی اللہ کی سب سے آسان، بے خطر اور وسیع شاہراہ ہے، طریقت وحقیقت اور سلوک وتربیت کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں، وہ خداداد ذکاوت، علوم نبوت سے فطری مناسبت، اعلیٰ روحانیت اور دقت نظر کی دلیل ہیں، اہل ظاہر اور اہل معرفت کے مختلف فیہ مسائل میں جو محاکمہ کیا ہے، اور جو فیصلہ کن باتیں کہی ہیں، وہ ان کی اعلیٰ سلامتِ طبع، دماغی توازن واعتدال اور میانہ روی کی شاہد ہیں۔ کاش! اس کتاب کی شایانِ شان خدمت ہوتی اور نئے طرز پر مرتب کر کے پیش کی جاتی۔

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علوم نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی اور صناعی علوم، اور تصنیفات سے پیدا ہوجاتی ہیں، دور ہوئی۔ اس کی بری بھلی تمیز پیدا ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم وحقائق ادا کئے جاسکتے ہیں، اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ کچھ اور بھی راستے ہیں، جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کئے جاسکتے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو اور چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں اور زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن

ہواور حواشی نہ ہوں۔

اس عصر کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی (م ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) سے ملا تو ان کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبتاً سہولت ہوئی۔ حسن الفاظ اور حسن ادا کا خیال، زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود کے سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی۔ میں نے ایک موقع پر عرض کیا کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہید کے حالات نہ لکھے ہوتے، اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی، مولانا نے اس کو پسند فرمایا، اور دوسروں سے نقل کیا۔

میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحب کی مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے۔ درسی ومتداول اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں بعض لفظ بہ لفظ دیکھیں لیکن اصل فائدہ متن قرآن کے سادہ اور بار بار کے پڑھنے سے ہوا۔ اس سلسلہ میں اس کا اظہار ضروری ہے کہ قرآن مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی ولسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علوم نبوت ومزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت وزندگی کان خلقه القرآن کا پرتو ہو، اور جنھوں نے انا القرآن الناطق (حضرت علیؓ کا مقولہ) کہنے والے کی قلبی وذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو۔ ان حضرات کے علوم کی تازگی وشگفتگی، بے آمیزی اور نکھار اور علم کی وسعت وگہرائی سے قرآن مجید کے الفاظ کی وسعت وعمق کا ایک قیاسی اندازہ ہوتا ہے۔ کئی الفاظ جو ''لسان العرب'' اور ''مفردات غریب القرآن'' سے اور کئی آیات جو زمخشری کی ادبی تفسیر ''کشاف''، امام رازی کی عقلی تفسیر ''فتوح الغیب'' اور ابن کثیر کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں، وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں۔ الفاظ ومعانی میں نئی وسعت اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے، ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی جو کیفیات بیان کی گئی ہیں، ان کا احساس ہوتا ہے۔ قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جو جواب دیئے ہیں، کان وہی آوازیں سنتے ہیں، اور آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں۔ جو اشکالات اور شبہات علم کلام کی کتابوں نے، اور کتابی مطالعہ نے فرضی طریقہ پر پیدا کر دیئے ہیں، وہ وہاں بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کے سمجھنے کے یہ دو طبعی طریقے ہیں۔

سنا ہے کہ جب قرآن مجید میں آدمی کا جی لگنے لگتا ہے، تو انسانی تصنیفات سے جی گھبرانے لگتا ہے۔ انسانی کتابیں، انسانی تحریریں، انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے لگتی ہیں، ادباء اور حکماء اور مفکرین کی باتیں طفلانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں، جن میں کوئی گہرائی اور پختگی نہیں معلوم ہوتی۔ سفید کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ نقش ونگار کاغذی پھول معلوم ہوتے ہیں، جن کا رنگ ہے خوشبو نہیں۔ انسان کا علم اتھلا اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس کا دیر تک پڑھنا ذوق اور روح پر بار ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو، مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتی ہے۔ تسکین صرف وحی ونبوت کے راستہ سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے۔ جس کو رسول اللہ ﷺ نے دنیا تک پہنچایا اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید میں، اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔

دادیم ترا از منزل مقصود نشان
گر ما نہ رسیدیم شاید تو رسی

☆......☆......☆

(مولانا علی میاں ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ تشریف لے گئے جہاں انہوں نے ''خدا بخش سالانہ خطبہ'' پیش کیا۔ ''علم دائم کے رابطہ کی ضرورت و افادیت'' کے موضوع پر خطبے کے آخر میں انہوں نے اپنے مطالعے کا ذکر کیا۔ یہی آخری حصہ پیش خدمت ہے۔ مولانا علی میاں نے اس میں اپنی علمی ومطالعاتی زندگی کی بعض محسن کتابوں کا تذکرہ دہرانے کے ساتھ مزید اضافے کئے ہیں۔ مرتب)

...... میں بجائے اس کے کہ ان کتابوں کا ذکر کروں جس سے معلومات حاصل ہوئی ہیں اور جن کا ممنون احسان ہوں اور جس کی وجہ سے محدود صلاحیت ہی سہی، لیکن اس درجہ کی صلاحیت پیدا ہوئی کہ لکھ پڑھ سکتا ہوں، عربی میں بھی اور اردو میں بھی، ان کے بجائے ان کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے گہرا اثر ڈالا اور ایک انقلاب انگیزی کا کام کیا، لوگوں نے ایسی کتابیں تو لکھی ہیں، جن میں کتابوں کی فہرست آ گئی ہے کہ کیا کیا پڑھا، لیکن ضرورت تھی کہ ان کتابوں کے نام لئے جاتے، اور اچھے پڑھنے لکھنے والے دانشور ان کتابوں کا ذکر کرتے جن کتابوں کے مطالعہ سے ان میں انقلاب پیدا ہوا۔

میں ان چند کتابوں کا ذکر کرتا ہوں جنھوں نے میرے محدود رقبہ علم میں، رقبہ عمل میں اور رقبہ حیات میں، میرے دائرہ فکر وانقلاب برپا کیا۔ شاید بعض لوگوں کو کچھ خیال پیدا ہوا ان کے پڑھنے، ان کے دیکھنے کا، ورنہ کتابیں اپنی تعداد کے لحاظ سے، صفحات کے لحاظ سے، اپنی ضخامت کے لحاظ سے ناقابل شمار ہیں۔

سب سے پہلے ''مسدس حالی'' کا اثر پڑا۔ ''مسدس حالی'' میں حضورﷺ کے بارے میں جو لکھا گیا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی تعریف بھی انہوں نے بڑے دلکش و دل نشیں انداز میں کی ہے۔ میرا خاندان ایک علمی خاندان تھا، میرے والد محترم مولانا حکیم عبدالحئیؒ صاحبؒ ہندوستان کے چیدہ ترین اور عظیم ترین مصنفین میں تھے جنھوں نے ایک کتاب آٹھ جلدوں میں ''نزہۃ الخواطر'' کے نام سے لکھی۔ جس میں ساڑھے چار ہزار شخصیتوں کا حال ہے، اور یہ بتادوں کہ جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ ایک ایک صدی پر لکھی گئیں، ان کے نام بھی میں لیا کرتا ہوں۔

بڑے بڑے فضلائے عرب اور بڑے بڑے مورخین اور سوانح نگاروں نے ایک ایک صدی کا انتخاب کیا، لیکن ایک ایسی کتاب جو پہلی صدی سے لے کر آخری صدی تک کے لوگوں کا حال بیان کردے، وہ خود بلادِ عربیہ میں نہیں لکھی گئی، چنانچہ خود ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے جو صدر جمہوریہ تھے، فرمایا کہ جب میں مصر کے دورہ پر گیا تو صرف آپ کے والد صاحب کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' لے گیا اور میں نے ڈیسک پر رکھ دی، جب کوئی مصری اسکالر آتا یا کوئی اخبار کا بڑا نمائندہ یا کسی جامعہ کا پروفیسر، وہ کہتا کہ کیا ہندوستان میں علم ہے؟ ہندوستان میں لوگ عربی جانتے ہیں؟ ہندوستان میں کوئی بڑا کام ہوا؟ کوئی بڑی خدمت

ہوئی؟ میں کہتا یہ کتاب دیکھ لیجئے۔ مصر بھی ایسی کتاب نہیں پیش کرسکتا، اور میں بتاتا ہوں عالم عربی کے ایک سیاح کی حیثیت سے بھی اور وہاں کی جامعات میں جانے والے اور وہاں خطاب کرنے والے کی حیثیت سے بھی کہ ایک کتاب بھی عالم عربی میں ایسی نہیں ملتی جو پہلی صدی سے چودھویں صدی پر محیط ہو، یا تو ایک صدی پر کتابیں ہیں یا پھر ایک ایک فن پر ہیں، مثلاً کوئی کتاب صرف ونحو پر ہے، کوئی شاعر پر ہے، کوئی طب پر ہے، لیکن انہوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی، پہلی صدی جب سے یہاں عرب آئے اور اسلام آیا، اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک کے کارناموں کا اس میں ذکر ہے۔

دوسری کتاب لکھی جو ان کا بڑا کارنامہ ہے اور ہندوستان کے لئے ایک شاہکار چیز ہے، وہ ہے ہندوستان کے علماء کی تصنیفات کی ڈائریکٹری۔ پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک کسی فن میں بھی کسی عالم نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس میں اس کا ذکر ہے۔ پوری ڈائریکٹری ہندوستان کی تیرہ سو برس چودہ سو برس کی جس میں سینکڑوں کتابوں کے نام ہیں، اس فن میں یہ کتاب ہے، اس کی یہ خصوصیت ہے۔ عالم عربی کی سب سے بڑی اکیڈمی، دمشق کی ''المجمع العلمی العربی'' جس کا نام تھا، اب ''مجمع اللغة العربية'' ہوگیا ہے، اس نے اس کو شائع کیا، دو ایڈیشن وہاں سے شائع ہوئے ہیں، ہندوستان میں اس کا ترجمہ ہوا اور ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' کے نام سے دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہوا جو سب سے مقتدر ادارہ ہے۔ عام طور پر ہوا یہی ہے کہ لوگوں نے پورا احاطہ نہیں کیا، اب اس کی ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن میں ان کتابوں کا تذکرہ ہو جو منفرد ہیں، ان کی مثال عالم اسلام اور عالم عربی میں نہیں ملتی اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں، پھر اس کے بعد ضرورت ہے کہ جن چیزوں سے متاثر ہوئے اور انقلاب ہوا، ان کا بھی ذکر ہونا چاہئے۔

تو سب سے پہلے جو مجھے یاد ہے میری زندگی پر اثر ''مسدس حالی'' کا پڑا، انہوں نے صحابہ کرامؓ کا جہاں تذکرہ کیا ہے، پھر اسلام کی خدمت اور اس کی انقلاب انگیزی کا جہاں ذکر کیا ہے، اس کا بڑا حصہ زبانی یاد تھا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے اکثر گھروں میں ''مسدس حالی'' پڑھی جاتی تھی، اس کے بہت سے شعر خواتین، بچیوں اور لڑکیوں کی زبان پر بھی تھے۔

اس کے بعد پھر جس کتاب کا اثر پڑا، وہ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالرزاق

صاحب کلامی کی کتاب ''صمصام الاسلام'' ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کم سے کم پٹنہ اور اس کے اطراف میں ضرور معروف ہیں اور محترم شخصیت ہیں، صادق پوران کا پیرو تھا اور اس نے ہندوستان کی آزادی میں انگریزوں کے مقابلہ میں وہ کردار ادا کیا جو (میں ایک تاریخ داں کی حیثیت سے بھی اور ایک محبِّ وطن کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں) ہندوستان میں شاید کسی علاقہ نے اتنا بڑا حق ادا نہیں کیا۔ سید عبدالرزاق صاحب کلامی سید احمد شہید کے نواسہ ہوتے تھے اور میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھا تھے، انہوں نے ''صمصام الاسلام'' کے نام سے پچیس ہزار اشعار میں واقدی کی فتوح الشام کو منتقل کیا، وہ شاعرانہ حیثیت سے بھی بڑے بلند کلام ہیں۔ اس کتاب میں پچیس ہزار اشعار ہیں، خاندان میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی حادثہ پیش آتا، کوئی غمی ہو جاتی تھی تو اس کے اثر کم کرنے کے لئے مستورات جمع ہوتی تھیں اور ''صمصام الاسلام'' پڑھی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے میں اس میں شریک ہوتا تھا، اپنی کم سنی کے باوجود، کیونکہ میری خالہ صاحبہ یا میری ہمشیرہ وغیرہ پڑھتی تھیں تو حالت یہ ہوتی تھی کہ آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں اور چہروں کا رنگ بدل جاتا تھا، اور بالکل معلوم ہوتا تھا کہ اپنا غم بھول گیا ہے اور کسی کی شہادت کا ذکر آتا (خاص طور سے خواتین کی شہادت اور قربانیوں کا ذکر آتا) تو اپنا غم بھول جاتی تھیں، یہ بہت اچھا رواج تھا، اس وقت اس حادثہ کا اثر کم ہو جاتا تھا اور کسی کا کوئی وعظ یا تلقین یا کوئی کتاب اتنی موثر نہیں ہوتی تھی جتنی کہ ''صمصام الاسلام'' ہوتی تھی۔

پھر ''صمصام الاسلام'' کے بعد مجھے جس چیز نے متاثر کیا، وہ اکبر الہ آبادی مرحوم کا کلام ہے۔ ملک میں مغربی تہذیب کا دور آیا اور میں چونکہ لکھنؤ شہر کا رہنے والا ہوں جو تحریک خلافت اور تحریک آزادی کا بڑا مرکز ہے، لیکن اس وقت انگریزی تہذیب کا اور انگریزی دانش کا، مغربی ثقافت کا اتنا اثر تھا کہ کوئی شخص اس سے بچا نہیں تھا، اس کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اس وقت ایک لفظ چلا ہوا تھا ''ولایت''، اس سے آپ سمجھ جائیے کہ یہ کس ذہن کی غمازی کرتا ہے، جب کسی چیز کی بڑائی بیان کرنا چاہتے تھے تو کہتے تھے، یہ ولایت سے آئی ہے، میں ولایت سے آیا ہوں، اس وقت دو چیزیں میرے بڑے کام آئیں، ایک اکبرالہ ابادی کا کلام، اس نے اس طلسم کو توڑا اور اس کی اصل کمزوریوں کو دکھایا اور وہ کام کیا جو بڑے بڑے دانش کدوں نے بڑی بڑی علمی، دقیق اور عمیق اور بلند مرتبہ کتابوں نے کیا ہوگا۔ ان کا کلام جب پھیلا تو ان سے

مغربی تہذیب کا تسلط، اس کی sovereignty کم ہوئی، ان کے چند شعر پڑھتا ہوں، جن سے آپ سمجھ جائیں گے کہ کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں:

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

☆☆☆

علوم مغربی کے بحر میں غوطہ لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہ ہوتا

☆☆☆

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اکبر الہ آبادی کا بہت اثر ہوا، ایک اعتراف بالحق کے طور پر یہ بھی کہہ دوں کہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا رسالہ ''سچ'' (جو بعد میں ''صدق'' کے نام سے نکلنے لگا) اکبر الہ آبادی کا بھی بڑا ترجمان تھا، میں جب تک رائے (بریلی) میں رہتا تھا، وہاں بھی ''سچ'' کا پرچہ آتا تھا، پھر وہ ''صدق'' کے نام سے نکلنے لگا اور میرا مولانا سے ذاتی تعلق اور رابطہ قائم ہوا۔ اس وقت لاہور سے ''زمیندار'' آتا تھا جس میں مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں شائع ہوتی تھیں، وہ نظمیں ایسی زلزلہ انگیز ہوتی تھیں اور جذبات پر ایسی اثر انداز (زبان کے لحاظ سے بھی اور زورِ بیان کے لحاظ سے بھی) کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس کے بعد اقبال کے کلام نے دل و دماغ کو متاثر کیا، یہ عرض کردوں کہ اقبال کے کلام میں ''بانگ درا'' نے اتنا مجھ پر اثر نہیں ڈالا، اس وقت تو یہ چیز رائج تھی، اور آپ کو معلوم ہے اقبال کا کلام وقت کے فاصلہ سے شائع ہوتا رہتا تھا، مثلاً ابھی ''بانگ دار'' آئی ہے، پھر ''ضرب کلیم'' آئی ہے، ''بال جبریل'' آئی ہے اور دوسری کتابیں، لیکن مجھ پر سب سے زیادہ اثر ''بال جبریل'' کا پڑا ہے، ان کے اشعار پڑھتا تھا اور لطف لیتا تھا، پھر خدا نے ایسی توفیق دی کہ میں

نے ان کا عالم عربی سے تعارف کرایا، میں جب مصر گیا ۱۹۵۱ء میں تو میں نے دیکھا کہ مصر میں بہت زیادہ غیر ممتاز شخصیتوں پر لکھا گیا ہے اور لوگ ان سے واقف ہیں، میں وہاں کے چوٹی کے لکھنے والوں سے ملا، جن میں ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود العقاد، احمد حسن الزیات اور سید قطب وغیرہ تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ سارا مصر اقبال سے ناآشنا ہے اور عالم عربی بھی ناآشنا ہے، تو میں نے وہاں سے آنے کے بعد اس کا بیڑا اٹھایا، ہمت کی کہ میں اقبال کو عربی میں پیش کروں، چنانچہ پہلے میں نے مضامین کی شکل میں یہ کام کیا، پھر پوری کتاب ''روائع اقبال'' کے نام سے لکھی اور مصر ہی نہیں، عالم عربی میں پہلی مرتبہ ان کا تعارف ہوا اور مجھے حیرت ہوئی کہ بعض عرب ادیبوں، دانشوروں کو اس کے صفحے کے صفحے یاد ہیں، مجھے خوب یاد ہے کہ امیر حسن نے جواردن کے ولی ہیں، وہاں ''موسسہ اہل البیت'' کے نام سے ایک اکیڈمی ہے، میں اس کا ممبر ہوں، انہوں نے ایک ڈنر کا انتظام کیا، اپنی طرف سے اعزاز کا، اس وقت میں تھا اور میرے بھانجے مولوی سید محمد واضح حسنی ندوی اور مفتی خلیلی صاحب تھے جو مسقط کے بہت بڑے عالم، بڑے مفتی ہیں تو مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے ''روائع اقبال'' کے صفحے کے صفحے زبانی سنانا شروع کردیئے اور پھر اس کے بعد وہاں بہت سے لوگوں کو اس سے بڑی دلچسپی ہوئی اور اس کتاب کا بڑا اثر پڑا اور اقبال سے لوگوں کا تعارف ہوا اور انہیں حیرت ہوئی کہ ایسے شاعر سے ہم ناواقف تھے جو اسلام کا صحیح ترجمان ہے اور اس نے طاقت کا پیغام، خود اعتمادی کا پیغام اور انقلاب انگیزی کا پیغام جو اب تک کسی شاعر نے نہیں دیا تھا، دنیائے اسلام کو دیا۔

پھر اس کے بعد سب سے زیادہ جس کا اثر مجھ پر پڑا، وہ سید احمد شہید کی تحریک کا تھا، وہ ہمارے گھر کی چیز تھی، خاندان کی چیز تھی، لیکن اس کا تذکرہ بہت کم ہوگیا تھا، کہیں کہیں مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا، لیکن اسی زمانہ میں مولوی محی الدین صاحب قصوری نے جو مولانا آزاد کے خاص لوگوں میں تھے، امرتسر کے ایک پرچہ ''توحید'' میں جو مولانا داؤد صاحب غزنوی کی ادارت میں نکلتا تھا ''عصر حاضر کا عظیم مجاہد سید احمد شہید'' کے نام سے مقالہ لکھا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے کہا کہ تم اس کا ترجمہ عربی میں کرو، اس وقت میری عمر ۱۶۔۱۷ سال تھی، میں نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا، اسی زمانہ میں عالم عربی کے بہت بڑے محقق ادیب اور نقاد استاد علامہ تقی الدین الہلالی مراکشی، جن کا حال یہ تھا کہ جب دو بڑے

ادیبوں میں جو بڑے کہنہ مشق نامور لکھنے والوں میں تھے، کسی لفظ کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا کہ لفظ صحیح ہے یا نہیں تو ان کی طرف رجوع کرتے تھے، چنانچہ امیر البیان امیر شکیب الارسلان جو ''حاضر العالم اسلامی'' کی چار جلدوں کے مصنف ہیں اور علامہ سید رشید رضا میں جو شیخ محمد عبدہ کے شاگرد ہیں اور وہ جمال الدین افغانی کے شاگرد و ترجمان تھے، جب ان کا آپس میں اختلاف ہوتا تھا تو ان کی طرف رجوع کرتے تھے، اور وہ جو فیصلہ کرتے تھے مان لیا جاتا تھا، اس کے شواہد موجود ہیں۔ امیر شکیب ارسلان کی خود نوشت کتاب ''السید رشید رضا اواخاء اربعین سنۃ'' میں لکھا ہے، کہیں لفظ میں ہمارا اختلاف ہوا، ہم نے شیخ تقی الدین کی طرف رجوع کیا، انہوں نے یہ فیصلہ کیا، وہ لکھنؤ آئے تھے اور ندوۃ العلماء میں اس کو تعلیم کا عہدہ دیا جانے والا تھا۔ انہوں نے جو یہ مضمون دیکھا تو کہا کہ اگر تم کہو تو اسے علامہ سید رشید رضا کے پاس مصر بھیج دوں، اب خیال کیجئے، ۱۶۔ ۱۷ سال کا نوجوان، اس کا مضمون علامہ سید رشید رضا جو شیخ محمد عبدہ کے شاگرد ارشد ہیں، وہ ''المنار'' نکالتے تھے، انہوں نے اس مضمون کو رسالہ میں شائع کیا اور اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ اگر مضمون نگار چاہیں تو ہم اس کو الگ رسالہ کی شکل میں بھی شائع کر سکتے ہیں، تو خدا کا شکر ادا کرنے کے سلسلہ میں کہتا ہوں کہ شاید ہندوستان میں بلاد عجمیہ میں کم ایسا ہوا ہو کہ ۱۶۔ ۱۷ سال کے نوجوانوں کی کتاب مصر میں شائع ہوئی ہو اور مستند سمجھی گئی ہو، چنانچہ ''ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید'' کے نام سے وہ رسالہ وہاں شائع ہوا اور پھر ہندوستان میں بھی پھیلا۔

مجھ پر سب سے زیادہ جس کا اثر پڑا وہ حضرت سید احمد شہید کے واقعات تھے، میں بلا کسی مبالغہ کے اور بغیر کسی خود ستائی کے کہتا ہوں کہ کچھ خاندانی تعلق بھی ہے کہ جب ان کے حالات پڑھتا تھا، دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک گوشہ میں (جس زمانہ میں وہاں بجلی بھی نہیں آئی تھی چراغ جلا کر، لالٹین جلا کر میں کتاب پڑھتا تھا) ''وقائع احمدی''، جو ان کے حالات میں لکھی گئی ہے یا دوسری کتاب ''منظورۃ السعداء'' جو فارسی میں ہے مولانا سید جعفر علی صاحب بستوی کی، وہ جب پڑھتا تھا تو ایک دم سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ رحمت کی کوئی گھٹا آگئی ہے اور دعا کرنے کا وقت ہے اور آنسو جاری ہو جاتے اور دعا کرتا، ویسا اثر میں نے سیرت نبوی ﷺ کے بعد کسی چیز میں نہیں دیکھا، مجھ پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے سید احمد شہید کا اور پھر اس کے بعد اس کے نتیجہ

میں، میں نے ''سیرت سید احمد شہید'' لکھی، پہلے ایک جلد تھی، اس پر علامہ سید سلیمان ندوی نے مقدمہ لکھا، بڑا طاقتور مقدمہ ہے، پھر دو جلدوں میں، میں نے کتاب لکھی اور اس وقت تک بحمد اللہ ۶، ۷ ایڈیشن نکل چکے ہوں گے اور پاکستان، ہندوستان میں بہت پھیلی، پھر اس کے بعد چودھری غلام رسول صاحب مہر (جو ایک بہت بڑے صحافی اور جرنلسٹ تھے) کہتے تھے کہ میں تیرہ چودہ سال سے یہی کام کر رہا ہوں اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا نہ کی ہو، انہوں نے کتاب لکھی ''سیرت سید احمد شہید'' چار جلدوں میں، ان کی کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کتاب نے ہزاروں انسانوں پر اثر ڈالا، ان کے عقائد میں بھی اصلاح ہوئی، ان کے جذبات میں بھی ایمانی طاقت پیدا ہوئی جو بہت کم چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔

ابھی تک بہت کم لوگوں نے اس پر کوئی کتاب لکھی ہے کہ کس کتاب نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، اگر کسی کتاب کا ذکر آتا ہے تو وہ ''مثنوی مولانا رومؒ'' ہے۔ خود اقبال مرحوم اس سے بڑے متاثر ہیں، وہ کہتے ہیں:

پیر رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

اور اردو میں کہتے ہیں:

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

مولانا روم کے کلام کا بہت سے آدمیوں کے ذہنوں پر بڑا اثر پڑا ہے، مگر ان لوگوں نے تحریری شکل میں کوئی شہادت نہیں دی، لیکن اگر پوچھا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پورے اس برصغیر میں اور پھر ایران میں سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس سے متاثر ہوئے ہیں، یہ تو عربی، فارسی، اردو کا ذکر کیا گیا۔

میں نے جب مغربی تہذیب کی تنقید کے مطالعہ کا ارادہ کیا، میرے بڑے بھائی صاحب نے جو بڑے مبصر تھے، مجھے انگریزی بھی پڑھوائی تھی، جہاں تک تاریخ، اخلاقیات اور دین کا تعلق ہے، اس میں، میں نے مسلمانوں کے انحطاط، مسلمانوں کے مسند قیادت سے دست کش ہو جانے یا پیچھے ہو جانے سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا، اس کا بھی میں نے بالکل ایک

تاریخی، غیر جانبدارانہ، ایک مبصرانہ اور ناقدانہ تبصرہ کیا جو عربی زبان میں ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے نام سے چھپا، جس کا اردو ترجمہ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کے نام سے شائع ہوا۔ عالم عربی میں میری جو کتاب سب سے زیادہ پڑھی گئی اور مقبول ہوئی، وہ یہی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' تھی، اس کے تقریباً پچیس ایڈیشن نکل چکے ہیں، قاہرہ اور دمشق اور کویت میں اور مختلف جگہوں پر اور اردو میں جس کے ترجمے بار بار شائع ہوئے ہیں، بعض ادیبوں نے اس کا ذکر کیا کہ جب مجھے کوئی زوردار چیز لکھنی پڑتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ تحریر میں جوش ہو تو پہلے ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے چند صفحے پڑھ لیتا ہوں، پھر قلم اٹھاتا ہوں، یہ استاد انورالجندی کا مقولہ ہے جو اس وقت مصر کے اچھے نامور کاتب ہیں، تو اس وقت مجھے اس بات کی ضرورت ہوئی کہ غیر جانبدارانہ طریقہ پر اور غیر جذباتی طریقہ پر میں مغربی تہذیب کی کمزوریوں کو سمجھوں اور کیا اس کا Donation ہے، اس نے کیا دنیا کو عطا کیا اور کیا نقصان پہنچایا، اخلاقیات کے پہلو سے، دینیات کے پہلو سے، انسانیت کے پہلو سے، تو میں نے اس وقت انگریزی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس میں مجھے سب سے زیادہ جن کتابوں سے فائدہ ہوا ان میں Coflict betweeen Religion- and Science ہے، یہ ڈراپر کی کتاب ہے، اسے میں نے غور سے پڑھا اور اس کے نوٹس لئے، اس میں (مصنف نے) بتایا کہ کلیسا اور دربار کی جو جنگ ہوئی، جو کشمکش اور تقابل ہوا، اس سے کیا فائدہ پہنچا، کیا نقصان پہنچا اور اس نے کیا اثرات ڈالے، مغرب معاشرہ، مغربی ذہن پر۔ پھر کتاب پڑھی History of European Morals، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ یونان کا کیا اثر پڑا ہے یورپ پر، یونان نے کیا دیا اور اس میں کیا افراط وتفریط تھی، ان کے دو بہت بڑے Schools of thought تھے، ایک جسے رواقی کہتے ہیں اور ایک لذتی، بس جس میں آدمی کو مزا آئے وہی چیز لینی چاہئے، اسی کو اختیار کرنا چاہئے، یہ لذتی مکتب خیال ہے، مگر رواقی مکتب خیال ہے کہ نہیں، عقل سے کام لینا چاہئے۔ اس کتاب میں اس نے ثابت کیا ہے کہ لذتی اسکول نے یورپ پر زیادہ اثر ڈالا ہے، اس وقت یورپ فلسفہ لذتیت کا کاربند نہیں، بلکہ پابند ہے۔

امام ابن تیمیہ کی کتاب میں نے پہلے پڑھی تھی، اس لئے بہت چیزوں کی مجھے تصدیق

ہوئی، انہوں نے ایک بڑے کام کی بات کہی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ ایک چیز ہے "نفی" اور ایک ہے "اثبات"۔ امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یونان کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ ان کے یہاں نفی زیادہ ہے، اثبات کم ہے، حالانکہ سارا عمل، جوش عمل، طاقت اور انرجی سارے ذہنی و اعصابی محرکات، اعصابیت پیدا ہوتی ہے اثبات سے، نفی سے پیدا نہیں ہوتی، قرآن کیا کہتا ہے "لیس کمثله شئی" "وھو السمیع البصیر" "اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے، لیکن جب اس کی صفت بیان کرتا ہے تو کہتا ہے **ھو الخالق البارى المصور له الاسماء الحسنى يسبح له مافى السموات والارض وھو العزيز الحكيم**۔ اور پھر اس سے پہلے کی جو آیتیں ہیں ۵۔۱۰ صفتیں بیان کی ہیں کہ اللہ یہ ہے، اللہ یہ ہے اور ان صفتوں کا تعلق انسانی زندگی سے بھی ہے اور کائنات سے بھی ہے، اس سے آدمی میں ایک جذبہ عمل پیدا ہوتا ہے، جذبہ دعا پیدا ہوتا ہے، جذبہ عبادت بھی پیدا ہوتا ہے، ایک اطمینان اور سکون قلب پیدا ہوتا ہے کہ میں جس خدا کا پرستار ہوں، وہ بڑا رحمان ورحیم ہے، وہ بڑا حکیم و بصیر ہے، وہ خالق ہے کائنات کا اور قادر ہے ہر چیز پر۔

پھر جس سے فائدہ پہنچا، وہ گبن کی مشہور کتاب ہے Decline and Fall of the Roman Empire اس سے معلوم ہوا کہ رومۃ الکبریٰ کی سلطنت سے کیا غلطیاں ہوئیں، کیا اس میں ناہمواریاں پیش آئیں اور اس میں ضعف کے سرچشمے کیا تھے، کیوں اتنی بڑی رومۃ الکبریٰ جو دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہی تھی، اس کو زوال ہوا، اور پھر اس کتاب Makin of Humanity پڑھی، اس میں انسانیت کی تعمیر اور تخریب کی تاریخ پر بحث کی گئی۔

آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ لوگ ان کتابوں کی طرف توجہ کریں اور ان پر خامہ فرسائی کریں، جنہوں نے ان کے اندر انقلاب (پیدا) کیا اور کس طرح سے انقلاب (پیدا) کیا؟ اور پھر ایسی منتخب اور مفید کتابوں کے پڑھنے کا مشورہ دیں۔

(ماہنامہ ''سیارہ'' (لاہور) نے مختلف ارباب علم وادب سے ان کے ذوقِ مطالعہ، تصنیف وتالیف اور ذہنی نشو وارتقاء کے حوالے سے ایک مفصل سوال نامے کے جواب حاصل کیے تھے، ذیل میں سوالنامہ، اور مولانا علی میاں کا جواب ماہنامہ مذکور کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۶۵ء سے نقل کیا جاتا ہے۔ مرتب (۱)

سوالنامہ

۱۔ آپ کے اندر ذوق مطالعہ کب نمایاں طور پر متحرک ہوا؟ آغاز کیسے ہوا؟ اس کا نشونما کس طرح ہوا؟ کیسا ذہنی ماحول اس میں آپ کیلئے ممد ہوا؟ نظام تربیت کا اثر کہاں تک ہوا؟ کون سی شخصیتیں تھیں جنہوں نے آپ کے ذوق مطالعہ کو مہمیز کیا اور اس سفر میں رہنمائی؟ آپ کے مطالعہ کے مختلف دور؟ ذوق میں ارتقائی تبدیلیاں؟

۲۔ آپ کے پسندیدہ موضوعات مطالعہ کیا رہے؟

۳۔ آپ اردو کے علاوہ اور کن زبانوں میں مطالعہ کرتے ہیں (انگریزی؟ عربی؟ فارسی؟ بنگلہ؟ ہندی؟ پنجابی؟ سندھی؟ پشتو؟ بلوچی، دیگر زبانیں؟)

۴۔ اردو اور انگریزی کا تقابلاً سامنے رکھ کر فرمایئے کہ دونوں میں کس زبان میں آپ کا مطالعہ زیادہ وسیع ہے؟

۵۔ آپ کے پسندیدہ مصنفین؟ آپ کے پسندیدہ کتابیں؟ آپ کے پسندیدہ رسائل؟ پسندیدہ شعراء؟ پسندیدہ افسانہ نگار؟ پسندیدہ مزاح نویس اور طنز نگار؟

۶۔ آپ اپنی دنیائے مطالعہ میں کسی ایک مصنف کو بلندترین مقام پر رکھتے ہیں جس کا آپ کی ذہنی نسوونما پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہو؟ (خصوصاً اردو لکھنے والوں سے)

۷۔ آپ کی نگاح میں وہ بہترین کتاب یا تحریر جس نے آپ پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہو؟ (خصوصا اردو زبان میں)

---

(۱) حیات وافکار کے چند پہلو۔ مؤلفہ جناب سفیر اختر صاحب

۸۔ ایسے دو چار مقالات، نظموں یا افسانوں کا ذکر جن سے آپ کی فکری یا عملی زندگی متاثر ہوئی ہو؟

۹۔ اُردو رسائل کے اب تک جتنے خاص نمبر آپ کی نظر سے گزرے ہیں۔ آپ کو ان میں سے بہت زیادہ پسند کون سے رہے؟ خصوصاً اگر کسی ایک کو بہترین قرار دے سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔

۱۰۔ یہ بھی فرمایئے کہ مطالعہ میں آپ کی پسند کے بالمقابل آپ کی ''ناپسند'' کیا ہے؟ کن چیزوں کے مطالعہ سے آپ کی طبیعت آبا کرتی ہے؟ آپ کوئی ایسی نگارش بتائیں جس سے آپ کو نفرت محسوس ہوئی ہو؟

۱۱۔ بالعموم آپ کے مطالعہ کے اوقات کیا ہوتے ہیں؟ پروگرام کس طرح چلتا ہے؟ مطالعہ کی نشست کس طرح کی آپ کو پسند ہے؟ رفتار مطالعہ کیا ہوتی ہے؟

۱۲۔ تنہائی اور خموشی آپ کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے یا آپ ہجوم اور شور و شغب میں بھی پڑھ لیتے ہیں؟

۱۳۔ سفر میں آپ نے مطالعہ کا کیا تجربہ کیا؟

۱۴ کیا مطالعہ کے دوران آپ کتاب پر نشانات لگاتے ہیں؟ کیا آپ الگ نوٹ یا خلاصہ لکھتے ہیں؟

۱۵۔ آپ کا حافظہ آپ کی وسعت مطالعہ کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے؟ کیا آپ کو پڑھی ہوئی کتابوں اور مضامین کے مطالب اور ان کے مصنفین کے نام پوری طرح یاد رہتے ہیں؟

۱۶۔ آپ اپنے مطالعہ، حاصل مطالعہ اور ذوق مطالعہ میں کیا اپنے گھر کے لوگوں، خصوصاً بچوں کو۔ (اگر وہ ہوں) بھی حصہ دار بناتے ہیں؟ بچوں کی تربیت ذوق کیلئے آپ کے تجربات کیا ہیں؟

۱۷۔ کیا آپ کی ذاتی لائبریری ہے؟ اس کا حدودِ اربعہ کیا ہے؟ اس میں اہم ترین کتابیں کون سی ہیں؟ خاص خاص کتابوں کو حاصل کرنے کیلئے اگر آپ کو کوئی خاص معرکہ سر کرنا پڑا ہو تو درج فرمایئے۔ نمایاں شخصیتوں کی طرف سے ہدیہ میں آئی

ہوئی کتابیں؟

۱۸۔ کتابیں مستعار دینے اور لینے کے متعلق آپ کے تجربات کیا ہیں اور اس معاملے میں نظریہ ومسلک کیا ہے؟ کیا کچھ واقعات ایسے ہیں کہ بعض اہم کتابوں سے آپ ہاتھ دھو بیٹھے ہوں؟

۱۹۔ آپ ایک اوسط درجہ کے عام تعلیم یافتہ آدمی کو مشورہ دیں کہ وہ موجودہ مصروف زندگی میں مطالعہ کا پروگرام کیسے بنائے اور کتابیں کیسے فراہم کرے؟

۲۰۔ خاص طور پر ادبی مطالعہ کی ضرورت واہمیت کیا ہے؟ عام آدمی کے لئے؟ طلبہ کے لئے؟

۲۱۔ ادبی مطالعہ کیلئے نوجوانوں کو آپ کیا رہنمائی دیتے ہیں کہ وہ کن مصنفین اور کتابوں کو لازماً پڑھیں؟ نیز آپ اردو کے ایسے موجودہ رسائل کی نشاندہی کریں جن کا مطالعہ صحت مند فکر کی نشوونما میں مدد ہو۔

۲۲۔ کیا آپ کسی بہتر اور موثر اسلوب سے لوگوں کو یہ بتا سکتے ہیں کہ صرف تفریحی مطالعہ کافی نہیں، اس کے ساتھ علمی، ادبی اور معلومات چیزوں کا مطالعہ ضروری ہے اور پروگرام میں توازن ہونا چاہئے؟

۲۳۔ ڈائجسٹوں کا جو دور ہمارے یہاں شروع ہوا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ایک رائے یہ ہے کہ اس طرز کے رسائل انگریزی رسائل کی جگہ لے کر اردو کے حق میں مفید پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ادبی مطالعہ کے راستے میں حائل ہو رہے ہیں۔

۲۴۔ آپ کے سامنے ایک مسلمان معاشرہ ہے اور یہ واضح ہے کہ نوجوانوں کی بڑی بنیادی ضرورت ہے کہ وہ اسلام کے انقلاب آفریں نظریہ حیات، اس کے ضابطہ ونظام، اس کے تہذیب وتمدن اور اس کی شاندار تاریخ کو جانیں، اس سلسلے میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ کن مصنفین اور کن کتابوں کی طرف رہنمائی دیتے ہیں؟

۲۵۔ کچھ لوگوں کی رائے میں قرآن ناظرہ پڑھنے کے بجائے سمجھ کر پڑھنا چاہئے، طوطے کی طرح رٹنے کا کیا فائدہ؟ آپ کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

جواب

اس وقت اس حال میں یہاں (نہیں) ہوں کہ دماغ پر زیادہ زور ڈال سکوں یا کوئی مضمون پوری توجہ سے لکھوا سکوں، زیادہ وقت بستر پر پڑے ہوئے گزرتا ہے۔ اس وقت اتفاقاً آپ کے سوال نامے کا کاغذ نکل آیا اور ایک عزیز نے پڑھ کر سنایا۔ سوالات بڑی ذہانت سے مرتبہ کیے گئے ہیں اور طبیعت کو اکساتے ہیں۔ دل میں ان کے جواب دینے کی تحریک پیدا ہوئی، طبیعت کے مشورہ کو جو پاسبان عقل ہے، ذرا ہٹا کر دل کو تنہا چھوڑ دینے پر عمل کرنے کو جی چاہا۔ آپ نے انتخاب کی آزادی دے دی ہے، اس لئے ہلکے پھلکے سوالات کا جواب دے دیتا ہوں وہ بھی مختصر۔

نمبرا۔ قدیم شرفاء اور علماء کے دستور کے مطابق اور بعض خاص اسباب کی بناء پر اس سے کچھ زیادہ ہمارے گھر میں وسیع موروثی کتب خانہ تھا۔ دادا صاحب اور والد صاحب رحمتہ اللہ علیہم (حکیم سید فخر الدین مصنف ''مہر جہاں تاب'' اور سید عبدالحئی مصنف ''گل رعنا'' و ''نزہتہ الخواطر'') دونوں بڑے مصنف تھے۔ یہ کتب خانہ کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا جن میں عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کی کتابیں تھیں۔ میرے بڑے بھائی صاحب (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب مرحوم) بڑے اچھے مربی و ماہر نفسیات تھے، انہوں نے کتابوں سے مانوس کرنے کیلئے اور اس موروثی دولت کی قدر کرنے کیلئے کتابوں کو دھوپ دکھانے اور ان کی حفاظت و پرداخت کے کام میں پہلے شریک کیا، پھر اس کی ذمہ داری ڈالی۔ پرانی کہاوت ''کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے'' کے مطابق پہلے کتاب و مصنف کا نام پڑھنے، پھر اس کو کہیں کہیں سے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس سے کتاب بینی کا جو بہت حد تک موروثی اور فطری تھی، چسکا پڑ گیا اور یہ شوق لت اور بیماری کی حد تک پہنچ گیا۔

نمبر۲۔ میرے لئے سب سے زیادہ ذوقی اور تفریحی موضوع جس میں کبھی طبیعت پر بار نہیں پڑتا اور جس سے سیری نہیں ہوتی، تذکرے، تراجم اور سوانح حیات کا موضوع ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دادا صاحب اور والد صاحب بڑے

مؤرخ اور سوانح نگار تھے، اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس مشغلے میں صرف ہوا۔
اس کے بعد دوسرے درجہ میں ادبیات، خاص طور پر وہ ادبی کتابیں جن میں تکلف، آورد اور ضائع وبدائع نہ ہوں، لیکن نظم سے زیادہ نثر کی کتابیں پڑھنے کا ذوق ہے، اور وہ عربی اردو دونوں میں یکساں ہے۔

نمبر۳۔ سب سے زیادہ عربی میں، دوسری نمبر پر اردو اور بضرورت انگریزی میں مطالعہ کا اتفاق ہوتا ہے۔ جب سے نظر کمزور ہوئی، انگریزی کا مطالعہ برائے نام رہ گیا۔

نمبر۴۔۵۔ پسندیدہ مصنفین، پسندیدہ تصانیف اور مضامین کے متعلق میرے مضمون ''میری محسن کتابوں'' میں خاصا مواد آ گیا ہے۔ مزاحیہ لکھنے والوں میں مجھے پرانے لکھنے والے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سب سے زیادہ پسند ہیں، پطرس کے بعض اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے وہ مضامین جن میں زیادہ علمیت اور تفلسف نہیں ہے، پسند آتے ہیں، نیز ان کے مضامین کے مجموعوں میں سے ''گنج ہائے گراں مایہ'' بہت کامیاب اور دل آویز ہے۔
طنز نگار میں مولانا عبدالماجد دریابادی خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ خاص طور پر جہاں زیادہ تلخی اور تیزی نہیں ہوتی۔ یہ احتیاط مولانا آزاد کے یہاں زیادہ ہے اور ان کے ادب کے وہ حصے اگر چہ کم ہیں، لیکن (ہیں) بہت لطیف اور سبک۔

نمبر۶۔ یہ کہہ سکتا ہوں کہ بچوں کی ابتداء میں ندوۃ العلماء کی تحریک سے تعلق رکھنے والوں کی تصنیفات اور تحریریں زیادہ پڑھیں، اس لئے ان کا اثر زیادہ ہے۔ اردو انشاء اور نثر نگاری میں شاید سب سے زیادہ اور اولین اثر خود اپنے والد صاحب کا پڑا، خصوصاً ان کی کتاب ''یاد ایام'' اور ''گل رعنا'' کا۔ دوسرے نمبر پر مولانا شبلی کا۔

نمبر۔۷۔۸۔ کے جوابات بھی میرے مذکورہ بالا مضمون سے مل سکتے ہیں۔

نمبر۹۔ اردو رسائل کے خاص نمبر نہ تو بہت زیادہ دیکھے اور نہ اس وقت ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے ''الفرقان'' کا ''مجدد نمبر'' اور ''شاہ ولی اللہ نمبر'' زیادہ دلچسپی سے پڑھے۔

نمبر۱۰۔ وہ کتابیں جن کا پڑھنا بڑا مجاہدہ ہے اور شدید ضرورت کے بغیر ان کے چند صفحات

کا پڑھنا بھی میرے لیے دشوار ہے، وہ تین طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک مناظرہ اور تردید کی کتابیں، دوسرے خشک فلسفیانہ مباحث یا وحدۃ الوجود وغیرہ اور فلسفۂ اخلاق کی متصوفانہ کتابیں، تیسرے قادیانی لٹریچر جو حسن انشاء، حلاوت تحریر اور عمق فکر سے یکسر خالی ہے۔

نمبر ۱۱۔ چوں کہ میری تحریر و تصنیف کا وقت صبح کو نماز فجر اور چائے کے بعد سے لے کر موسم گرما میں اس وقت تک کہ گرمی شدید نہ ہو اور موسم سرما میں ظہر کے وقت تک محدود ہے۔

اس کے علاوہ سالہا سال سے کسی دوسرے وقت میں تصنیفی کام نہیں کیا کرتا، اس لئے پڑھنے کا وقت ظہر سے عصر تک اور سفروں میں تقریباً دن بھر (کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ)۔ رات کا پڑھنا نظر کی کمزوری کی وجہ سے تقریباً بیس پچیس سال سے بالکل بند ہے، سوائے اس زمانہ کے جس میں دار العلوم کے اندر حدیث کا کوئی درس اپنے ذمے لے لیتا تھا، اس کے لیے بہت مطالعہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ لکھنے کا کام نہیں ہوتا یا لکھنے کیلئے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے تو فجر وظہر کے درمیان کا وقت بھی مطالعہ ہی میں صرف ہو جاتا ہے۔

میں میز کرسی پر یا ڈسک پر لکھنے کا کبھی عادی نہیں رہا۔ عام طور پر اس طرح لکھتا ہوں جس طرح آپ نے کاپی نویسوں کو لکھتے دیکھا ہوگا۔

رفتار مطالعہ عام طور پر سست ہے، طبیعت رواروی کے ساتھ پڑھنے پر قانع نہیں ہوتی، لیکن اس کا زیادہ انحصار موضوع اور مضمون کی نوعیت پر ہے، ادبی اور تاریخی چیزیں تیز رفتاری سے پڑھتا ہوں اور علمی مباحث آہستہ رفتاری اور دقت نظر کے ساتھ۔

نمبر:۱۲۔ عام طور پر شور شغب اور لوگوں کی موجودگی سے میرے مطالعہ میں بعض اوقات لکھنے میں بھی کوئی خلل نہیں پڑتا اور شاید بعض لوگوں کیلئے یہ بات موجب تعجب ہو کہ بعض اوقات اس سے مدد ملتی ہے میں اپنے بعض اہم مضامین اور کتابیں تھرڈ کلاس کے مسافروں سے بھرے ہوئے ٹرین کے ڈبے میں لکھی ہیں جب

طبعیت میں روانی پیدا ہوجاتی ہے اور اپنے اندر لکھنے کا تقاضا اور مضامین وخیالات کی چونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں تو شورو ہنگامہ اس میں مخل نہیں ہوتا لیکن جب ایسی کیفیت نہ ہواور طبعی بند و کند معلوم ہوتی ہوتو تنہائی اور خاموشی کی تلاش ہوتی ہے۔

نمبر ۱۳- جب سے زمانہ قیام اور حضر کی مشغولیتیں اور ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں کسی نئی کتاب کے مطالعہ کا زیادہ تر موقع سفر ہی میں ملتا ہے جو بکثرت پیش آتے ہیں اور اس لحاظ سے سفر میں بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں صدہا صفحات کی کتابیں اکثر سفر میں ہی ختم ہوتی ہیں۔

نمبر ۱۴- کتابوں پر نشان لگانے کی عادت بہت پرانی ہے اور میں نے اپنے استاد اور بزرگ مولانا طلحہ صاحب ایم اے سابق استاد اورینٹل کالج لاہور سے سیکھی ہے لیکن نشان بڑی احتیاط سے سرخ پنسل سے لگاتا ہوں اگر گاڑی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے تو اس کے ٹھہرنے کا انتظار کرتا ہوں تاکہ نشان کتاب میں بدنمائی پیدا نہ کرے۔ حاشیے میں اپنی رائے بہت خوش خط لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بعض اوقات ناواقف ایسے خواشی چھپے ہوئے نظر آتی ہیں ان نشانوں اور حواشی سے کتاب کے دوبارہ پڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ اوراس کے بہترین حصے تصویر کی طرح سامنے آجاتی ہیں۔

نمبر ۱۵- میرا حافظہ خاندانی طور پہ کمزور ہے لیکن اپنے ذوقی مضامین میں حافظہ زیادہ رفاقت اور رواداری کا ثبوت دیتا ہے، غیر ذوقی مضامین میں سے بہت کم میرے خیال میں حافظہ کا کچھ تعلق ذوق پسندیدگی سے بھی ہے۔

نمبر ۱۶- اپنی پسندیدہ چیزوں میں ہم نشینوں اور عزیزوں کو شریک کرنا ایک فطری امر ہے اور شاید یہ میرے اندر بہت سے لوگوں سے بڑھی ہوئی ہوگی، مجھے اپنے بزرگوں کی اس عادت سے خود بھی فائدہ پہنچا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے عزیزوں اور اہل مجلس کے لئے بھی یہ بات اسی قدر مفید ہوگی۔

نمبر ۱۷- ہم دونوں بھائیوں کو ایک بڑا وسیع اور متنوع کتب خانہ وارثت میں ملا جو کئی

پشتوں اور ایک علمی خاندان کا اندوختہ اور ترکہ ہے۔ لیکن اسکی موجودگی میں بھی اپنے ذوق وضرورت کی کتابیں خریدنے کا شوق بچپن سے ہے۔ اور اس سلسلے میں بچپن کے واقعات کسی حد تک مضحک اور کسی حد تک سبق آموز ہیں۔ اس شوق کا آغاز اس عمر سے ہوگیا جس عمر میں عام طور پر بچوں کو کھلونوں اور مٹھائیوں کے خریدنے کا شوق ہوا کرتا ہے۔ ذوق اور نقاہت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس شوق میں بھی اصلاح وترقی ہوتی گئی چنانچہ خود اپنی خریدی ہوئی اور مصر وشام سے منگوائی ہوئی کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع ہوگیا ہے جو اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہے مگر منتخب ہے۔ اس مین زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جن کی حیثیت کسی موضوع پر چھوٹے سے دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) جو اپنے موضوع پر خود ایک چھوٹے سے کتب خانے کا کام دیتی ہے۔ چوں کہ شروع سے عربی ادب اور انشاء کا ذوق ہے اس لئے ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہین جن کی کوئی علمی و فکری اہمیت نہیں ہے مثلاً اغانی کا خلاصہ اور ادباء کے مضامین کے مجموعے۔ اس منتخب ذخیرے میں ''دیوان غالب'' مثنوی، کی کلید ''مرائۃ المثنوی'' کلام اقبال اور'' گلستان بوستان بھی ہے۔

بعض دفعہ مصر وشام کی کسی نئی چھپی ہوئی کتاب کے حصول کیلئے اپنے عزیوں اور دوستوں کو لکھنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ایک کتاب جس کی قیمت آٹھ دس روپے سے زائد نہیں، کسی تصنیف کے سلسلے میں ہوائی ڈاک سے منگوائی جاتی ہے اور وہ پچاس ساٹھ روپے میں پڑی ہے۔

اسلامی فکر عرب مصنفین اکثر اپنی تصنفیات از راہ کرم ہدیہ بھیجتے ہیں اکثر سفروں میں علمی ہدایا اور مصنفین کی دستخطوں سے مزید ہوکر ملے ہیں جو اس ذاتی کتب خانہ کی زینت ہیں۔

نمبر ۱۸- کتابیں مستعار دینے میں بڑے تلخ تجربے ہوئے ہیں اس سلسلے میں اچھے اچھے اہل علم کی بے احتیاطی مشہور ومعروف ہے بعض مرتبہ مستعار لینے والے اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے اور مستعار دینے والا بھول جاتا ہے کہ کتاب کس کو دی

تھی، میرے ساتھ یہ المیہ بہت پیش آیا ہے اس سے کمتر المیہ یہ ہے کہ مستعار لینے والا کتاب بے احتیاطی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کتاب پر دھبے اور نشان پڑ جاتے ہیں اور بعض اوقات ستم ظریف اس پر اپنے حواشی اور تأثرات ثبت کردیتے ہیں اور کتاب جی سے اتر جاتی ہے، مجھے دو مرتبہ ایک کتاب سے اس لئے دستبردار ہونا پڑا کہ اس پر دھبے پڑ گئے تھے۔ یا حواشی نے اس کی رونق ورعنائی ختم کردی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کردوں کہ میں شروع سے کتاب کے بارے میں کچھ زیادہ نفاست پسند اور ذکی الحس واقع ہواں ہوں کتاب پر پسینے کے دھبے یا کسی پڑھنے والے کا حاشیہ ارائی مجھے کتاب کے مطالعہ سے محروم کردیتی ہے۔ اور بعض اوقات مستعار لینے والے ہی کو نذر کردیتا ہوں کہ اب میرے کام کی نہیں رہی۔

نمبر ۱۹- میرے نزدیک ابتدا میں ادبی مطالعہ کی اہمیت بہت ہے خوش قسمتی سے جن لوگوں کو ابتدا میں اچھی ادبی کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جاتا ہے۔ اور ان کا ادبی ذوق کسی حد تک بن جاتا ہے۔ یا ان کے اندر ادبیت کے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں۔ وہ خواہ فلسفہ کا موضوع اختیار کریں یا دینیات کا میدان۔ ان کی تحریر میں شگفتگی اور شیرینی باقی رہتی ہے۔ اور وہ زیادہ کامیاب مصنف ثابت ہوتے ہیں میرے نزدیک ہر مرحلے میں کسی نہ کسی قدر ادبی مطالعے کا عنصر شامل رہنا چاہئے۔

نمبر ۲۰-۲۱- ادبی مطالعہ اور تحریروں کی مشق کیلئے اس وقت نوجوان کو مولانا شبلیؒ مولانا حالیؒ، مولانا سلیمان ندویؒ، مولانا آزادؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ، ڈاکٹر سید عابد حسینؒ، چوہدری غلام رسول مہرؒ، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ کی کتابوں کی تحریروں کو ضروری دیکھنا چاہئے۔ اس سے زیادہ ادبی ذوق اور زبان کی واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو تو پھر کچھ تحدید نہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور خالص ادیبوں کو بھی پڑھنا ہوگا۔ یہ نام تحریر کی پختگی، شفتگی اور زبان کی صحت کے لحاظ سے پیش کئے گئے ہیں۔ کسی مخصوص خیالا

وافکار یہاں بحث نہیں ہے یہاں بحث نہیں۔

نمبر۲۲- محض تفریحی ادب کے مطالعہ سے ذہن میں سطحیت ،علم اور فکر میں بے مغزی اور معلومات میں تہی مائیگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور ایسا آدمی کوئی وقیع اور موثر کام نہیں کرسکتا۔تفریحی ادب کا وہی حصہ ہونا چاہئے جو نمکیات وفواکہ کا ہوتا ہے۔اور بعض اوقات اس سے کہیں زیادہ فلسفیانہ اور فکر انگیز مباحث کا مطالعہ بھی ذہن میں تحریک پیدا کرتا ہے۔اوراس کا کچھ نہ کچھ حصہ بھی شامل رہنا چاہئے۔

نمبر۲۳- اردو ڈائجسٹوں کا سلسلہ مفید اور ہمت افزائی کا مستحق ہے لیکن اس میں مزید محنت اورحسن انتخاب کی ضرورت ہے۔ اردو کی اشاعت وترقی کیلئے یہ سلسلہ یقیناً مفید ثابت ہوتا۔ان میں اگر ادبی عنصر کا اضافہ اور ادبی شخصیات اور کلاسیکل ادب کے تعارف کا سلسلہ بھی شروع کردیا جاتا ہے۔اور وہ شوق انگریز اور مطالعہ کے لئے مہمیز ہوتو اس سے یہ خطرہ بھی باقی نہیں رہے گا۔کہ لوگ قدیم مستند ادب سے بے تعلق ہوجائیں گے۔

نمبر۲۴- اس سلسلہ میں دارالمصنفین ،ندوۃ المصنفین اسلام پبلی کیشنز اقبال اکیڈمی ،شاہ ولی اللہ اکیڈمی ،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام جیسے اداروں کی مطبوعات کا مطالعہ مفید ہوگا۔اس سلسلہ میں تواضع اور انکسار کو برطرف رکھ کر ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے سلسلے کے مطالعہ کا مشورہ بھی دوں گا۔

نمبر۲۵- میرے نزدیک ابتدا میں ناظرہ قرآن مجید پڑھنا بہت ضروری ہے۔یہ الگ بات ہے کہ بعض ماہرین تعلیم کی رائے کے مطابق تھوڑی سی اردو پڑھا کر قرآن شریف کا پڑھنا زیادہ بہتر ہوگا۔عام دستور کے مطابق قرآن مجید ہی سے ابتدا کرانا زیادہ بہتر ہے۔بہرحال مجھے اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ سمجھ کر قرآن مجید کی استعداد پیدا ہونے کے انتظار میں ناظرہ پڑھانے کو بالکل موقوف رکھا جائے۔ ناظرہ قرآن شریف پڑھنا اور محض تلاوت خود ایک بڑی عبادت اور ایک امر مقصود ہے۔سمجھ کر پڑھنا یہ ایک الگ کام اور ضرورت ہے ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہے۔

مولانا فضل محمد (م ۱۹۸۱ء) مہتمم مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی، ضلع بہاول نگر دینی تعلیم کے مروجہ نصاب میں ترمیم کرتے ہوئے اپنے مدرسے کے لئے ایک نیا نصاب مرتب کرنا چاہتے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے تقسیم ہند سے کچھ پہلے مشاہیر وقت کو ایک سوالنامہ ارسال کر کے ان کی رائے طلب کی تھی، مولانا علی میاںؒ نے مختصراً اپنی رائے کا اظہار خط کی صورت میں کیا، خط سے پہلے مرسلہ سوالنامے پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ مرتب [۱]

سوال نامہ

سوال نمبر 1۔ ''علوم مقصودہ'' تفسیر حدیث فقہ میں کون کون سی کتابیں رکھی جائیں جن سے کم از کم وقت میں اچھا اور زیادہ کام لیا جا سکے۔

2- ترجمہ قرآن شریف کے بعد تفسیر میں ''جلالین'' کے علاوہ کوئی دوسری معتدل تفسیر بھی تجویز کی جائے ''تفسیر مظہری'' یا '' تفسیر جوہری طنطاوی'' کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔'' ؟

''دورۂ حدیث'' سے پہلے حدیث مشکوٰۃ شریف کے علاوہ ایسی اور کیا کتاب رکھی جائے جو حذف مکررات کے بعد صحاح ستہ کو حاوی ہو۔ جمع الفوائد اور تیسیر الاصول کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ فقہ کی مجوزہ کتب میں فتویٰ نویسی کی رعایت سے بھی کتاب ضروری رکھی جائے۔

3- اصول تفسیر، اصول حدیث ''الفوز الکبیر'' ''نخبۃ الفکر'' کے علاوہ اور کیا کتاب رکھی جائے خیر الاصول اور مولانا عبدالحق دہلوی کے رسالہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

4- ''علوم آلیہ'' ادب، کلام، معانی، مناظرہ، فلسفہ، ہیئت میراث، صرف، نحو،، میں کیا کیا کتابیں رکھی جائیں۔ جو بقدر ضرورت استعداد کو حاوی ہوں نیز وقت میں بحیثیت انفرادی ''علوم مقصودہ'' سے زائد نہ ہو۔ طریق مطالعہ و تعلیم کی وضاحت کی جائے۔ درستگی اخلاق وصالح باطنی وظاہری کا لحاظ بھی ضروری رکھا جائے۔

5- فلسفۂ جدید، منطق جدید، سائنس جدید علم کلام، تاریخ، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، علم النفسیات وغیرہ علوم عصریہ بھی آپ کے نزدیک قابل اضافہ ہیں یا نہیں؟۔ اگر ہیں تو

(۱) حیات افکار چند پہلو، مصنفہ جناب سفیر اختر صاحب

کون کون سی ہیں اور کس حد تک کتابیں کیا کیا رکھی جائیں۔ طریق تعلیم و مطالعہ کیا ہوں حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ اکابر کی کی کتابوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مناظرہ کے بارے مین موجودہ ضروریات مثلاً مزائیت، خاکساریت، بدعات ورسومات کی تردید و معلومات کیلئے مناسب کتب کی تجویز کی ضرورت ہے؟

6- فرضی مناظروں اور تقریروں کے بجائے اگر طلبہ کو عملی طور پر تبلیغ میں شرکت کا موقع دیا جائے۔ جس سے قوم کے صحیح امراض، احساسات ورجحانات کے انداز ہ کا موقع بھی ملتا رہے گا اور دکھی ہوئی رگوں پر صحیح نشتر زنی مشتق بھی تدریجاً بہم پہنچتی رہے گی۔ گویا طلبہ کیلئے علمی قسم کی ٹریننگ ہوگی۔ اس میں آپ کی کیارائے ہے؟

7- ابتدائی تعلیم کیلئے نمبروار ہدایات کی ضرورت ہے۔

☆۔ داخلہ کیلئے معیار عمر اوسطاً کیا رکھا جائے اور مدت تعلیم کتنی ہو

☆۔ اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کو بھی معیار قرار دیا جائے یا بلا تخصیص سب کو ایک طرف داخل کرلیا جائے۔

☆۔ دینیات کی تعلیم کا قدیم مروجہ طریقہ زیادہ مفید ہے کہ مثلاً اول قرآن مجید کی تعلیم مکمل کرلی جائے بعدازاں اردو، فارسی، وغیرہ شروع کرائی جائی یا جدید مخلوط طریقہ تعلیم زیادہ بہتر ہے مثلاً دینیات، اردو، فارسی قرآن شریف سب کے الگ الگ گھنٹے مقرر کردیئے جائیں۔ سب مضامین ایک ہی معلم کے متعلق ہوں۔ یا مختلف اساتذہ کے پاس ہونے چاہئیں۔ پہلی قدیم صورت میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے اور ثانی جدید صورت کے متعلقہ مضامین ناقص اور نامکمل رہ جاتے ہیں۔ آپ کے نزدیک اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے۔

☆۔ قرآن شریف، ناظرہ، حفظ، اردو، حساب، جغرافیہ وغیرہ کے مضامین کی مدت تعلیم کیا رکھی جائے۔

☆اوران کا نصاب کیا مقرر کیا جائے۔

☆معلم کے اوصاف ضروریہ کی تشریح فرمائی جائے۔

جسمانی تربیت کیلئے کیا طریقہ تجویز کیا جائے۔ اور ورزش کے لئے کون کون سے کھیل رکھے جائیں۔

حضرت مولانا فضل محمد نور اللہ مرقدہ متوفی ۱۹۸۱ء سابق مہتمم مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی، ضلع بہاول نگر نے دینی تعلیم کے مروجہ نصاب تعلیم میں ترمیم کرتے ہوئے اپنے مدرسے کے لئے ایک نیا نصاب تعلیم مرتب کرنے کے سلسلے میں جو خط مولانا علی میاںؒ کو ارسال کیا تھا، جس میں انہوں نے مولانا علی میاںؒ سے ان کی رائے طلب کی تھی تو مولانا علی میاںؒ نے مختصراً اپنی رائے کا اظہار اس خط کے ذریعے فرمایا تھا۔

دائرہ حضرت شاہ علم اللہ نقشبندی
رائے بریلی (ہندوستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم ومحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ آپ کے مدرسہ اور آپ کی مساعی سے اجمالاً واقفیت تھی جن مقاصد وخصوصیات کے ساتھ آپ کو مدرسہ چلانا چاہئے۔ وہ وقت کی اہم ضرورت ہے مگر افسوس ہے کہ حضرات علما ہی اس میں سب سے زیادہ بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے مجھے شدید خطرہ ہے۔ کہ مستقبل میں ہندوستان میں دینی تعلیم باقی رہ بھی سکے گی یا نہیں۔

میں نے رسالہ ''الفرقان'' اور ''الندوہ'' مرحوم میں ''اسلام کے قلعے'' کی عنوان سے ماتحت اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اگر کہیں سے آپ کو یہ پرچے مل سکیں تو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

آپ نے جو سوالات قائم ہیں ان کی جوابات کچھ تفصیل اور وقت چاہتے ہیں۔ اگر اس کا انتظار کیا جائے۔ تو معلوم نہیں کب اس کی نوبت آئے۔ اس لئے مختصراً عرض کر دیتا ہوں نیز بلا تکلف ہر سوال کے جواب کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ جو میرا موضوع نہیں اور اس سلسلے میں میری کوئی نظر اور علمی تجربہ نہیں، اس کو اصحاب نظر پر محول کروں گا۔

جواب نمبر ا- علوم مقصودہ کی تفسیر وحدیث وفقہ میں کتابوں میں اتنی تبدیلی اور اضافے کی ضرورت نہیں ہے جتنی طرز تعلیم، مطالعہ اور اسعداد آفرینی کے لحاظ سے ضرورت ہے ہمارے مدارس میں ان فنون میں جو مستند قدیم کتابیں داخل ہیں ان سے استغنا مشکل ہے۔ اور ان کا بدل بھی آسان نہیں لیکن طرز تعلیم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اصل انحصار معلمین ان کی تربیت زمانہ کے فہم اور روحِ دعوت اور جدید علم سے واقفیت پر ہے اس میں ہر جز مستقل تفیل طلب ہے۔ خط اسکا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مختصراً اگر معلمین ان کے علوم کے مقاصد وکلیات کو گرفت میں لے آتے ہیں زمانہ کے رجحات اور ذہن کے نئے راستوں سے واقف ہیں۔ مسائل دینیہ کو ذہن نشین کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور دعوت کا جذبہ ہے تو ان کیلئے موجودہ کتب بھی کافی اور مفید ہیں اور اگر ایسا نہیں تو کتابوں کی تبدیلی بے کار ہوگی اور میرے نزدیک ان کتابوں کو ابھی بحالہ قائم رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔

جواب نمبر۲۔ ترجمہ قران شریف کے بعد ''جلالین'' کے علاوہ ''مدارک'' مناسب ہوسکتی ہے مگر صل یہ ہے کہ کوئی ایک تفسیر ہی کافی نہیں طالب علم کو اس کا عادی بنانا چاہئے۔ کہ وہ چند تفسیروں کو سامنے رکھ کر مطالب حل کرے۔ اگر تھوڑے سے حصے میں بھی اس کی عادت پڑھ گئی تو بہت مفید ہوگی۔ تفسیر مظہری بھی کچھ طویل ہے، تفسیر طنطاوی، کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

دورۂ حدیث سے پہلے سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔ کہ کوئی کتاب ایسی کتاب پڑھائی جائے جس سے طالب علم کو روحانی اور اخلاقی فائدہ ہو اور مسائل اور احکام کے بجائے فضائل اعمال اور اخلاق معلوم ہوں اخلاص، ایمان، واحتساب اور جذبہ عمل بیدار ہو۔ اس کیلئے سب سے زیادہ موثر وبابرکت کتاب امام نووی کی ریاض الصالحین'' ہے اس کو ضرور رواج دینا چاہئے۔ کہ حدیث کا اصل موضوع یہی ہے اس کی طرف سب سے کم توجہ ہے۔ فتویٰ نویسی کے سلسلہ میں مولانا اعزاز علی اور جناب مفتی کفایت اللہ صاحب ا ور مولانا خیر محمد جالندھری سے استصواب کیا جائے۔

3- اصول تفسیر'' الفوز الکبیر'' نہایت ضروری ہے لیکن کوئی ایسے صاحب پڑھائیں جو قرآن مجید سے مناسبت اور قرآن مجید کا طبعی شوق رکھتے ہوں اور شاہ صاحب کی طرز سے آشنا ہوں۔ اصول حدیث کے سلسلہ میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (مظاہر العلوم'' مولانا ادریس صاحب (دارلعلوم) سے مشورہ کیا جائے۔

4- صرف ونحو طرز تعلیم بدلنے کی فوری شدید ضرورت ہے۔ سب سے ابتدا کتابیں اپنی

زبان میں مشق و استقرائی اصول پر ہوں مصر کا سلسلہ" النحو الواضح" اور اسکے اردو ترجمہ "تمرین النحو" ملاحظہ ہو مدرسین صاحب استعداد واجتہاد ہوں جو اپنے فن کو دلچسپ اور سہل کر سکیں۔

ادب سے پہلے زبان کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ ابتدائی درجوں کیلئے "الطریقۃ الجدیدۃ" (مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، استاذ دارالعلوم ندوہ) "قصص النبیین للاطفال" ۱،۲،۳، ازکاتب الحروف، القراءۃ الراشدہ (۱،۲،۳) زیر طبع اختیار کرنی چاہئیں عربی زبان کی تعلیم دراصل ہمارے مدارس میں نہیں ہورہی ہے اس کیلئے خود عربی عربی ممالک میں بھی شاید اس سے بہتر نصاب تیار نہ ہو۔

ادب کیلئے مختارات من ادب العرب (مطبوعہ درالعلوم ندوۃ العلماء) موزوں کتاب ہے۔ مکتبہ التعاون درالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو سے یہ کتابیں مل سکتی ہیں۔ الترجمہ العربیہ (مولفہ مسعود عالم ندوی ومولانا محمد ناظم) بھی قابل اضافہ ہیں۔

کلام کی تعلیم کیلئے قدیم کتابیں مثلاً شرح عقائد نسفی، وغیرہ نہ صرف ناکافی بلکہ مضر ہیں دراصل اس کی ازسرنو تدوین وتربیت کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک کوئی شایان شان کتاب نہ ہو۔ مضامین قرآن از راقم سطور، "رسالہ اہل سنت" از مولانا سلیمان ندوی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مطالعہ کیلئے "مذہب وعقلیات" از مولانا عبدالباری ندوی "مذہب وتمدن" از راقم السطور "تنقیحات" "تفہیمات" از سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ یہ سب علم کلام سے متعلق ایک نظریہ پر مبنی ہیں جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں کبھی ملاقات ہوتو عرض کیا جاسکتا ہے۔ نمبر ۵ کا بھی مجمل جواب اوپر آ گیا ہے۔ ان تمام عناوین کیلئے نئی کتابوں کی تربیت کی ضرورت ہے۔ اور اس کا سامان نہیں ہے۔ اگر ان میں عجلت سے کام نہ لیا جائے تو ایک متوسط مدرسہ کیلئے اس کی گنجائش نہیں ہے۔

شاہ صاحب کی کتابوں میں رسالہ "انصاف" اگر داخل درس ہوتو طلبہ حدیث کیلئے چشم کشا، بصیرت افروز و اعتدال آفریں ہوگا۔ باقی " ازالۃ الخفاء،، کے مطالعہ کے تشویش وترغیب ہو۔ "حجۃ اللہ" بلند (پایہ) کتاب ہے۔ اگر استعداد ہوتو اس کے منتخب ابواب پڑھانے چاہئیں۔

نمبر 6- مناظروں کے بارہ میں مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔اس سلسلہ میں مولانا الیاس صاحب کے طریقہ کے مطالعہ کی بھی ضرورت ہے۔مولانا کی سوانح اور ''ایک اہم دینی دعوت'' ضرور ملاحظہ ہو۔

۷ نمبر کے استفسارات تجارب وانتظامی امور سے متعلق ہیں مدارس کے مہتمم حضرات سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا جا سکتا ہے۔کبھی ملنا ہو تو شاید کوئی مفید بات ہو سکے۔

امید ہے کہ فی الحال اسی قدر پر اکتفا کی اجازت دی جائے گی۔اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب و بامراد فرمائے۔والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

خاکسار

ابوالحسن علی

علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہندوستان میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام ایک چار روزہ سیمنار منعقدہ ۲۲ تا ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء میں کی گئی ایک اختتامی تقریر

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبالله من شرور انفسنا ومن سيّئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد اعبده ورسوله الذی ارسله الله تعالی بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجامنيرا

مہارت اور اختصاص ضروری ہے:

حضرات! میں آپ کی اس عزت افزائی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس علمی مجلس کے افتتاح کے موقع پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا' اب اس کے آخری نشست کے اختتام پر بھی مجھے تقریر کا موقع دیا ہے' آغاز و انجام میں خاص مناسبت ہے' میں آپ کے اس اعتماد و اعزاز کے لئے دل سے شکر گزار ہوں' مجھے بڑی مسرت ہے کہ علوم اسلامیہ اور دینی موضوعات سے کچھ عرصہ سے عصری دانش گاہوں کے فضلاء بھی دلچسپی لینے لگے ہیں' اور یہ سیمینار اس کی دلیل ہے' اب علوم اسلامیہ کے ایک خادم اور میدان تحقیق کے پرانے مسافر کو اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کا حق ہے کہ

گئے دن کہ تنہا تھا مین انجمن میں
یہاں اب میرے راز داں اور بھی ہیں

دماغی صلاحیتوں کا خزانہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز نہیں ہے نہ کبھی مرکوز رہا ہے' اور نہ بھی مرکوز ہوسکتا ہے' اور ایسا ہونا کچھ اچھا بھی نہیں' اس طبقہ کے لئے خواہ بات کتنی ہی نازش و افتخار کی ہو' لیکن انسانیت کے حق میں یہ کوئی بہتر نہیں ہے کہ انسانی ذہانتوں کا خزانہ اور محنتوں کا ذخیرہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے' جہاں تک اسلام کا تعلق ہے آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں

علماءِ دین کا کوئی مخصوص موروثی طبقہ ہے، کلرجی اور پریسٹ ہڈ کا تخیل مسیحی دنیا میں ملتا ہے اس کا دنیائے اسلام میں کہیں وجود نہیں، اگر ہمارے بعض اہل قلم مصنفین کی تحریروں میں کچھ ایسی تعبیرات اور الفاظ آتے ہیں تو بے سوچے سمجھے یا مغرب کی تقلید میں، مثلاً اس وقت عرب مصنفین کے یہاں ''رجال الدین'' کا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے، جو تقریباً اسی معنی میں ہے جو مسیحی دنیا میں پرسٹ ہوڈ کیلئے استعمال ہوتا تھا، اس محتاط مصنفین جو اسلام کی صحیح روح اور صحیح فکر کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں، ان لفظوں سے ہمیشہ احتراز کیا ہے، لیکن علوم اسلامیہ کی طرف عصری دانش گاہوں کے فضلاء کی توجہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بھی میں یہ اضافہ کروں گا کہ کلرجی اور پریسٹ ہڈ اسلام میں نہیں ہے لیکن ایکسپرٹ اسپیشلسٹ ماہرین فن اور اصحاب اختصاص کا وجود ہمیشہ رہا ہے اور یہ ایک علمی حقیقت ہے، اس لئے کہ علوم اتنے پھیل گئے ہیں، اور ان میں اتنا تنوع اور وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ ایک آدمی کے لئے ہمہ واں ہونا عملاً ناممکن ہے، یورپ میں بھی ترقی اس وقت شروع ہوئی جب وہاں تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا گیا، اور علوم کے مختلف شعبے تقسیم ہوگئے، اور اس کی کوشش مغربی فضلاء نے چھوڑ دی کہ وہ تمام علوم میں اتھارٹی اور سند کا درجہ حاصل کریں، جہاں تک مجھے علم ہے یورپ میں اب بھی اس اصول کا احترام مشرق سے زیادہ کیا جاتا ہے، وہاں کہ علم کے فاضل بھی بعض اوقات اس علم کے بعید متعلقات کے متعلق بغیر کسی شرم وندامت کے محسوس کئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا موضوع نہیں، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے، ہمیں اس کو اصول کے تحت تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہماری آئندہ دلچسپیاں اور ہماری علمی اور تصنیفی سرگرمیاں کسی خاص موضوع یا فن کے ساتھ مخصوص ہوں گی۔

معیار کی طرف توجہ کی ضرورت ہے

مجھے خوشی اور فخر ہے کہ میں آپ کا ہم سفر ہوں ہم سفری کے اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کے سامنے چند باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں، آپ اس کو کسی تعریض پر محمول نہ فرمائیں، پہلی بات جسے میں محسوس کر رہا ہوں، اور آپ میں سے بہت لوگ محسوس کر رہے ہوں گے، بہت سے سینئر اسکالرز یہاں موجود ہیں جن کے ۳۰۔۴۰ برس اس صحرانوردی میں گزرے ہوں گے کہ علم وتحقیق کا معیار روز بروز گھٹتا جا رہا ہے، مجھے یورپ کے سفروں میں بھی اس کا احساس ہوا اور میں نے بعض فضلاء سے بھی سنا وہاں بھی اورینٹل ازم کا جہاں تک تعلق ہے، یعنی

مشرقی مباحث لکھنے کا، اس کا معیار فروتر ہوگیا ہے، اور وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جتنی محنت اور جیسا عشق اور لگن گزشتہ نسل کے فضلاء میں تھی، اس میں کمی ہے، اس کے پیچھے بہت سے عوامل کام کرتے ہیں، کچھ سیاسی ہیں کچھ معاشی ہیں۔

استشراق کی ترقی کا راز

ہر علم کے پیچھے بعض بہت طاقتور محرکات ہوتے ہیں، ان عوامل ومحرکات نے اورینٹل ازم کو ایک زمانہ میں چوٹی پر پہونچادیا تھا، فزکس اور ٹکنالوجی یا اکنامکس کے چند دائروں کو چھوڑ کر جہاں تک علمی اور نظر مباحث کا تعلق ہے، اورینٹل ازم کو یورپ میں اعزاز حاصل تھا، مستشرقین اور ان کی کتابوں کی جس طرح قدر ہوتی تھی وہ کم علوم کو حاصل تھی، یہاں تک کہ ادبیات اور لسانیات کے علوم کو بھی شاید وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا، اس کے پیچھے ایک بہت بڑا عامل کام کررہا تھا، ہم کو خوشی ہونی چاہے کہ اب وہ باقی نہیں رہا، وہ تھا استعمار، مشرق کے سب سے زیادہ سرسبز وشاداب ممالک بدقسمتی یا خوشی سے مسلمانوں کے زیر اثر تھے، ان پر مغرب کی للچائی ہوئی نگائیں پڑرہی تھیں۔

استعمار نئی نوآبادیاں قائم کرنا چاہتا تھا، اس لئے وہاں کے قومی مزاج اور خصوصیات اور ان کی خوبیوں سے زیادہ کمزوریوں سے واقف ہونے کی ضرورت تھی، اس کیلئے مستشرقین ایک ہراول دستہ کا کام کرتے تھے، ان کے پیچھے حکومتوں کی سرپرستی تھی، بڑے بڑے فنڈ اور بڑے بڑے ادارے تھے، اور ان کا اکرام بادشاہ اور صدر جمہوریہ کے دربار میں بھی ہوتا تھا، یہ عرصہ ہوا کمزور پڑ گیا ہے۔

دوسرا معاشی عامل تھا، اس پر بھی کچھ اثر پڑا ہے، معاشی ڈھانچہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں ہیں کہ اب وہ انعام ملنا مشکل ہیں جو پہلے ملتا تھا۔

علم کا عشق

تیسری چیز جو زیادہ توجہ کے قابل ہے، اور اس کو میں اصل سمجھتا ہوں وہ ہے، علم کا عشق جو ہماری پہلی نسل میں تھا، ایک لگن اور خودفراموشی کی کیفیت جو اس عہد میں تصنیفی اور تحقیقی کام کرنے والوں پر طاری رہتی تھی۔

یہ بات کسی خاص دانش گاہ یا جامعہ کو سامنے رکھ کر نہیں کہہ رہا ہوں' یہ میرا عالم مطالعہ ہے' تقریباً سب جگہ یہ محسوس کیا جارہا ہے (اور یہ بدقسمتی کی بات ہے) کہ علم سے عشق جو ہمارے اسلاف میں پایا جاتا تھا' اسلاف سے مراد مسلمانوں ہی کے اسلاف نہیں بلکہ گزشتہ نسل میں پایا جاتا تھا' وہ اب بہت کم نظر آتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کی کتاب ''علمائے سلف'' جو انہوں نے اسی علی گڑھ میں لکھی ہے اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ علم کا عشق اس وقت کے مصنفین اور محققین کے دلوں میں کیسا موجزن تھا' اور آج اس مین کس قدر نمایاں انحطاط ہوا ہے' یہ انحطاط کیوں ہوا؟ اس کا تعلق سیاسیات' معاشیات' ادبیات اور اخلاقیات سب سے ہے' اس کے پورے اسباب کا تجزیہ کرنا اس وقت نہ ضروری ہے' اور نہ اس کی گنجائش ہے' لیکن اتنی بات آپ تسلیم کریں گے اور ہمارے معزز شرکاء کار اور ہم سفر ضرور اس کو تسلیم کریں گے کہ علم سے عشق' شمع علم پر پروانگی کی کیفیت علم وتحقیق کا ایسا جنون کہ کھانے پینے' کپڑے کا ہوش نہ رہے' آج مفقود بلکہ معدوم نظر آتا ہے' علماء سلف کے واقعات کو چھوڑ دیجئے اسی علی گڑھ میں جو علماء پیدا ہوئے' مولانا لطف اللہ علی گڑھی ان کے اس عشق کو دیکھئے اور اس کو بھی آپ چھوڑ دیجئے' اس وقت کے مغربی مصنفین کے یہاں ''لین'' جس کا عربی لغت انگریزی دانوں کیلئے ہی نہیں بلکہ عربی ادب کے ان فضلاء کے لئے بھی قابل استفادہ ہے' جو تفصیلات میں جانا چاہتے ہیں' اور وہ مواد یکجا دیکھنا چاہتے ہیں' جو بعض اوقات بہت سے عربی لغتوں میں بھی نہیں ملتا' میں نے سنا ہے کہ قاہرہ میں جب وہ اس لغت کا کچھ حصہ تیار کررہا تھا تو مہینوں گزر گئے وہ کہیں نہیں گیا اس کو پتہ نہیں تھا کہ بازار کہاں ہے' بازاروں میں جانے اور اہرام مصر جیسے عجائبات عالم کو دیکھنے کی فرصت نہ تھی' اس کو آپ بدمذاقی یا مردہ دلی پر محمول کرسکتے ہیں' لیکن یہ واقعہ ہے' بہت سی لازوال اور لافانی تصانیف کی تاریخ اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے مصنفین پر خود فراموشی کا علم طاری تھا' یہ وہ چیز تھی جس نے مغرب ومشرق کے مصنفین کے قلم سے وہ زندہ جاوید تصانیف اور ایسی تحقیقات نکلوائیں (جن سے اختلاف کے باوجود) ان کی عملی قدر و قیمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ماضی قریب کی علمی شخصیتیں

میرا روئے سخن خالص اپنے ان دوستوں سے ہے، جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں، مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مولانا شبلی نے کتب خانہ اسکندریہ پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی، ایک زمانہ تھا، جب ہندوستان میں مشترک دانش گاہوں میں پڑھنے والے مسلمان طلباء کو چڑھانے کے لئے صرف یہ کہنا کافی تھا ''اچھا آپ اس نسل اس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے خلیفہ نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلوادیا تھا'' ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے وہ زمانہ پایا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم لوگ منہ چھپاتے تھے، بلکہ منہ چراتے تھے، اور آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے کہ اس کا کیا جواب دیں، ایک چلی ہوئی کہانی تھی کہ حضرت عمرؓ کو لکھا گیا کہ یہاں ایک کتب خانہ ہے، جو ظہور اسلام سے پہلے کا ہے، اس میں فلاسفہ کی اور منطقیوں کی کتابیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ اگر وہ قرآن کے مطابق ہیں تو اس کی ضرورت نہیں اگر خلاف ہیں تو اس کو آگ لگادینی چاہیے چنانچہ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ قرآن کے خلاف ہیں، اور بغیر پڑھے کتب خانے کو آگ لگادی، یہ ایک کہانی تھی جس کو ٹائن بی جیسا مؤرخ تک دہراتا ہے، ٹائن بی نے جب رسم الخط کی تبدیلی اور کمال اتاترک کی اصلاح پر تبصرہ کیا تو اس نے کہا اب کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کی ضرورت نہیں، صرف رسم الخط بدل دینا کافی ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس پر قلم اٹھایا، اور اس افسانہ کو آخری طور پر ختم کردیا کہ اب کسی پڑھے لکھے کو یہ بات زیب نہین دیتی کہ یہ کہے کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ان کے حکم سے جلادیا گیا، انہوں نے قدیم مورخین کی شہادتوں سے ثابت کردکھایا کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمرؓ کی خلافت سے پہلے ہی جل چکا تھا، اس کا کہیں وجود ہی باقی نہیں تھا، مثلاً انہوں نے جزیہ کے مسئلہ پر قلم اٹھایا تو اس بحث ہی کو ختم کردیا، یا انہوں نے ''شعر العجم'' لکھی تو اہل ذوق اور فارسی دانوں سے اپنا لوہا منوالیا، پروفیسر براؤن جن کی کتاب ''لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' اپنے موضوع پر (Gospel) کا درجہ رکھتی ہے، اور دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل تھی) نے کہا کہ مجھے اب اردو سیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے تو اس لئے کہ میں براہ راست ''شعر العجم'' کا مطالعہ کرسکوں، یہ سب اس علمی شغف اور علمی استغراق کا نتیجہ تھا جو ان لوگوں پر طاری تھا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ جن کا اصل موضوع قرآن مجید، سیرت نبوی ﷺ اور تاریخ اسلام

تھا انہوں نے ''عمر خیام'' پر ایک ایسی کتاب لکھی جس کی داد فضلائے ایران نے بھی دی' اسی طرح ان کی کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' محنت و کاوش اور ریسرچ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

میں اس موقع پر ''نزہۃ الخواطر'' کا بھی ذکر کروں گا' جو میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی تصنیف ہے' اور عربی میں آٹھ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی' اس میں ہندوستان کے ساڑھے چار ہزار مشاہیر اور اہل کمال کے تذکرے ہیں' انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں اس کام کا بیڑہ اٹھایا' جب عربی مطابع کا رواج اور اشاعت کی سہولتیں نہیں تھیں' تقریباً ۶۵ سال وہ اس کام میں مشغول رہے' اس وقت یورپ میں بھی یہ کتاب ہندوستانی علماء فضلاء کے حالات معلوم کرنے کا سب سے بڑا ماخذ ہے' اسی طرح ان کی دوسری کتاب ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' جو ہندوستان میں علوم الاسلامیہ اور نصاب درس کی تاریخ اور ہندوستانی علماء کی تصنیفات کی مکمل ڈائرکٹری ہے' اس کتاب کو دمشق کی رائل اکیڈمی ''المجمع العلمی العربی'' نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا' میں نے وہاں کی علمی مجلسوں میں بڑے بڑے فضلاء کو اس کی تعریف اور مصنف کی محنت کا اعتراف کرتے ہوئے پایا۔

علم محنت بھی ہے اور انعام بھی

ایک آدمی اس وقت وہ کام کرتا تھا جو ایک اکیڈمی اس وقت انجام نہیں دیتی' یہ سب ایک آدمی کی محنت کا نمونہ' ایک آدمی کی محنت کا کرشمہ اور ایک آدمی کے علم سے عشق کا نتیجہ ہے' آج اکیڈیمیاں' بڑے بڑے ادارے اور شعبے موجود ہیں' لیکن سالہا سال میں وہ کوئی پیش کش نہیں کر پاتے جس کو دیکھ کر اس علم کے ماہر یہ کہیں کہ ہاں یہ اوریجنل چیز ہے' بعض کتابیں دیکھ کر غالب کا وہ مصرہ پڑھنا پڑتا ہے

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

محنت کے معیار کو بڑھانے کی ضرورت ہے' علم محنت بھی ہے' انعام بھی ہے' پیاس بھی ہے' پانی بھی' بھوک بھی ہے' اور غذا بھی۔

جب تک اپنے فن سے اتنا تعلق نہ ہو کہ آدمی کو کتاب لکھنے پر اتنی خوشی ہو کہ وہ کہے اب مجھے اس ڈیپارٹمنٹ کا چیرمین بنایا جائے یا نہ بنایا جائے' میں نے اپنا کام کر دیا' میری محنت وصول ہوگئی۔

آج کے فضلاء اپنی کتاب اور تحقیق کو مکمل نہیں کر سکتے کہ وہ اسکے انعام کے متوقع ہو جاتے ہیں اور ان کی زہانت وتوجہ کا بڑا حصہ اسی مقصد پر صرف ہوتا ہے کہ آپ بہت سے آئی ایس ایم ایس سے واقف ہے ایک نئے آئی ایس ایم کا اضافہ کر لیجئے جو ہماری دانش گاہوں اور تعلیمی مرکزوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے اور وہ ہے (کیریرازم) یعنی Career کو بہتر بنانا اور تقرب اور علم کے ذریعے جاہ طلبی۔

دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو

دوسری چیز یہ کہ دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو مثلاً کسی سیمنیار کیلئے ہم کسی موضوع کو اپنے اوپر تھوڑی دیر کیلئے طاری کر لیں پھر اس کے بعد جیسے جگالی کیجاتی ہے پڑھ کر ہم اس کو اگل دیں اور نہ ہمیں اس موضوع سے محبت ہو اور نہ وفاداری ہو نہ فکر ہو کہ اس سلسلے میں کیا ہوا نہ اس میں اضافہ کرنے کا شوق ہو اس موقع پر اقبال سے مدد لیتا ہوں انہوں نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

علم اور تحقیق بھی ایک ہنر ہے اور اس ہنر کو زندگی بھر کا ساتھ دینا چاہئے۔ اس میں مقصدیت پیدا ہونی چاہئے وہ مثل شرر نہیں کہ بھڑکا اور بجھ گیا۔

علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں

جہاں تک علوم اسلامیہ کا تعلق ہے آپ بیشک اجتہاد کی ضرورت پر مقالے پڑھیں ہم سب اس کو تسلیم کرتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ اس کا دروازہ بند ہو جانے کے اسباب کیا تھے اور کہاں تک جائز تھے؟ لیکن میں ایک بات کہوں گا جہاں تک علوم اسلامیہ کا تعلق ہے اس کے کچھ سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں بلکہ ان کا اصل سرچشمہ وہی ہے۔ اس لئے ہمارا طرز عمل انکے بارے میں وہ نہ ہونا چاہئے جو ایک غیر مسلم مستشرق کا ہوتا ہے ہم صرف بحث کریں اور ہمیں نہ اس سے کوئی دلچسپی ہو نہ اس سے اتفاق ہو ایک حد تک اتفاق بھی ہونا چاہئے اور اگر وہ ایمانیات سے تعلق رکھتا ہے تو اس پر ایمان بھی ہونا چاہئے اور کسی حد تک عملی زندگی میں اس کی نمود بھی

ہونی چاہیے، میں اپنے بچپن میں ایک حکیمانہ مقولہ سنا کرتا تھا کہ "یک من علم را دہ من عقل باید" ایک من علم ہو تو دس من عقل ہونی چاہئے ورنہ آدمی اسکا صحیح استعمال نہ کر سکے گا، تو میں ترمیم کروں گا کہ تحقیق کی کسی بڑی سے بڑی مقدار کے ساتھ کسی تناسب سے تقویٰ بھی ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ مسئلہ علوم اسلامیہ کا ہے جس کا تعلق ایمانیات سے ہے، اگر ہم اس پر اس طرح عمل جراحی کرتے ہیں، جیسا کسی مردہ لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے، تو یہ مناسب نہیں، تنقید میں کسی قسم کی توہین یا تضحیک کی شان نہیں ہونی چاہئے کہ طنزیات و تضحیک کو خالص علمی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں، آپ کا اپروچ خالص علمی خالص اکیڈیمک ہو۔

حضرات! جو لوگ علم کی ذمہ داریوں اور تحقیقات و نظریات کی تغیر پذیری سے واقف ہیں، وہ اپنے کسی علمی نظریے یا تحقیق کے پیش کرنے میں جزم و وثوق، اور قطعیت کے الفاظ استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں، وہ اپنی کسی نئے خیال کو اس طرح نہیں پیش کرتے کہ وہ گویا اس موضوع پر حرف آخر اور تمام پچھلی تحقیقات پر خط نسخ پھیر دینے والا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے اس وقت کے مطالعہ اور تحقیق نے اس نتیجہ تک پہونچایا ہے، ممکن ہے کہ آئندہ اس میں تبدیلی کرنی پڑے یا کوئی نئی بات ثابت ہو، یا مجھے اندیشہ ہے کہ یہ بات اس طرح ہو، مجھے بدرالدین طیب جی کا یہ جملہ پسند آیا جو انہوں نے کل ایک نشست کی صدارت کرتے ہوئے ایک مقالہ نگار سے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہو، وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضرت آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے، لیکن انہوں نے اس کو بڑے لطیف انداز سے ادا کیا، ہم اس سے سبق لے سکتے ہیں، قلم پکڑیں تو آپ کو اول سے آخر تک علم کا احترام اور اس شخص کا احترام بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جس نے اپنا وقت صرف کیا، جس نے اپنی انکھیں خراب کیں جس نے اتنا مواد فراہم کیا۔

عربی زبان کی اہمیت

عربی زبان کی اہمیت بنیادی چیز ہے، اگر آپ کو علوم اسلامیہ پر کوئی بھی کام کرنا ہے تو یہ بڑے کلیفکشن کی بات ہوگی آپ عربی سے ناآشنا ہوں، قرآن، حدیث اور اسلامیات پر لکھنے والے بہت سے مشرقی اور مغربی فضلاء سے عربی نہ جاننے کی وجہ سے نادانستہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے جو بعض اوقات ان کے پورے علمی کارنامے پر پانی پھیر دیتی ہے۔

مجھے ایک دوست نے بتایا کہ دہلی میں کوئی سیمینار ہو رہا تھا' اس میں ایک صاحب جنہوں نے انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا' تقریر کر رہے تھے تو مشہور عرب ادیبہ اور مورخہ ''عائشہ بنت الشاطی'' نے جو اس سیمینار میں شریک تھیں' ان سے عربی میں خطاب کیا تو انہوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں عربی نہیں سمجھتا تو عائشہ نے کہا کہ قرآن مجید کا ترجمہ پھر آپ کیسے کرتے ہیں؟ اس کے بعد وطن جا کر انہوں نے مصر کے کثیر الاشاعت اخبار ''الاہرام'' میں اس پر کئی قسطوں میں مضمون لکھا کہ ''میں نے عجائبات عالم میں سے ایک عجیب چیز یہ دیکھی کہ ایک فاضل نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور وہ عربی سے ناواقف تھا۔''

آپ حضرات آسانی کے ساتھ اس پر قابو پا سکتے ہیں' اور عربی زبان میں وہ دسترس حاصل کر سکتے ہیں' جس سے آپ غلطیوں سے بچ سکیں' اس سلسلے میں عربی مدارس آپ سے بھرپور تعاون کریں گے۔

انتشار انگیزی سے احتراز کیجئے

بعض فضلاء اپنے نظریات وتحقیقات کے اظہار میں بہت عجلت سے کام لیتے ہیں' ان کی اشاعت ہو جاتی ہے' پھر وہ کچھ عرصہ بعد خود ہی ان سے رجوع کر لیتے ہیں' اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا اخلاقی فرض انجام دیتے ہیں' لیکن جو لوگ اس عرصہ میں ان نظریات وتحقیقات کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں ان کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یہ مسئلہ اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے' جب اس کا تعلق ایمانیات اور عقائد سے ہو' اس لئے ہمیں اپنی تحقیقات کی اشاعت و تبلیغ کے بارے میں (خاص طور پر جب ان کا تعلق عقائد اور دینیات سے ہو) عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لینا چاہیے' ان پر بار بار غور کرنا چاہیے' ان کو شک شبہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے ماہرین فن کے سامنے پیش کرنا چاہیے' اور ان کی رائے اور مشورہ کا انتظار کرنا چاہیے' پھر اس کے بعد اس کی اشاعت کی اجازت دینی چاہیے' یہ دور انتشار ہے' اس وقت طبیعتیں انتشار انگیزی کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں' انسان ہمیشہ سے سہولت پسند اور حیلہ جو واقع ہوا ہے' جدید تمدن نے' سائنسی ترقی کی رفتار نے اور معیار زندگی کی بلندی نے اس کو زیادہ سہولت پسند اور انتشار پسند بنا دیا ہے' اس لئے ہم ایسی بات کہنے سے احتراز کریں' جس سے لوگوں میں انتشار پیدا ہو۔

۱۹۶۷ء میں جب عربوں کو اسرائیل کے مقابلہ میں شکست فاش ہوئی تو میں نے اپنے ایک

انٹرویو میں کہا تھا کہ اس میں بہت بڑی ذمہ داری ان تشکیک پسند ادباء اور مصنفین پر ہے، جنہیں نے ہماری جدید عرب نسل کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ تمام قدیم اقدار کو انہوں نے متزلزل کر دیا۔

میں شکر گذار ہوں وائس چانسلر صاحب پرو وائس چانسلر صاحب پروفیسر حقی صاحب اور ان سب حضرات کا جو اس سمینار سے تعلق رکھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور بڑے اعتماد کا اظہار کیا، میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس سمینار میں کہا مخلصانہ کہا۔ خدا کرے کہ میں بھی اسے فائدہ اٹھاؤں اور آپ بھی اپنے جواہر اور کمالات میں اضافہ کریں۔

ملک وملت کی نوجوانوں سے توقعات

یہ تقریر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ نے مورخہ ۲۶ مئی ۱۹۸۴ھ کو پاکستان کی عظیم درسگاہ جامعہ کراچی میں اساتذہ وطلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمائی تھی اس باوقار جلسہ کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب فرمارہے تھے۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبا لله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد اعبده ورسوله الذی ارسله الله تعالی بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الی الله باذنه وسراجامنيرا

محترم وائس چانسلر صاحب، اساتذہ، عزیز طلباء اور معززین شہر!

میرے لئے بڑی مسرت اور عزت کی بات ہے کہ مجھے جامعہ کراچی کے اساتذہ اور طلباء اور شہر کے معززین سے خطاب کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ میری حقیر ذات کا جناب وائس چانسلر صاحب نے بڑی فراخ دلی اور کریم النفسی کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔اور میری حقیر علمی کوششوں کو سراہا ہے، جس سے خود ان کے مطالعہ کی وسعت اور تنوع کا اندازہ ہوا، لیکن میرے تعارف کا ایک گوشہ رہ گیا جس سے اس وقت کے حاضرین مجلس کو خاص طور پر دلچسپی ہونی چاہئے وہ یہ کہ میری شعوری اور علمی زندگی کا آغاز معلّمی سے ہوا، میرے درجوں کے عزیز طلباء کو کتنا فائدہ پہنچا۔ان کی کیا خدمت ہوئی؟ اس کے متعلق تو میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے خود بہت فائدہ پہنچا ذہن کی ترقی اور وسعت ،انسانی نفسیات کے سمجھنے اور زندگی کے مطالعہ کے سلسلہ میں مجھے اس سے بڑی مدد ملی میں نے سکھانے سے زیادہ سیکھا۔ مجھے اپنے طویل سفروں اور دوروں کی وجہ سے مختلف مجالس اور مختلف تقریبات میں بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے۔لیکن میرے لئے خوشگوارترین موقع وہ ہوتا ہے جہاں مجھے

نوجوان اور اپنے ہم مشغلہ اساتذہ سے خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے۔ آج اللہ نے ایسا ہی موقع مرحمت فرمایا ہے اور میں اس کے لئے جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گذار ہوں۔

حضرات! کسی ملک کی ترقی اور استحکام اور کسی معاشرہ کے تحفظ اور اس کے باعزت زندگی گذرانے کے بہت سے سرچشمے، بہت سی شرطیں اور بہت سی علامتیں ہیں۔ مثلاً کوئی ملک بڑی فوجی طاقت کا ملک ہے، کسی ملک کے پاس زندگی کے بڑے ذرائع ہیں، کسی کے پاس معدنی، حیوانی، زراعتی دولت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، کسی ملک میں جامعات کی بڑی کثرت ہے، کسی ملک کے تعلقات عظیم ترین سلطنتوں اور عظیم ترین ملکوں سے بڑے دوستانہ ہیں اور اس ملک کو ان پر بڑا اعتماد ہے، کسی ملک میں انسانی ذہانت کا بڑا ذخیرہ ہے، وہاں بہت انسانی توانائی پائی جاتی ہے، وہاں کے لوگ جسمانی طور پر بہت صحت مند ہیں۔ یہ سب چیزیں کسی ملک کی طاقت واستحکام اور کسی ملک کی عزت اور اسکے احترام کی علامتیں سمجھی جاتی ھیں میں انکا انکار نہیں کرتا لیکن اگر میرے سامنے کسی ملک کی بڑائی کسی ملک کے استحکام اور کسی معاشرہ کے باعزت زندگی گزارنے کا ذکر آئے اور کسی ملک کی تعریف کی جارہی ہو تو میں ایک سوال کروں گا، وہ یہ کہ ”مجھے یہ بتائیے کہ وہاں کے اسکولوں اور کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے طلباء تک نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کس درجہ کا احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے۔ ان میں ضبط نفس کی کتنی طاقت ہے، ان میں اپنے تاثرات کو حد اعتدال میں رکھنے کی کتنی صلاحیت ہے، ان میں کسی ملک کے صالح نظام اور جائز قوانین کے احترم کی کتنی عادت ہے، اور ان میں احساس شہریت (CIVIC SENSE) کتنا پایا جاتا ہے؟“ میں تاریخ کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے بھی (جس کی طرف وائس چانسلر صاحب نے متعدد اشارے کئے ہیں) اور تاریخ کے حدود سے نکل کر زندہ معاشروں میں چلنے پھرنے اور لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ایک انسان کی حیثیت سے بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ میں صرف کتابوں کے صفحات اور گزشتہ تاریخ پر اس کی بنیاد نہیں رکھتا۔ بلکہ اکبر الہ آبادی مرحوم کے اس شعر پر عمل کرتا ہوں۔

نقشوں کو تم نہ جانچو، لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

اعداد وشمار کے فن یعنی شماریات نے ہمارے اس زمانہ میں جو اہمیت اختیار کر لی ہے، اس کے

لئے جو بڑے عظیم ادارے قائم ہوئے ہیں، ان کے لئے جو انسانی توانائیاں صرف ہورہی ہیں انکی اہمیت کو کم کئے بغیر یہ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک کسی ملکی بقاء وارتقاء اور اس کی سالمیت اور اس کی عزت واحترام کے جانچنے کا معیار یہ نہیں ہے جو پختہ کار و پختہ سن نسل اس وقت موجود ہے، یا جس نے بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھا ہے وہ بہتر سے بہتر ہے، اس میں سے ہر شخص ہماری قدیم سوانح کی اصطلاح میں ولی ہے اور علمی اصطلاح میں فاضل اجل علامہ ہے اور دوسری اصطلاحوں میں ان کی جو تعریف کیجئے۔ یہ بالکل کافی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ نسل جلد ختم ہوجائے گی۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے لیکن الٰہی قانون اپنا کام کررہا ہے، اس میں نہ پیغمبروں کا استثناء اور نہ ولیوں کا استثناء ہے اور نہ عالموں کا استثناء ہے۔ "**ومامحمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل**" (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے ایک رسول ہیں۔ پہلے جتنے رسول آئے چلے گئے۔) یہ موت وحیات کا قانون سب پر حاوی ہے۔ یہ بات اطمینان کے لئے کافی نہیں کہ کسی ملک کی ادھیڑ یا بوڑھی نسل بڑی پاکباز ہے، بڑی زندہ دل ہے، بڑی صلاحیتوں کی مالک ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جس نسل کو اس نسل کی جگہ لینی ہے ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہے اور جس سے اس ملک کی قسمت وابستہ

ہے، جس سے اس ملک کا تاریخی تسلسل قائم رہے گا، وہ نسل کس درجہ کا اخلاقی معیار رکھتی ہے؟ کس درجہ اس کو اپنی طبیعتوں پر قابو اور کنٹرول ہے؟ کس درجہ اس کے اندر برائیوں سے بچنے کی طاقت ہے اور کس درجہ اس میں مخلصانہ ومردانہ جدوجہد پائی جاتی ہے؟

میرے نزدیک کسی ملک وقوم کی صلاحیت، عزت وطاقت کا یہ اصل معیار ہے، اگر کسی ملک کو سب کچھ حاصل ہے، لیکن اس ملک نوجوان اور خاص طور پر تعلیم یافتہ نسل صحیح اور ضروری نظام کا احترام کرنا نہیں جانتی، وہ ملک وملت کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتی ہے، اس میں اپنے ذاتی مفادات کو ملک کے وسیع تر مفادات کے لئے قربان کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ ملک اور قوم سخت خطرہ میں ہے۔ اس لئے کہ اس کی نئی نسل میں قابل تحفظ وقابل احترام روایت کے (جن سے اس کی اس میں عادت نہیں ہے، وہ بارود اور پیٹرول کی طرح ہے، جو فوراً آگ پکڑ لیتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ باہر سے یوپی کے مشہور شہر کانپور آرہا تھا۔ میرے کار کے سامنے ایک ٹینکر چل رہا تھا، بہت دور تک اس کا ساتھ رہا، ہماری کار سے آگے نہیں نکل سکتی تھی، اس

ٹینکر کی پشت پر لکھا ہوا تھا۔ (Highly Inflammable) اس لئے کہ اس میں پٹرول بھرا ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتا رہا۔ یہ بے بسی کی بات تھی کہ میری نظر بار بار اس پر پڑتی تھی۔ مجھے کانپور میں دانشوروں اور تعلیم یافتہ دوستوں سے خطاب کرنا تھا۔ میں نے اس سے یہ واقعہ بیان کیا چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے دانشوروں اور مصنفوں نے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ادب، فلسفہ اور عقلیات کا اتنا ہی حصہ قابل احترام نہیں ہے، جس میں بڑی بڑی علمی تحقیقات کی گئی ہوں بلکہ انسانی نفسیات اور ادبیات کا وہ حصہ بھی بڑا قیمتی ہے، جس میں چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالے گئے ہیں، میں نے اس مجمع سے (جس میں نوجوانوں کی تعداد خاصی تھی) کہا کہ (Highly Inflammable) پٹرول کی تعریف ہوسکتی ہے اور جلد آگ پکڑنے والے مادوں کی تعریف ہوسکتی ہے، لیکن ملت اسلامیہ کی یہ تعریف نہیں ہوسکتی، مگر مسلمانوں کے کسی طبقہ کی بھی حالت یہ ہو کہ کسی خلاف طبیعت چیز کو برداشت کرنا ان کے لئے ناممکن ہو اور وہ ہر مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنالیں تو یہ بات بڑی خطرناک ہے۔

یہ واقعہ قوموں اور ملتوں کی زندگی میں صدیوں میں کبھی کبھی آنا چاہئے جب کسی ملت کی اجتماعی توہین ہو، یا شعار اللہ اور اصول دین کا مذاق اڑایا جائے یا ذات نبوی (علیہ الف الف سلام) کی شان میں معاذ اللہ گستاخی ہو، یا کسی مسلمان کی عزت وآبرو خطرے میں پڑ جائے۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ خلیفہ معتصم اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ دربار میں بیٹھا ہوا ہے، بڑے بڑے فضلاء اور بڑے بڑے ارکان سلطنت موجود ہیں، ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ امیر المومنین! میں عموریہ سے آ رہا ہوں (عموریہ اسلامی سلطنت سے باہر بازنطینی سلطنت کا ایک شہر تھا، جو ابھی اسلامی قلمرو میں داخل نہیں ہوا تھا) وہاں ایک مسلمان خاتون پر کسی عیسائی نے دست درازی کی، اس خاتون کی زبان سے بے اختیار جملہ نکلا "وا معتصماه" "معتصم کی دہائی ہے! یہ سنتے ہی معتصم نے اس کے جواب میں کہا "لبیک" "(میں حاضر ہوں) معتصم اسی وقت وصیت نامہ لکھواتا ہے، اسی وقت اپنی ذاتی چیزوں کے متعلق ہدایت دیتا ہے مجلس سے اٹھتا ہے۔ خود لشکر اسلامی کی قیادت کرتا ہے اور حاکم عموریہ کی گوشمالی مسلمان خاتون کی دادرسی اور عموریہ کو سلطنت اسلام میں شامل کر کے واپس آتا ہے۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں اگر

صدیوں میں کبھی ایسا وقت آئے تو غیرت اسلامی کا فتویٰ اور فرمان ہے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

لیکن افراد کی زندگی میں اگر گروہوں میں ہر روز اور ہر گھڑی یہ وقت آئے اور وہ فوراً اشتعال میں آجائیں اور جاہلیت عرب کے اس شعر پر عمل کریں۔

لایسئلون اخاهم حین یند بهم
فی النائبات علی ماقال برهانا

شاعر ایک قبیلہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب کوئی آواز ان کے کان میں میں پڑتی ہے قبیلہ کے کسی فرد کی طرف سے، تو وہ دلیل نہیں پوچھتے اور وہ یہ پوچھتے کہ یہ مقدمہ جائز ہے صحیح ہے یا غلط اور جس فریق کی مدد کے لئے بلایا جارہا ہے وہ حق پر ہے یا باطل پر؟ وہ فوراً امداد کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں اور فریق ثانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں فرمایا: '' انصر اخاک ظالما او مظلوما '' (اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم) صحابۂ کرام کی اپنی ذہنی تربیت ہوئی تھی کہ ان کے ذہن سے غلط چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت جاتی رہی۔ ان کو ذات نبویؐ سے جو تعلق تھا، اس کی مثال ادبیات میں ملتی ہے، نہ نفسیات واخلاقیات کی تاریخ میں، نہ سیاسیات میں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ '' ماینطق عن الهوی ان هوالاوحی یوحی '' (آپ کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ وحی الٰہی ہے) لیکن خود آپؐ نے ان کی ایسی تربیت کی تھی کہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لئے ان کا ذہن تیار نہیں تھا جس میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف کوئی بات کہی گئی ہو۔ انہوں نے کہا '' یارسول اللہ ننصره مظلوما فکیف ننصره ظالماً؟ '' (یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہے تو ہم س کی مدد کریں، اگر ظالم ہو تو کیسے مدد کریں؟) انہوں نے سوچا آج ہم کیا سن رہے ہیں؟ ہماری قوت سماعت دھوکہ دے رہی ہے۔ یا ہم معنی نہیں سمجھے؟ آپؐ اس پر بالکل ناراض نہیں ہوئے آپ نے فرمایا! تم نے ٹھیک پوچھا، لیکن ظالم کی بھی مدد ہوتی ہے ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑلو، اس کو ظلم نہ کرنے دو،

اسلام کا اصول یہ ہے کہ مظلوم کی مدد اسے ظالم سے چھڑانا ہے، ظالم کی مدد مظلوم کی گردن سے اس کا ہاتھ ہٹانا ہے۔

قوموں اور ملکوں کے لئے جہاں بہت سی چیزیں ضروری اور زندگی کی شرطیں ہیں، وہاں یہ بھی ہے کہ ان کے نوجوانوں میں ضبط کا مادہ ہو، افسوس ہے کہ ہمارے ادب ہمارے افسانوں، شاعری (مجھے معاف کیا جائے) پھر ذرائع ابلاغ عامہ، سنسنی خیز صحافت اور خبروں کی گرم گرم سرخیوں اور مضامین نے جذبات میں جوش اور اشتعال کی ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ آدمی ادنیٰ درجہ کی خلاف طبع چیز کو برداشت نہیں کر سکتا۔

میں ابھی چند دن پہلے پٹنہ سے دربھنگہ جا رہا تھا، ایک بڑے اجلاس میں شرکت کے لئے۔ کار جب آگے چلی، تو وہاں کے کچھ سمجھدار لوگ کار کے سامنے آ گئے اور کہنے لگے، براہ کرم آپ اس راستہ سے نہ جایئے، میں نے کہا کیا بات ہے؟ جہاں پہنچنا تھا اس کو وہی راستہ تھا، انہوں نے کہا وہ ایک اسکول کا لڑکا ایک سرکاری بس کے سامنے آ گیا، اسے چوٹ آ گئی، اس وقت سے اس اسکول کے تمام لڑکے سرکاری بسوں کو جلا رہے ہیں۔ پرائیوٹ کاروں کو بھی نہیں چھوڑتے، کوئی امتیاز نہیں ہے۔ کوئی کار بھی اس سڑک سے گزرے گی اسے آگ لگا دیں گے، ہمارے ساتھیوں نے کہا کہ ہمارے منہ پر داڑھیاں ہیں، مولوی لوگ ہیں اور ظاہر ہے کہ ہم سرکاری لوگ نہیں ہیں، ہمیں کیا خطرہ؟ انہوں نے کہا کہ نہیں اس وقت بالکل سرسامی کیفیت ہے، کوئی نہیں دیکھتا کہ کون جا رہا ہے، ہر موٹر جلائی ہے ہم نے کہا بہت اچھا، ہمارے بہار کے ایک بڑے عالم تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں مولانا، اس میں بالکل اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم تقریب تین گھنٹے لیٹ ہو گئے اور پہلا اجلاس ہمیں نہیں ملا ہم دن رات دیکھتے ہیں۔ دو کاروں کی موٹر سائیکلوں کی ٹکر ہو جاتی ہے تو ایک ہنگامہ ہو جاتا ہے ایک فریق ادھر ہو جاتا ہے دوسرا فریق ادھر قانون کو فوراً ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے یہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی عادت جو (مجھے معاف کیا جائے) سیاسی تحریکوں نے پیدا کر دی ہے، یہ بھی ایک بڑا مرض ہے جو وباء کی طرح پھیل گیا ہے۔

کسی ملک کے باقی رہنے کی اور اپنے مقاصد اور اپنی صحیح منزل تک پہنچنے کی ضمانت اس وقت تک نہیں دی جا سکتی ہے جب تک کہ وہاں کے نوجوانوں میں قوت برداشت اور معاملہ کو سمجھنے کی

صلاحیت نہ ہو، کچھ چیز خود اپنی مرضی کے خلاف دیکھنے اور گوارا کر لینے کی صلاحیت نہ ہو۔ جن قوموں نے دنیا میں عظیم سلطنتیں قائم کی ہیں (اس سلسلہ میں عربوں کا نام لوں گا صحابہ کرام کا اور آخیر میں سلطنت عثمانیہ کا) ان میں یہ وصف نمایاں طریقہ پر موجود تھا۔ میں ترکی گیا تو میں نے دیکھا کہ ترک قوم میں ہماری مشرقی قوموں کے مقابلہ میں قوت برداشت کہیں زیادہ ہے کہیں میں نے شور ہوتے نہیں دیکھا، نظام کا احترام عام ہے مشتعل ہو کر دنگا فساد کرنے کا کوئی واقعہ کم سے کم میرے سامنے نہیں آیا، یہ بے صبری، جلد بازی، فوراً جوش اور غصہ میں آ جانا معاشرے کے مریض ہونے کی علامت ہے، اتفاق سے لندن میں مجھے ایک مرتبہ عمومی انتخاب (جنرل الیکشن) کے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ ہر پارٹی کا جو جلوس نکلتا ہے، وہ خاموشی کے ساتھ بینر لگائے ہوئے تھا، جس میں اس کا منشور لکھا ہوا تھا۔ نہ کوئی نعرہ، نہ آواز، میں نے کہا کہ ہم نے ہندوستان میں جتنے الیکشن دیکھے ہیں تقسیم سے پہلے بھی، تقسیم کے بعد بھی ان میں کوئی سو نہیں سکتا تھا۔ نماز پڑھنا بھی مشکل تھا۔ ایک پارٹی کا آفس ادھر قائم ہے، دوسری کا آفس اُدھر قائم ہے۔ اور آوازوں کی طاقت کا مقابلہ ہو رہا ہے کہ کون زیادہ زور سے کہہ سکتا ہے کس کی آواز بلند ہے میں نے کہا کہ یہ عجیب قسم کا الیکشن ہے میں پولینگ اسٹیشن گیا تو دیکھا کہ ایک صاحبزادی دروازہ پر کھڑی ہیں، انہوں نے ہمارے میزبان کو جو ووٹر تھے، تین پرچے دیئے۔ تو وہ تینوں پرچے لے کر اندر گئے، جہاں ووٹ ڈالے جاتے ہیں۔ انہوں نے ووٹ ڈالا اور آ کر دو پرچے واپس کر دیئے اور ایک پرچہ رکھ لیا، میں نے کہا یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا میں نے جس پارٹی کو ووٹ دیا ہے اس کا پرچہ میں نے رکھ لیا ہے اس لئے وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے کس کو ووٹ دیا ہے نہ میں نے کچھ پوچھا نہ اس نے کچھ کہا۔ صبح کو میں اٹھا ٹی وی سے نتائج آنے شروع ہو گئے۔ تو معلوم ہوا کہ الیکشن ختم ہو گیا۔ فلاں پارٹی جیت گئی، ہم نے انہی لوگوں سے انتخابی سیاست کا سبق سیکھا تھا لیکن شاگرد استاد سے بڑھ گیا، ہم نے ان سے سکون تحمل ضبط و نظم کا سبق نہیں سیکھا۔

میں اس وقت آپ حضرات کی توجہ ایک تاریخی حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس عظیم جامعہ میں اس مسئلہ پر کچھ ریسرچ کا کام ہو، میں نے جب برطانیہ کی تاریخ پڑھی تو معلوم ہوا کہ سترھویں صدی کے اختتام تک برطانیہ کی اخلاقی حالت بہت کمزور تھی

اور کوئی علامتیں برطانوی معاشرہ میں ایسی نہیں پائی جاتی تھیں کہ برطانیہ ایک دن ایک عظیم عالمگیر طاقت قرار پائے گا اور ہندوستان جیسی عظیم مملکت پر اس کا قبضہ ہوگا اور بڑی کامیابی اور خوبی کے ساتھ (خواہ ہندوستانی نقطہ نظر سے وہ استبداد اور ظلم قرار دیا جائے) وہ پورے ملک کو اپنے کنٹرل میں رکھے گا، آپ اگر اس وقت کی شاعری اس وقت کے افسانے اس وقت کا لٹریچر پڑھیں اور اس وقت کے اخبارات کے فائل مل جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سوسائٹی کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی کہ یہ سوسائٹی اتنا عظیم کردار ادا کرے گی اور ایشیاء میں سب سے بڑی طاقت بن جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ برطانوی حکومت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد جب یہ نظر آنے لگا کہ ہندوستان برطانیہ کی تحویل میں جانے والا ہے اور برطانیہ کے قدم اس ملک میں جم جائیں گے اچانک برطانوی سوسائٹی میں ایک تبدیلی ہوئی۔ اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوگیا کہ ہم ایک بہت بڑی شہنشاہیت کے مالک بننے والے ہیں، ہمیں رکیک اور اور پست حرکتوں سے، اپنے ملک سے بے وفائی کرنے سے، اپنی سلطنت کا نام بدنام کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ اچانک یہ انقلاب رونما ہوا، میں چونکہ برطانوی تاریخ کا طالبعلم نہیں ہوں، اس لئے پورے وثوق سے اس انقلاب کے سرچشمہ اور اس تبدیلی کے پیدا کرنے والے آدمیوں تعلیم وتربیت کا کام کرنے والوں اور ذرائع کا تعین نہیں کرسکتا، جو میدان میں آئے اور جنھوں نے برطانوی قوم میں ایک نئی روح پیدا کردی۔ میرے خیال میں چاہے اس کی کوئی دستاویز نہ ملے مگر اس میں ضرور اس احساس کو دخل تھا کہ خدا نے ہم کو اتنا بڑا ملک دے دیا ہے، اس لئے اب ہمیں اپنے کو اس کا اہل ثابت کرنا چاہئے۔ اس انگریزی دور میں، انگریزوں میں ایسا وقار، ایسی تمکنت اور ایسا رعب پیدا ہوگیا، جو آج خود انگلستان میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ شہر کے کسی آدمی کو ہمت نہیں تھی کہ قانون کے حدود سے تجاوز کرے۔ اسٹیشنوں پر دیکھتے تھے کہ ہر کام وقت پر ہورہا ہے۔ ہر شخص مستعد اور چست ہے، اسکولوں اور کالجوں کا تو کہنا ہی کیا۔ میں اتفاق سے لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم بھی رہا ہوں۔ یہ ۲۷ھ، ۲۹ھ کا زمانہ تھا، یونیورسٹی میں (اس زمانہ میں وائس چانسلر عام طور پر انگریز ہوا کرتے تھے) ایک عجیب نظم وضبط نظر آتا تھا۔ نہ کہیں شور سنائی دیتا تھا نہ نعرہ بازی ومظاہرہ دیکھنے میں آیا۔

یہ بات اس سے زیادہ وسیع اور عمیق دائرہ میں عربوں کو پیش آئی کہ صحرا نشین جب جب صحرا سے نکلے اور اور دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں رومۃ الکبریٰ اور سلطنت سلسلانیہ کے وارث ہوئے۔ تو اچانک ان کا ذہن بلند ہو گیا اور جیسا کہ آپ کے پاکستان کے شاعر اور اسلام کے شاعر مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کہا ہے۔

بات کیا تھی کہ نہ روما سے نہ ایراں سے دبے
چندے بے تربیت اونٹوں کے چرانے والے
جن کو کافور پہ ہوتا تھا نمک کا دھوکہ
بن گئے خاک کو اکسیر بنانے والے

عربوں کا ذہن ایک دم بلند ہو گیا کہ اب وہ عرب بسوس، داحس وغبرا کا زمانہ نہیں رہا کہ ایک گھوڑے کے آگے بڑھ جانے پر ایک گھوڑے کے پیچھے رہ جانے پر، پہلے پانی، بعد میں پانی پینے پر، لڑائی کا سلسلہ چالیس چالیس برس تک جاری رہتا۔ بات کیا تھی آغاز کہاں سے ہوا؟ ایک قبیلہ کے سردار کا گھوڑا پیچھے رہ گیا، ایک کا آگے بڑھ گیا، بس اس نے اپنی توہین سمجھی اور سیکڑوں آدمیوں کی جانیں چلی گئیں۔ انہیں عربوں کو آپ دیکھیں گے کہ سلطنت پانے کے بعد یعنی جب مسلم ایمپائر قائم ہوا تو اسکی حالت بالکل دوسری تھی، وہ نہایت متحمل، نہایت اصول پسند، نہایت وسیع النظر اور وسیع القلب بن گئے۔ یہی ہمارے آزاد ہونے والے ممالک میں ہونا چاہئے تھا، مصر میں، شام میں، عراق میں، الجزائر میں، اور مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ پاکستان میں۔ ایک دم سے ذہن بدل جانا چاہئے تھا اور احساس ذمہ داری، احساس فرض اور احترام قانون کی کارفرمائی ہونی چاہئے تھی۔

الف لیلہ کا قصہ ہے کہ کسی شخص نے بغداد کے کسی معزز آدمی کے یہاں اشرفیوں کی ہانڈی امانت رکھی اور کہا کہ میں جہاد پر جا رہا ہوں، معلوم نہیں شہید ہو جاؤں یا زندہ بچ کر آؤں۔ اگر آپ میری شہادت کی خبر سنیں تو فلاں خاندان کے حوالہ کر دیجئے گا۔ ہانڈی رکھ دی گئی، لیکن شہادت ان کے مقدر میں نہ تھی، وہاں سے صحیح سلامت واپس ہوئے تو ان صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ ''آپ کو یاد ہوگا کہ فلاں موقع پر میں آیا تھا اور میں نے آپ کے پاس ایک ہانڈی امانت رکھی تھی، اس میں اشرفیاں تھیں، اب میں لینے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کون

ہیں؟۔ میں پہنچانتا نہیں، کچھ اور یاد لائیے، میرے یہاں تو ایسی کوئی چیز نہیں رکھی جاتیں، دیکھیئے کہیں رکھی ہوتو اٹھا لیجئے۔'' وہ بے چارے منہ دیکھتے رہ گئے کوئی تحریر ان کے پاس تھی نہیں، انہوں نے بہت یاددلانے کی کوشش کی، کہا شہر میں آپ کی بڑی حیثیت ہے، آپ امانت حوالہ کردیجئے انہوں نے تجاہل عارفانہ برتا، وہ اپنا سامنہ لیکر چلے گئے۔

وہ قاضی صاحب کے پاس گئے، قاضی صاحب بہت ذہین اور نفسیات سے واقف تھے۔ انہوں نے کہا ''تم خاموش رہو، میں ایک ترکیب کرتا ہوں، انہوں نے دو چار آدمیوں سے ذکر کیا کہ فلاں صاحب کو فلاں عہدہ ملنے والا ہے ان کو فلاں جگہ کا صوبہ دار بنایا جانے والا ہے، یا ان کو وزارت ملنے والی ہے، وہ چاہتے تھے کہ اس کا چرچا ہو، ایسی کوئی بات راز نہیں رہتی، رفتہ رفتہ صاحب معاملہ نے بھی سن لیا کہ مجھے فلاں عہدہ ملنے والا ہے یہ مرحلہ طے ہوگیا تو قاضی صاحب نے ان صاحب کو بلایا اور کہا کہ اب جا کر تم ان سے تقاضا کرو۔ یاددلاؤ، ذرا تہذیب سے کہنا کہ شاید اب آپ کو یاد آگیا ہو، وہ صاحب گئے جیسے ہی صاحب خانہ نے ان کو دور سے دیکھا کہا آئیے آئیے، اوہو اتنے دن کہاں رہے؟ آپ نے تو مجھے پتہ بھی نہیں بتایا میں آپ کو بلاتا۔ مجھے یاد آگیا، وہ فلاں قسم کی فلاں رنگ کی ہانڈی تھی نا؟ وہ وہاں رکھی ہوئی ہے آپ لے لیجئے۔ وہ گئے جوں کی توں ہانڈی ان کو مل گئی۔ انہوں نے قاضی صاحب سے پوچھا، بات کیا ہوئی ان دونوں میں جوڑ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ آدمی کو جب کوئی بڑی چیز مل جاتی ہے تو چھوٹی چیز اس کی نظر سے گر جاتی ہے جب ان کو معلوم ہوا کہ مجھے اتنا بڑا عہدہ ملنے والا ہے (جاہ مال سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے) تو انہوں نے کہا کہ کہاں کی ہانڈی کہاں کی اشرفیاں؟ اس میں میری بدنامی ہوگی ہوسکتا ہے کہ اس سے اس میں رکاوٹ پڑ جائے، کوئی صاحب خلیفہ سے جا کر کہہ دیں کہ امیر المومنین! آپ کس کو وزیر بنارہے ہیں، کس کو آپ صوبہ دار بنارہے ہیں؟ وہ تو خائین ہے! چور ہے! میری ہانڈی اس نے ہضم کرلی، تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ہانڈی ان کے حوالہ کردی جائے۔

دوستو اور عزیزو! آپ کو اللہ نے اتنی بڑی مملکت عطا کی ہے اتنا بڑا اعزاز بخشتا ہے، خدمت و عزت کے ایسے زریں اور نایاب مواقع دیئے ہیں۔ آپ کو اب اسی پستی یہ گراوٹ، اشتعال پذیری، خودغرضی تنگ نظری، تنگ دلی، قانونی شکنی، ایذاءرسانی سے بلند ہونا چاہئے جس کو اللہ

اتنا بڑا موقع دے، اتنا عظیم ملک اس کی تحویل میں آ جائے ، وہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں پڑے؟ اللہ نے آپ کو انسانیت کی خدمت کا ، اسلام کی ترقی اور نام اونچا کرنے کا موقع دیا اور آپ اتنے چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر مشتعل ہو جاتے ہیں؟ لکھنؤ کے محاورہ میں '' کچھ آؤ تاؤ نہیں دیکھتے'' آپ کیلئے اقبال کا یہ شعر ہے۔

تو ہما کا ہے شکاری ، ابھی ابتداء ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ و ماہی

آپ مرغ و ماہی کے شکاری نہیں ہیں، آپ ہما کے شکاری ہیں۔ آپ بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے مسئلوں کے حل کرنے کی کوشش کیجئے، ان کو حل کرنیکی صلاحیت پیدا کیجئے۔ آپ کا کام روزمرہ کے شہری معاملات میں الجھنا اور ان میں اپنی طاقت ضائع کرنا نہیں ہے، ذرا سی کوئی بات آپ کی مرضی اور معیار کے مطابق نہیں ہوئی کہ آپ بالکل آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، یہ مسلم نوجوانوں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے شایان شان نہیں۔

میں جناب وائس چانسلر صاحب اور یونیورسٹی کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور اپنے عزیز نوجوانوں کو خطاب کرنے کا موقع دیا، اس اعتماد اور حسن ظن کیلئے آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے اس گرم (اور گرم میں ہر لحاظ سے کہتا ہوں) موسم میں میری ٹھنڈی باتیں، ٹھنڈے دل اور سکون دماغ کے ساتھ سنیں۔

والسلام علیکم!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اٹھو! کہ اب گردش جہاں کا انداز اور ہے

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (ہندوستان) کے جمعیۃ الاصلاح کے افتتاحی جلسہ میں حضرت مولانا کی ایک یادگار اہم اور پر مغز تقریر۔

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

عزیزو! دار العلوم کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے طالب علم جس وقت فارغ ہو کر نکلے تو وہ باہر کی دنیا کے لئے اجنبی نہ ثابت ہو۔

ایسا نہ ہو کہ یہ مدت جو دار العلوم کے اندر گزاری ہے، وہ ان کی باہر کی دنیا سے بالکل علیحدہ ہو بلکہ یہاں رہتے ہوئے بھی باہر کے جھونکے اندر آتے رہیں، وہ روزن اور کھڑکیاں کھلی رہیں جن سے ہم باہر کی دنیا دیکھ سکیں۔

''الاصلاح'' کا قیام ایک جرأت مندانہ اقدام تھا:

جس وقت دار العلوم قائم ہوا اس وقت ہمارے قدیم عربی مدارس میں تدریس کے لئے ایک خاص طرح کی زبان مستعمل تھی، اور اظہار خیال کے لئے بھی ایک مخصوص اسلوب اور طرز تحریر رائج تھا، یہ قدیم نصاب تعلیم کا قدرتی نتیجہ تھا، اس کے الفاظ اور اس کی تعبیرات، اس کے محاورے اور اظہار خیال کے طریقے تمام اس طرز تعلیم سے متاثر تھے، جو اس زمانے میں رائج تھا، اس زمانے کے مدارس میں اخبارات و رسائل پڑھنے کا بھی کچھ زیادہ رواج نہیں تھا، بلکہ شاید اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کسی درجہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا، جو لوگ اخبار و رسائل پڑھتے تھے وہ مطعون کئے جاتے تھے، اور ان کی انگشت نمائی ہوتی تھی کہ یہ تعلیم کا حرج کر کے اخبار و رسائل دیکھتے ہیں۔ اس وقت دار العلوم میں طلباء کی ایک ایسی انجمن قائم کرنا جس کا ایک دار المطالعہ ہو، اور دار الاخبار بھی، جس میں ہفتہ وار خطابت کے جلسے ہوتے ہوں اور اس کا نظم و نسق سب طلبہ کے ہاتھ میں ہو، ایک بڑا حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ اقدام تھا، آج تو یہ

چیز ہماری زندگی میں ایسی گھل مل گئی ہے، اور ایک ایسے سکہ رائج الوقت کی طرح ہوگئی ہے، جس میں کسی قسم کی کوئی ندرت یا جدت نظر نہیں آتی، لیکن آج سے ستر برس پہلے اس گزشتہ صدی کے بالکل آخر میں جب دارالعلوم قائم ہوا اور ہمارے ابنائے دارالعلوم نے جن کا نام اکثر کتابوں میں مل سکتا ہے، انجمن ''الاصلاح'' قائم کی، اس وقت اس اقدام کی بڑی اہمیت تھی، اور اس میں بڑی جدت تھی، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے وہ زمانہ دیکھا ہو، اس زمانہ کے لحاظ سے یہ ایک بڑا مفید قدم تھا، اور کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں انجمن الاصلاح نے بڑا مفید کام انجام دیا اور اس کے بعد سے لے کر اس وقت تک مفید کام انجام دیتی رہی اور اس میں بہت سے ایسے لوگوں کی تربیت ہوئی جنھوں نے یہاں سے نکل کر اپنی اس مشق اور مہارت سے بہت فائدہ اٹھایا، اس لحاظ سے دارالعلوم کے ان فرزندوں اور ''الاصلاح'' کے بانیوں کو جتنی بھی داد دی جائے، اور ان کی خدمات کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔

آج زمانہ بہت بدل چکا ہے:

لیکن میرے عزیزو! زمانہ میں ہر چیز کی قدر و قیمت اس زمانے کی ضروریات اور اس زمانے کے معیار کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ جس زمانہ میں یہ قدم اٹھایا گیا تھا، اس زمانہ میں یہ علماء کی روشن خیالی کا ایک بہت بڑا ثبوت تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ادارہ کو اس میں اولیت حاصل ہے۔ لیکن اس کے بعد سے زمانہ کا بڑا سرگرم سفر رہا ہے، وہ ایک منٹ کے لئے جامد و ساکت نہیں ہوا، اس نے کسی منزل پر قیام نہیں کیا، خیالات بدلتے رہے، ضروریات بدلتی رہیں، تقاضے بدلتے رہے، نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہے، نئے نئے میدان اور نئے نئے چیلنج سامنے آتے رہے اور علماء سے اپنے جوابات مانگتے رہے، اب اس زمانہ میں اخبارات و رسائل کا مطالعہ یا کسی بزم کا قیام ایک ایسی عام چیز ہوگئی ہے کہ اس سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا مدرسہ بھی اس وقت مشکل سے خالی ہوگا، گاؤں گاؤں قصبے قصبے ایسی انجمنیں قائم ہیں جہاں تقریروں کی مشق کرائی جاتی ہے، لوگوں نے خاندان، برادری کی سطح پر بہت سی انجمنیں قائم کر رکھی ہیں، اور عربی مدارس میں بھی عام طور پر ایسی انجمنیں جمعتیں پائی جاتی ہیں، بعض مدارس میں تو میرے خیال میں کئی درجن انجمنیں ہوں گی، یہاں تک کہ ضلع وار بھی انجمنیں قائم ہیں، اب زمانہ ان چیزوں سے بہت آگے بڑھ گیا ہے، اب سلجھی ہوئی تقریر کرنا، یا ان اخبارات و

رسائل کا پڑھ لینا، اور اس بات سے واقف ہونا کہ کہاں کہاں سے یہ اخبارات و رسائل نکلتے ہیں، اور ان میں کیا لکھا جاتا ہے، یا ایک شستہ تقریر کر لینا، ایک رواں مضمون لکھ دینا، اپنے خیالات کو شائستہ انداز میں ادا کر لینا کافی نہیں رہا، اس میں کسی قسم کا امتیاز باقی نہیں رہا، اب یہ چیزیں دور ماضی کی ایک یادگار ہیں، اور اس توقع پر قائم ہیں، اور انکو قائم رکھا جاتا ہے، اور ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ شاید ان میں وسعت پیدا ہو اور یہ زمانہ کے نئے تقاضوں کی تکمیل کر سکیں، ورنہ جہاں تک کسی بزم خطابت کا تعلق ہے، کسی دارالاخبار کا تعلق ہے، ان میں کوئی جدت اور کوئی فوقیت باقی نہیں رہی۔

متوسط درجہ کی لیاقت کافی نہیں:

ایک زمانہ تھا جب علماء کا شستہ اردو لکھ لینا اور اس زمانہ کے محاورہ اور اسلوب کے مطابق تصنیف و تالیف کر لینا بڑی قابل تعریف بات سمجھی جاتی تھی، بہت سے علماء اپنے خیالات کے ادا کرنے پر پوری قدرت نہیں رکھتے تھے، اور نئے خیالات کے لئے قدیم زبان ہی استعمال کرتے تھے، لیکن یہ چیزیں اب بہت عام ہوگئی ہیں، ندوۃ العلماء کا قیام جس زمانہ میں ہوا اس زمانہ میں کسی ندوی فاضل کا کسی تاریخ موضوع پر کچھ لکھ دینا یا اس میں قدیم ماخذ میں سے تمام ضروری اور متعلق مواد جمع کرنا اور سلیقہ کے ساتھ اس کو ترتیب دینا ایک بڑا علمی کارنامہ سمجھا جاتا تھا، اس وقت کسی فاضل کے لئے یہ بات بس تھی کہ اس نے مسلمانوں کی تہذیب کے کسی پہلو، مسلمانوں کے کسی علمی کارنامے، مسلمانوں کی کسی تہذیبی و تمدنی خدمت یا کسی دور حکومت یا کسی مسلمان حکمران خاندان پر ایک ایسی متوسط درجہ کی کتاب لکھ دی جس میں اگر چہ کوئی ریسرچ یا کوئی خاص قسم کا نظریہ ثابت نہ کیا گیا ہو، تاہم سلیقہ کے ساتھ اس کا مواد جمع کر دیا گیا ہو، یا پڑھنے والوں کو اس سے وحشت نہ ہوتی ہو، یہ بات کسی قدیم درسگاہ کے افتخار کے لئے اس وقت بہت کافی تھی۔

لیکن میرے عزیزو! اب حالات بہت مختلف ہو چکے ہیں، اگر ہماری انجمن کا مقصد یہی ہے کہ متوسط درجے کے خطیب اور مقرر پیدا کرے، ہمارے طلباء اخبارات و رسائل سے ناواقف نہ رہیں، اور ان کو یہ معلوم ہو کہ اس زمانے میں کیا رجحانات کام کر رہے ہیں، اس زمانے میں کون ادیب اور کون مصنف ہے، اور کون کون صاحب طرز اہل قلم، تو یہ بات بالکل

نا کافی ہے۔

زمانہ کا دامن سمٹتا اور پھیلتا رہتا ہے:

زمانہ اب اس سے بہت زیادہ کا طالب ہے، زمانہ کا دامن سمٹتا اور پھیلتا ہے، زمانہ کی جھولی اور اس کا کشکول گدائی ایک ناپ کا نہیں رہتا، وہ حالات کے مطابق لوگوں کی استعداد کے مطابق نئے سیاسی تغیرات اور تبدیلیوں کے مطابق ہر دور میں ہر جماعت سے اپنے زمانہ اور پیمانہ کے مطابق رہنمائی اور رہبری کا طالب ہوا کرتا ہے، اب یہ زمانہ اس بات کا بالکل متحمل نہیں ہے، اور محض اس پر دینی درسگاہ کے طالب علم کو کسی قسم کا کوئی تصدیق نامہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے کہ اس میں کچھ اچھے بولنے والے پیدا ہو جائیں، کچھ متوسط درجے کے لکھنے والے پیدا ہو جائیں۔

آج پہلے سے کہیں زیادہ تیاری کی ضرورت ہے:

اس وقت جو ایک عام ذہنی انتشار اور ایک قسم کی مایوسی ملت پر پھیل رہی ہے، اور ملت کی صلاحیت کی طرف اور دین میں جو صلاحیت ودیعت کی گئی ہے، اس صلاحیت کی طرف سے یا دین کے مستقبل کی طرف سے جو بدگمانی اور بے اعتمادی پیدا ہو رہی ہے، نوجوانوں میں جدید تعلیم یافتہ طبقوں اور حاملین دین میں جو بے اعتمادی پھیل رہی ہے اس کو دور کرنے کے لئے بہت زیادہ تیاریوں کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ علمی فتوحات حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ بلند پروازیوں کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ کاوشوں، دلسوزیوں اور دماغ سوزیوں کی ضرورت ہے، جو ہمارے اسلاف نے کیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ندوۃ العلماء کے صف اول کے مصنفین اور اہل قلم نے اس زمانے کی نسلوں کو بہت کچھ دیا، انہوں نے اس زمانے کی نسل کو بڑی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کی، جو مسائل اس عہد میں اہمیت رکھتے تھے، ان مسائل پر انہوں نے جو چیزیں پیش کیں، وہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت طاقتور اور دل نشین تھیں، لیکن اگر آج ان چیزوں کو دہرایا جائے یا بالکل ان کی نقل کی جائے تو اس میں کوئی علمی استدلال نہیں ہوگا، اور لوگوں کو بڑی مایوسی ہوگی۔

تحقیق و مطالعہ کا میدان بہت وسیع ہے:

تحقیق اور مطالعہ کا میدان بہت وسیع ہو چکا ہے، قدیم ذخیرے بلکہ قدیم دفینے جو پہلے

علماء کے خواب وخیال میں بھی نہیں آتے تھے، اب عام ہو چکے ہیں، نشر واشاعت کے اداروں نے اور طباعت واشاعت کی تحریک نے زمین کے جگر چاک کر دیئے ہیں اور سمندروں کے اندر سے موتی نکالے ہیں، وہ چیزیں جن کا ہم صرف نام سنتے تھے، وہ آج بازاروں میں مل رہی ہیں، سوچنے کے طریقے اور مطمئن کرنے کی صلاحیت اتنی مختلف ہوگئی ہے کہ ان میں قدیم طرز کی بالکل تقلید نہیں کی جاسکتی۔

بہت سے قدیم مباحث آج اپنی اہمیت کھو چکے ہیں:

ایک زمانہ تھا کہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الجزیۃ فی الاسلام'' معرکۃ الآرا کتاب سمجھی جاتی تھی ''اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر'' گویا علمی فتح تھی، اسی طریقے سے ان کا ''کتب خانہ اسکندریہ'' بڑی محققانہ کتاب یا یوں سمجھئے کہ اسلام کی طرف سے ایک حجت تھی، لیکن آج یہ مباحث اپنی اہمیت اتنی کھو چکے ہیں کہ اگر ان مباحث پر لکھا جائے تو اس میں لوگوں کے لئے کوئی نئی بات اور دلچسپی نہ ہوگی، اس زمانے میں اس سے بہت زیادہ وسیع علم اور اس سے بہت زیادہ محنت وکاوش کی ضرورت ہے۔

زمانہ آسانی کے ساتھ کسی کو تسلیم نہیں کرتا:

یہ علمی معیار بھی ہمارے لئے یقیناً قابل احترام ہے، اس کے ساتھ بہت عزیز یادیں اور یادگاریں وابستہ ہیں، یہ ہماری تاریخ کا ایک جز ہے، لیکن زمانہ بڑا بے رحم ہے اور بڑا بے مروت واقع ہوا ہے، وہ بڑی سے بڑی مقدس جماعت کے ساتھ بھی مروت نہیں کرتا، وہ کسی کے سامنے آسانی کے ساتھ سر تسلیم خم نہیں کرتا، زمانہ کی فطرت ہے کہ جب تک اس کو اعتراف پر مجبور نہ کر دیا جائے وہ کسی کا اعتراف نہیں کرتا، کسی چیز کا تسلسل زمانہ کے لئے بالکل کافی نہیں ہے، زمانہ ایسا حقیقت پسند، ایسا بے مروت، اتنا غیر جانبدار ہے کہ جب تک اس کے ہاتھ کوئی نئی چیز نہ دی جائے اور اس کی گردن کو کسی بوجھ سے ایسا بوجھل نہ کر دیا جائے کہ وہ جھکنے پر مجبور ہو جائے، اس وقت تک وہ جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، زمانہ سے کسی قسم کا اقرار کرا لینا، کسی قسم کی سند حاصل کرنا، کوئی تمغہ امتیاز یا خراج عقیدت حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے اور محض روایت پرستی اس کے لئے کافی نہیں ہے، زمانہ کو اعتراف پر مجبور کرنے کے لئے، اپنی فوقیت کا

نقش قائم کرنے کے لئے، اپنے ادارے کا احترام دلوں اور دماغوں میں پیدا کرنے کے لئے، اپنے لئے مناسب اور شایان شان مقام حاصل کرنے کے لئے آپ کو بڑی جدوجہد کرنا پڑے گی، آپ کو اپنا معیار بلند کرنا پڑے گا، اس زمانہ میں اگرچہ علم نے بڑی ترقی کی ہے، اور اس میں بہت سے نئے میدان پیدا ہو گئے ہیں، اور اس کی اہمیت و وسعت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ علمی زندگی کی مشکلات کچھ ایسی ہیں، زمانے نے ایسی نئی کروٹ لی ہے اور ایسے انقلابات ملک میں پیش آ چکے ہیں کہ اب محض علم کی وسعت، تحریر کی شگفتگی، خیالات کی بلندی اور نظریات کی جدت کافی نہیں ہے، اب اس کے ساتھ بلند کرداری اور دردمند و پرسوز دل کی بھی ضرورت ہے۔

آپ شاید میرے الفاظ کو بے محل سمجھیں گے اور کہیں گے کہ یہ زمانہ یا حقیقت کی ترجمانی نہیں ہے، اس لئے کہ زمانہ ان تمام قدروں سے باغی ہوتا چلا جا رہا ہے، جو ہم کو عزیز تھیں، جن کو مذہب نے پیش کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ آپ دیکھیں گے کہ بجائے اس کے کہ شخصیت سے، عمل سے، کردار سے، زمان کی مرعوبیت ختم ہو، بڑھتی چلی جا رہی ہے، ہر انقلاب کے پیچھے آپ کو کوئی ایسی شخصیت نظر آئے گی جس نے رفقاء کی بڑی تعداد کو متاثر کیا، ان کے افکار و خیالات پر اثر ڈالا اور ایک نئی ذہنی رو پیدا کی، اور اس کی وجہ سے واقعات اور تغیرات کا ایک نیا دھارا نمودار ہوا۔

یقین کی طاقت:

ہر انقلاب کے سرے پر جہاں سے اس انقلاب کا چشمہ پھوٹتا ہے، جہاں سے انقلاب کا سیل رواں آگے بڑھتا ہے، آپ کو ایسی شخصیت نظر آئے گی، جس کے اندر کسی چیز کا یقین و دل و دماغ کی تہہ میں پیوست ہے، اور تمام اعصاب پر پوری طرح حاوی ہے، جس کے اندر ایک ایسی مقناطیسی برقی قوت موجود ہے جو سینکڑوں اور ہزاروں کو متاثر کرتی ہے، محض خطابت سے، دو چار اچھی تصنیفات سے، قلم کی روانی سے، خیالات کے سلجھاؤ سے، کسی نادر علمی تحقیق سے، محض کسی نئے طرز میں کسی پرانے خیال کو یا نئے جام میں کسی شراب کہن کو پیش کرنے سے زمانہ میں کوئی نیا انقلاب اور انقلاب تو بڑی چیز ہے، کوئی عمومی تبدیلی بھی پیدا نہیں ہو سکتی، اس زمانے میں ضرورت ہے کردار کی، قلب کی دردمندی اور اندرونی سوز کی، ایک ایسی حرارت کی جو اندر

اندر جلا رہی ہو، اعصاب کو پگھلا رہی ہو اور پھر یہ لاوا پھوٹ کر کوہ آتش فشاں کی طرح بڑھ رہا ہو، اور اس کی تپش سینکڑوں اور ہزاروں دلوں کو گرما رہی ہو۔

جہاں تک میرا مطالعہ ہے، کم از کم اسلامی تاریخ کے حدود میں شاید کوئی انقلاب خالص خطابت اور طاقت لسانی سے پیدا نہیں ہوا، اس زمانے کا بہت بڑا مسئلہ جس کی طرف آپ کو اجمالی طور پر متوجہ کرتا ہوں بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جس کو علامہ اقبال نے چھیڑا تھا۔

انہوں نے کہا کہ زمانہ کا مجدد کہلانے کا مستحق وہ ہوگا جو اسلامی شریعت کی برتری ثابت کرے اور زندگی سے اس کا پیوند لگائے، اور یہ ثابت کرے کہ اسلامی قانون وضع قانون اور انسانوں کے تمام خود ساختہ قوانین سے آگے ہے، وہ زمانے کے آگے کی چیز ہے، وہ زمانہ اس سے آگے بڑھ نہیں سکا اور دنیا نے خواہ کتنی ہی ترقی کی ہو، لیکن اسلامی قوانین اس کی رہنمائی کی اب بھی صلاحیت رکھتے ہیں، اس کے تمام سوالات کے جوابات دیتے ہیں اور انسانی زندگی کے پیدا ہونے والے مسائل کا ان کے اندر حل ہے، ان میں ایک بالغ معاشرے کی تنظیم کی بہترین صلاحیت ہے، انہوں نے اس سوال کو اٹھایا تھا اور ان کی بڑی تمنا تھی کہ وہ اس کا جواب دیں وہ اس سلسلہ میں ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی سے بڑی مدد کے طالب تھے جیسا کہ انہوں نے اپنے خط میں لکھا ہے، علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے جو علامہ شبلی کے صحیح جانشین ہیں، آج بھی یہ سوال اسی طریقے سے زندہ ہے، اور جواب چاہتا ہے، اسلامی قانون کی برتری ثابت کرنے کے لئے علماء کو میدان میں آنا چاہئے۔

سب سے بڑا معرکہ افکار:

اسی طریقے سے اس وقت جو سب سے بڑا فیصلہ کن معرکہ عالم اسلام میں درپیش ہے، اور جس میں بہت سے ممالک آزمائش کے دور سے گزر کر اس غلط منزل پر جا پہنچے ہیں، جس کے تصور سے بھی ہمارے اسلاف کی نیند حرام ہوتی ہوگی، اور بہت سے ممالک اب اس منزل کی طرف بہت تیزی سے گامزن ہیں وہ ہے ''اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کا مسئلہ'' اس وقت، اس طبقے کے درمیان جس کے ہاتھ میں زمام حکومت ہے اور سواد اعظم اور عامۃ المسلمین کے درمیان یک بہت بڑی ذہنی کشمکش برپا ہے۔ اس وقت جس طبقے کے ہاتھ میں زمام کار آئی ہے، وہ مغربی

تہذیب کو مثالی اور انسانی تجربات کی آخری منزل اور حرف آخر سمجھتا ہے، وہ اس کی زندگی کی تنظیم کی آخری کوشش سمجھتا ہے، اور انسانی مسائل کے حل کا آخری کامیاب تجربہ سمجھتا ہے، اور اس کو اسلام کے نظام کا قائم مقام خیال کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اسلام کا نظام اپنی ساری افادیت کھو چکا ہے، اب اس کو دوبارہ اس کارگاہ میں لانے کی زحمت دینا صحیح نہیں ہے، یہ ہے وہ زندہ سوال جو اس وقت ایک شعلہ کی طرح ایک بھڑکی ہوئی آگ کی طرح تمام اسلامی ممالک میں پھیل چکا ہے. اور جس کے اثر سے کوئی طبقہ اور کوئی پڑھا لکھا انسان پورے طور پر محفوظ نہیں ہے۔

آج کا تجدیدی کام:

اس وقت سب سے بڑا تجدیدی کارنامہ اور میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سب سے بڑا مقصد گویا اس کا وجہ جواز، اس کی افادیت کا سب سے بڑا ثبوت اور اس کے اسلاف کی کوششوں کا سب سے بڑا پھل نیز ان کی محنتوں کا اور ان کی قربانیوں کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ ندوہ کے فضلاء اسلامی ممالک میں یا غیر اسلامی ممالک میں جہاں بھی ہوں، اس کا ایسا جواب دینے کی کوشش کریں جو لوگوں کو مطمئن کر سکے، اور مغربی فلسفہ کا وہ اثر کم کر سکے جو اس وقت پورے عالم اسلام پر اپنا سایہ ڈال چکا ہے۔ آج ان ملکوں میں اسلام کی اور مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا ہے، اور تمام اسلامی ملک کم و بیش اس مسئلہ سے دوچار ہیں۔

یہ چیلنج قبول کیجئے:

یہ وہ چیلنج ہے جسے آپ کو قبول کرنا ہے، اسی کے معیار کے مطابق اپنے آپ کو تیار کرنا ہے، اس وقت آپ کو اپنی ذہانت کا ثبوت دینا ہے اور علم کا وہ نمونہ اور معیار سامنے لے کر آنا ہے جو زبان کے اعتبار سے، اسلوب کے اعتبار سے، مواد کے اعتبار سے، مطالعہ مذاہب اور تقابل ادیان کے اعتبار سے متوجہ کرنے والا ہو، جس کو دیکھ کر زمانہ خود اس بات کا اعتراف کرے کہ آپ نے ایسی چیز سامنے رکھی ہے جو واجب الاعتراف ہے۔

آج زمانہ زیادہ اہم چیزوں کا طالب ہے:

میں اس بات کو پھر دہراؤں گا کہ زمانہ اب آپ سے بہت سی نئی چیزوں کا طالب ہے،

ان چیزوں میں بہت زیادہ نازک اور اہم چیزوں کا طالب ہے، جن کا وہ ہمارے اسلام سے طالب تھا۔ اقبال کا شعر ہے:

نگہ بلند سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

اب اس سخن میں دلنوازی بھی نہیں رہی، لیکن سخن دلنواز بھی کافی نہیں، اس کے ساتھ جان پرسوز اور نگاہ بلند بھی ہونی چاہئے، آپ جن کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں اور جن کی اس عزیز میراث کے وارث ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ آسمان سے ستارے توڑ لائے، لیکن اس زمانے کے مزاج اور معیار کے مطابق انہوں نے اپنی شان قائم رکھی، اور اس میں انہوں نے ایک مقام حاصل کیا، پھر اس مقام کو انہوں نے اپنی نسلوں کی طرف منتقل کیا، آپ کو اس کے لئے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی، آپ تقریروں کا معیار بلند کیجئے، تحریروں کا معیار بلند کیجئے، مطالعہ وسیع کیجئے، اور اس کے لئے اساتذہ سے، خاص طور پر مربی ''الاصلاح'' سے اور ان اساتذہ سے جن سے آپ کا رابطہ ہے، ان سے مشورہ کیجئے، مطالعہ اتنا آسان نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے بغیر کسی ترتیب کے پڑھنا شروع کردے، یہ دودھاری تلوار ہے، اگر اس کا صحیح استعمال نہیں کیا جائے گا تو وہ نقصان بھی پہنچا سکتی ہے، یہ ایک پل صراط ہے، اس پر بہت سبک روی اور بہت احتیاط کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے اپنے اساتذہ سے مشورہ کیجئے، وقت بہت کم، کام بہت زیادہ، پڑھنے کا سامان بھی روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے، نہ ہر لکھی ہوئی اور چھپی ہوئی چیز پڑھنے کے قابل، نہ ہر رسالہ آپ کی میز پر آنے کے لائق۔

یہ علم کا، تہذیب کا، خیالات کا اور مقاصد کا حرم ہے:

یہ علم کا، تہذیب کا، خیالات کا اور مقاصد کا ایک حرم ہے، اس حرم میں انہیں چیزوں کو آنا چاہئے اور ان چیزوں کو آنے کی اجازت دینی چاہئے جو آپ کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہوں، جو اس درسگاہ کے بانیوں کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہوں، جس طرح آپ یہاں کسی بدبودار چیز کو نہیں آنے دے سکتے، اسی طریقے سے آپ کی میز پر کوئی ایسا رسالہ بھی نہیں آنا چاہئے جو اس سے زیادہ متعفن اور مضر ہے، اور یہاں کی فضا کو اس سے زیادہ متاثر کرسکتا ہے۔

یہ میز کسی پبلک لائبریری کی میز نہیں ہے، یہ ایک درسگاہ کی میز ہے، یہ ایک معمل ہے،

ایک بہت بڑی کارگاہ ہے، جہاں ان دماغوں کو ڈھلنا ہے جو امت کی رہبری کریں گے، یہاں کی الماریوں میں کسی ایسی کتاب کو رہنے کا حق نہیں ہے، جس کی بدبو ان دیواروں کو توڑ کر باہر آتی ہو، جس کو ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد انسان کئی کئی ہفتے ذہنی انتشار میں مبتلا رہے، اور ان خیالات، مقاصد اور ان تعلیمات سے اس کو کوئی اتفاق باقی نہ رہے، جو اس درسگاہ کے بنیادی مقاصد میں داخل ہیں، اس کے لئے آپ کے دل اور ضمیر کا احتساب کافی ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؔ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بنگلہ زبان میں فاضلانہ مہارت پیدا کیجئے

۱۴ مارچ ۸۴ء کو جامعہ امدادیہ کشور گنج کے میدان میں علماء، طلباء کے ایک بڑے مجمع میں کی گئی ایک تاریخی ولولہ انگیز خطاب۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد اعبده ورسوله الذى ارسله الله تعالى بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجامنيرا۔

حضرات، اہلِ علم وفکر، مدرسین واساتذہ، طلبائے عزیز!

ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے!

آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے، جس ملک کو اللہ نے آپ کے لئے انتخاب کیا ہے، اس کے بارے میں آپ کو خدا کے یہاں جواب دینا ہوگا، اگر اسلام سے اس کا رشتہ کمزور ہوگیا، اور ملک کے اندر خلاف اسلام رجحان پیدا ہوا تو رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ ہوگا اور آپ کا گریبان ہوگا، سیاسی لوگوں سے پوچھا جائے گا یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے، ہم نہیں کہہ سکتے، لیکن سب سے پہلے علماء سے سوال ہوگا کہ تمہارے ہوتے ہوئے ملک میں اسلام کیسے خطرہ میں پڑا؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے، میرے ہوتے ہوئے دین کمزور ہوجائے یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کو تمام جزوی وذیلی اختلافات کو ختم کرکے اس مقصد پر متحد ہونا چاہئے کہ آپ اس ملک کی رہنمائی کریں، آپ اس ملک کے اس طبقہ کو متاثر کریں، اپنے اخلاص سے، اور اپنے ایثار سے، جس کے ہاتھ میں زمام اختیار ہے یا آنے والی ہے، جنہوں نے اس کی تیاری کی ہے، جن کے پاس وہ وسائل واسلحہ ہیں، جن کے ذریعہ سے اس زمانہ میں آدمی کو اقتدار حاصل ہوا کرتا ہے، آپ کا یہ فرض ہے کہ اس طبقہ سے روابط پیدا

کریں، آپ ان کی زبان میں ان کو سمجھائیں، آپ کے متعلق ان کا یہ تجربہ ہو جائے کہ آپ بے غرض ہیں، آپ ان سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے ہیں، آپ کو وہ بڑی سے بڑی رشوتیں دینا چاہیں، آپ کو بڑے سے بڑے مواقع دینا چاہیں، آپ کہیں نہیں! ہمیں کچھ نہیں چاہئے، آپ دین کی خدمت کریں۔

مادری زبان میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت

دوسری بات یہ ہے (ماشاء اللہ پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع ہے، اس لئے میں کہتا ہوں) کہ یہاں کی زبان (بنگلہ زبان) کو آپ اچھوت نہ سمجھئے، بنگلہ زبان کو آپ یہ نہ سمجھئے کہ اس کے پڑھنے لکھنے سے کوئی ثواب نہیں ہے، یا عربی میں ثواب ہے یا اردو میں ثواب ہے۔ آپ کو بنگلہ زبان میں مہارت پیدا کرنا چاہئے، بنگلہ زبان میں آپ اچھے لکھنے والے بنئے، آپ ادیب بنئے، مصنف بنئے، آپ کی زبان میں مٹھاس ہو، رس ہو، آپ کی زبان ایسی ہو کہ لوگ غیر مسلم ادیبوں کی تحریر پڑھنے کے بجائے آپ کی تحریر پڑھیں اور مست ہوں اور جھومیں۔ یہ بات لکھنؤ میں رہنے والے کی زبان سے سنئے، دلی کی زبان بولنے والے کی زبان سے سنئے اور عربی پر جان دینے والے کی زبان سے سنئے، اس وقت تک جو عمر گزری ہے، عربی زبان کی خدمت میں انشاء اللہ بقیہ عمر بھی گزرے گی، عربی ہماری زبان ہے، ہم عربی کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں، الحمد للہ ہم تو ہم ہمارے بعض عزیز بچے بھی ایسے ہیں جو کسی طرح عربوں سے کم نہیں ہیں، وہ شخص آپ سے کہہ رہا ہے جو عربی زبان کا کیڑا ہے اور اردو زبان جس کے گھر کی زبان ہے، وہ آپ سے کہہ رہا ہے کہ بنگلہ زبان کو غیر مسلموں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیئے، ان کے حوالہ نہ کیجئے کہ لکھیں وہ پڑھیں آپ۔ یاد رکھئے! قلم کے ساتھ اثر ہوتا ہے، لوگوں نے تو یہ کہا کہ کتاب اگر کسی صاحب ایمان کے قلم سے لکھی ہوئی ہے تو ایمان کا کرنٹ دوڑ جاتا ہے، حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ خطوط کے ذریعہ سے بھی توجہ دی جاتی ہے، جب کوئی شیخ توجہ سے خط لکھتا ہے تو اس خط میں تاثیر ہوتی ہے، اور ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے، اور آج ان مصنفین کی کتابیں موجود ہیں، جو ان کی کتاب پڑھ لے اس کی نمازوں کی کیفیت بدل جاتی ہے، کتاب کا نماز سے کوئی تعلق نہیں، کتاب کسی اور موضوع پر ہے، لیکن جب وہ صاحب لکھ رہے تھے یا بول رہے تھے تو قلب ان کا متوجہ تھا، آج ان کی کتابیں پڑھئے، ان کی تحریر پڑھئے تو آپ اس کے بعد نماز

پڑھیں گے، ذرا بھی آپ کا احساس اور قلب بیدار ہے تو آپ محسوس کریں گے اس کی کیفیت اور ہے، میں نے بارہا اس کو محسوس کیا ہے۔

آپ نے غیر مسلموں کی کتابیں پڑھیں، ان کے افسانے پڑھے، ان کی کہانیاں پڑھیں، ان کی تاریخ لکھی ہوئی پڑھیں، اور آپ پر اثر نہ پڑے؟ ضرور پڑے گا، یہ بہت بڑی کم ہمتی کی بات ہے، آپ لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ جو مسلمان ادیب وشاعر گزرے ہیں، ان کو آپ نمایاں کریں، آپ نذر الاسلام کو نمایاں کیجئے، آپ ان کی چیزیں پڑھئے، اور ان کے ترجمے کیجئے، اللہ تعالیٰ صلاحیت دے تو ان کا کلام عربی میں پیش کیجئے، یہاں کئی ادیب گزرے ہیں، مثلاً عبدالغفور نساخ ان کا نام بچپن میں اردو ادب کی تاریخ میں پڑھا تھا، اور کئی شاعر گزرے ہیں، ان لوگوں کے حالات لکھئے، دنیا کو بتائیے کہ یہاں کیسے کیسے شاعر گزرے ہیں، خدا کے فضل وکرم سے کوئی جوہر، کوئی کمال ایسا نہیں جو آپ کو نہ ملا ہو، ہمارے مدارس میں تو بعض بنگالی طالب علم اتنے ذہین تھے کہ رشک آتا تھا اور ہمارے یوپی اور بہار کے طالب علم ان کے سامنے مات تھے، عربی سپاس نامے میں، میں سنتا چلا آرہا ہوں، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اتنی اچھی عربی لکھنے والے یہاں موجود ہیں، کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوئیے گا، خدا نے آپ کو سب جوہر دیئے ہیں، مگر اس کا صحیح استعمال نہیں۔

میری بات یاد رکھئے کہ بنگلہ زبان کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیجئے، دو قسموں سے، ایک غیر مسلموں سے، ایک غیر اسلامی سے، دو قسمیں ہیں، ایک غیر مسلم ہے، ایک غیر اسلامی ہے، غیر اسلامی مسلمانوں میں بھی ہوتے ہیں، غیر مسلم غیر مسلموں میں ہوتے ہیں، غیر مسلموں سے غیر اسلامیوں سے دونوں سے قیادت اپنے ہاتھ میں لیجئے، اور اس میں ایسا کمال پیدا کیجئے کہ لوگ اس سے مستغنی ہوجائیں، الحمدللہ ہمارے یہاں کے علماء نے اس کی طرف توجہ کی، ادب، تنقید، تاریخ، تصنیف میں ان کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلا، ایک مرتبہ انعامی مقابلہ تھا، ایک بڑے اردو رسالہ کی طرف سے کہ اردو کا سب سے بڑا نثر نگار کون ہے؟ سب سے بڑا انشاء پرداز کون ہے؟ انعام ان کو ملا جنہوں نے یہ ثابت کیا کہ مولانا شبلی نعمانی اردو کے سب سے بڑے انشاء پرداز تھے، جب کوئی بڑا منتخب جلسہ ہوتا تو مولانا سید سلیمان ندوی کو، مولانا عبدالسلام ندوی کو، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کو، صدارت تفویض کرتے، اردو

شاعری کی تاریخ پر دو کتابیں ہیں جو یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ ایک ''آب حیات'' جو مولوی محمد حسین آزاد کی لکھی ہوئی ہے جو قدیم نصاب پڑھے ہوئے تھے، اور ایک ''گل رعنا'' جو ہمارے والد ماجد حکیم سید عبدالحئی کی لکھی ہوئی ہے۔ دارالمصنفین سے چھپی ہے، ہندوستان میں ہم نے اردو زبان کو دوسرے کے قبضہ میں نہیں جانے دیا، اور آج بھی خدا کا شکر ہے کہ کوئی وہاں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولویوں کو اردو نہیں آتی۔ مولوی ٹکسالی زبان میں میٹھی زبان میں، رسیلی زبان میں تقریر نہیں کر سکتے لکھ نہیں سکتے، کوئی آج بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، اب بھی ہمارے علماء میں ایسے ایسے بولنے والے موجود ہیں کہ ان کے سامنے وہ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتے جن کو بڑے دعوے ہیں، ایسے ہی آپ کو کرنا چاہئے، دیکھئے (پیر دانا نہیں کہتا لیکن ایک جہاں دیدہ تجربہ کار کی یہ بات لکھ لیجئے) آپ بنگالی زبان سے اگر قطع تعلق اور پرہیز کریں گے تو یہ ایک طرح کی معنوی خودکشی ہوگی، زبانوں میں کوئی بیر نہیں ہوتا کہ ایک زبان آئے تو دوسری زبان نہیں آسکتی، یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہی۔

'ہفت زبان'' کا ایک محاورہ چلا آرہا ہے کہ سات زبانیں آتی ہیں، لیکن ایسے تو خدا کے فضل وکرم سے تین چار زبان جاننے والے تو ہمارے یہاں بھی ہیں، خدا کے فضل سے ہمارے کچھ نوجوان ایسے ہیں کہ عربی بولنے کو کہہ دیجئے تو عرب سمجھیں گے کہ شاید عرب ہیں، یہ بات غلط ہے کہ ایک نئی زبان اچھی طرح آسکتی ہے، نہیں بلکہ بعض اوقات ایک زبان دوسری زبان کو مدد پہنچاتی ہے۔

اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر ہے

بھائیو! یہ دو باتیں یاد رکھو، میں زیادہ نہیں کہنا چاہتا کہ اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داری تمہاری ہے، اس ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے، ورنہ تمہارے سب مدرسے بیکار ہیں، میں صاف کہتا ہوں، میں مدرسہ کا آدمی ہوں، مدرسہ کے تالاب کی مچھلی ہوں، میں کہتا ہوں کہ اسلام اگر خدانخواستہ نہ رہا تو یہ سب مدرسے بیکار ہیں، یہ مدرسے کسی چیز کی دوا نہیں، پہلا کام ہے اسلام کو باقی رکھنا، اسلام کا رشتہ اس قوم سے جوڑے رکھنا، دوسری بات قیادت کا مقام حاصل کرنا، قیادت کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ کو بنگلہ پر عبور نہ ہو، میں نے کل استقبالیہ جلسہ میں جس میں اسلامک فاؤنڈیشن نے استقبالیہ دیا تھا، کہا کہ مجھے افسوس ہے

اور شرم آرہی ہے کہ میں آپ سے بنگلہ میں بات نہیں کرسکتا، میں خوش ہوتا اگر میں آپ کے سامنے بنگلہ میں تقریر کرتا، ہمارے یہاں اسلام میں کوئی زبان غیر نہیں ہے، سب زبانیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ایک سے ایک زبان بڑھی ہوئی ہے، زبان کے خلاف تعصب بالکل جاہلانہ بات ہے، نہ کوئی زبان پرستش کی قابل ہے نہ کوئی زبان نفرت کے قابل ہے، یہ سمجھ لو پرستش کے قابل بھی نہیں ہے، اگر مقدس زبان کوئی ہوسکتی ہے تو عربی ہوسکتی ہے، باقی سب زبانیں یکساں ہیں، اللہ نے انسانوں میں بولنے کی صلاحیت پیدا کی اور سینکڑوں برس میں ان زبانوں میں ترقی ہوئی، اور اب وہ ہمارے پاس ترقی یافتہ شکل میں پہنچیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں اور ہمیں اظہار خیال کے لئے ان سے مدد ملتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان پڑھنے کا حکم دیا جو صرف یہودیوں کی زبان تھی، اگر ہم زبان وادب کی طرف سے بے اعتنائی برتیں گے تو غیر اسلامی عناصر ان پر اپنی اجارہ داری قائم کرلیں گے اور ان سے بڑا نقصان پہنچے گا۔ کلکتہ سے کتابیں آتی ہیں، مسموم کمیونزم کی پرچار کرنے والی، قومی ولسانی تعصب کی پرچار کرنے والی، ہندو میتھالوجی کی پرچار کرنے والی اور بڑے شوق سے ہمارے نوجوان پڑھتے ہیں، بھائی! اگر آپ کو ترمذی کی شرح لکھنی ہو اور مشکوٰۃ کی شرح لکھنی ہو اور کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرنا ہو، اس کو آپ اردو میں لکھئے، یا عربی میں لکھئے، اگر آپ کو عوام سے باتیں کرنی ہوں تو عوام کی سطح پر بات کیجئے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ ہندوستان پاکستان میں بہت کام ہو چکا ہے، کتب حدیث کی شرحیں لکھی جاچکی ہیں، مذہب حنفی کو حدیث کے مطابق ثابت کیا جاچکا ہے، اب اس کے بعد کسی نئی بڑی کوشش کی ضرورت نہیں ہے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیمویؒ یہ سب کام کر چکے ہیں، انہوں نے ثابت کردیا کہ یہ دعویٰ کہ حنفی حدیث کے خلاف کہتے ہیں، غلط ہے، اور ان سے پہلے طحاویؒ ''معانی الآثار'' میں زیلعی نے احادیث ہدایہ کی تخریج ''نصب الرایہ'' میں اور دوسرے حضرات نے بھی یہ کام بڑے اعلیٰ پیمانہ پر کیا ہے، اب نیا میدان ہے جس کی طرف آپ کو توجہ کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ عوام آپ کے اثر سے نکلنے نہ پائیں، وہ آپ کو یہ نہ سمجھیں کہ آپ اس ملک میں رہ کر کے بھی غیر ملکی ہیں، اس ملک میں رہ کر کے آپ پردیسی ہیں، آپ کو تو اس ملک کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان دمائکم واموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا الا فلیبلغ الشاھدالغائب (حدیث نبوی ﷺ)

اے مسلمانو! تمہارا خون تمہارے مال، تمہاری عزت وآبرو ایک دوسرے پر حرام ہے، جیسے آج کا (عرفہ کا) دن اس شہر (مکہ) کے جوار میں اس مہینہ ذی الحجہ میں جو حرمت کا مہینہ ہے۔

زبان کے لئے کسی مسلمان کی توہین کرنا، مسلمان کے دل کو دکھانا، مسلمان کا خون بہانا ناجائز اور ظلم عظیم ہے، نہ زبان پرستش کے قابل ہے، نہ نفرت کے قابل "قد جعل اللہ لکل شیء قدرا" اللہ نے ہر چیز کا ایک پیمانہ بنایا ہے، اس کا بھی ایک پیمانہ ہے، محبت کرو، کمال پیدا کرو، زبان وشاعری کا لطف لو، اس کا ذائقہ لو، لیکن غلو نہ کرو، خدا کی کتاب کو بھی اگر کوئی پوجنے لگے، تو مشرک وکافر ہو جائے گا، اگر قران کوئی سامنے رکھ کر (اس کو مسجود سمجھ کر) سجدہ کرے تو مشرک ہوگا، پرستش صرف خدا کی ہے، لیکن سب زبانوں سے محبت کرنا اور اس میں عبور حاصل کرنا اور سب کا حق دینا معقول ہے۔

میرے عزیزو! اگر یہ باتیں آپ کو یاد رہیں تو انشاءاللہ کسی دن یاد کرو گے کہ کوئی کیا کہہ گیا تھا:

فستذکرون مااقول لکم وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد

جو بات میں تم سے کہتا ہوں، تم اسے آگے چل کر یاد کرو گے، اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں، بے شک خدا بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

فرشتے بھی سن لیں اور کراماً کاتبین بھی سن لیں کہ ہم حجت پوری کر رہے ہیں، اس ملک کے رہنے والے مسلمانوں پر کہ اگر تمہیں اس ملک میں رہنا ہے، اسلام کو باقی رکھنا ہے تو یہ راستہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کام اور پیغام

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعهم ودعا بدعوتهم الیٰ یوم الدین اما بعد فقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا ان فی الجسد مضغة، اذا صلحت، صلح الجسد کله، واذا فسدت فسد الجسد کله، الا وهی القلب

حضرات عالی مقام! مجھے تجربہ ہے کہ جس مسند پر کثیر تعداد میں ممتاز ترین شخصیتیں، نامورانِ قوم وملک جمع ہوں، نام لے لے کر تقریر کا آغاز کرنا بعض اوقات بڑا خطرناک ہوتا ہے، ان میں سے کوئی ایک نام بھی رہ جائے تو بڑی کوتاہی اور ناانصافی پر محمول کیا جاتا ہے، اس لئے میں سب حضرات معززین کو جو اسٹیج پر رونق افروز ہیں، ان سب کا اجمالی طور پر شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی تقریر کا آغاز کرتا ہوں، حضرات! میں یونیورسٹی کی اصطلاح میں امتحان کا لفظ بولتا ہوں، میں نے بہت سے امتحانات دیئے ہیں، لیکن آج بہت بڑا امتحان ہے، مجھے اس امتحان کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ میرا اس طرح خیر مقدم کیا جائے گا۔ میری حقیر ذات کو اس قدر نمایاں کیا جائے گا، میں درحقیقت ایک خلق کے احترام میں اور ایک نسبت گرامی کا لحاظ کرتے ہوئے یہاں حاضر ہوا تھا کہ نواب عبیدالرحمٰن خان شیروانی مرحوم کے نام پر جو یادگار قائم کی جارہی ہے، جس عمارت کا افتتاح ہے، اس کا شرف حاصل کروں، کیونکہ یہ ایک دینی، ملی اور خاندانی فریضہ میرے دوشِ ناتواں پر ہے، اور میرے لئے یہی بات باعث اعزاز ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے وہم وخیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میرے استقبال میں میرے اعزاز میں یا اظہار تعلق کے لئے ایسی موقر مجلسیں ہوں گی اور ایسے ممتاز حضرات جمع ہوں گے، میرے وہم وگمان میں کہیں یہ بات نہیں تھی، اس میں ایک امتحان کی بات یہ بھی ہے کہ جن الفاظ میں، نظم ونثر میں اور جس خطیبانہ وادیبانہ انداز میں میری حقیر ذات کا ذکر کیا گیا، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ میں صرف شکریہ پر اکتفا کروں، بلکہ میں آپ کی اور آپ کے مؤقر ادارہ

کی اور اس کے کارناموں کی اور اس کی خدمات کی تعریف کروں، اس کا ذکر کروں، اور اس کے بعد کوئی اور قدم آگے بڑھاؤں، میں اس کو ایک بہت بڑی ناسپاسی اور حقیقت میں ایک بڑی ناشکری سمجھوں گا کہ میں صرف شکریہ پر اکتفا کروں اور انسان کا قاعدہ ہے کہ جس سے اس کو محبت ہوتی ہے اور تعلق خاطر ہوتا ہے، جس کی جتنی اہمیت ہوتی ہے اور جس کے جتنے اثرات عمیق پڑ سکتے ہیں، اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے ساتھ پیش آتا ہے کہ جیسے کہتے ہیں ''عشق است و ہزار بدگمانی۔''

محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ مخلصانہ طور پر صرف اس کی مدح و توصیف پر اکتفا نہ کی جائے، بلکہ اس کے بارے میں جو امکانات ہیں اور لوگ اس کو جس نظر سے دیکھتے ہیں اس کا بھی اظہار کر دیا جائے، اس لئے میں اس کو شکر گذاری اور سپاس گذاری کا ایک فرض اور ایک تقاضہ سمجھتا ہوں کہ میں آپ کے سامنے اس نقطۂ نظر اور اس احساس کو دیکھتے ہوئے جو احساس اس وقت پوری علمی دنیا میں اور پھر اس وقت ہندوستان کی ملت اسلامیہ میں اور پھر ہندوستان کی سرزمین مین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بارے میں پایا جاتا ہے، اور جو توقعات لوگ رکھتے ہیں۔

میں نے آپ کے سامنے ایک حدیث پڑھی ہے، آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''یاد رکھو! سن لو! کہ انسان کے جسم میں ایک مضغۂ گوشت ہے، گوشت کا ایک ٹکڑا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جائے، وہ اگر بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جائے، وہ کیا ہے، وہ قلب ہے، آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ انسان کا جسم طویل و عریض بھی ہوتا ہے، انسان جسیم ہوتا ہے، مختلف اعضاء کا مجموعہ ہوتا ہے، لیکن طبیب حاذق اس کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے، نبض سے وہ پہچان جاتا ہے کہ اس جسم انسانی کو کیا عوارض درپیش ہیں، اس کی اندرونی حالت کیا ہی، وہ ہاتھ تو نبض پر رکھتا ہے، لیکن پورے جسم کا جائزہ لے لیتا ہے، میں مسلم یونیورسٹی جیسی عظیم الشان، عالمگیر شہرت کی حامل، جس پر ملت ہندیہ کی بہترین ذہانتیں، بہترین علمی عملی صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں، جس کی آغوش میں ملت ہندیہ نے اپنے جگر پارے ڈال دیئے ہیں، میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کی ملت نے جگر کے ٹکڑوں کو اپنے قابل فخر فرزندوں کو کسی اور ادارہ کے اس طرح سپرد نہیں کیا، میں کسی ادارہ کی تحقیر نہیں کر رہا ہوں، ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں، جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے اور

یہاں کے شریف خاندانوں نے، اور یہاں کے ان خانوادوں نے ان انسانی مجموعوں نے جن کی ایک قابل فخر تاریخ رہی ہے اور جنھوں نے مختلف صدیوں میں، اور تاریخ کے مختلف دوروں میں افراد پیدا کئے ہیں، اور جنھوں نے ملک اور قوم پر بڑے گہرے اثرات ڈالے ہیں، اور بعض اوقات انقلاب پیدا کر دیا ہے، ان خاندانوں نے بہترین جگر پاروں کو اور دل کے ٹکڑوں کو، اور اپنی خاندانی خصوصیات کو جو بعض اوقات صدیوں پرانی تھیں، ہزاروں سال پرانی تھیں، اور بعض بعض تیرہ سو پرانی تھی، اپنے جگر پاروں کو اگر کسی کی آغوش میں ڈالا ہے، اعتماد کے ساتھ اور امیدوں کے ساتھ، توقعات کے ساتھ، وسیع امکانات کے ساتھ اور بہت گہرے اندازوں کے ساتھ، تو وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی حیثیت

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا معاملہ محض ایک یونیورسٹی کا معاملہ نہیں ہے، یہ ملت اسلامیہ ہندیہ کے نونہالوں کی امین، ایک ذمہ دار اور ایک بہت بڑے خواب کی تعبیر کے پورا کرنے والے ادارہ کی حیثیت ہے، اگر یہاں ان کی توقعات پوری ہوئیں، اور ان فرزندوں، ان خاندانوں کے جگر پاروں کی اچھی تربیت کی، ان کو پڑھا لکھا کر ہی نہیں، بلکہ بنا کر ان کو بہترین اخلاقی تربیت دے کر، جس کو میں نے اپنی صبح کی تقریر میں بار بار کردار کے لفظ سے ادا کیا ہے، ایک نمایاں اور امتیازی کریکٹر، اخلاقی استقامت، اخلاقی حوصلہ مندی اور بلندی اور اعتماد نفس، اپنے علم پر اعتماد، اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کے حامل کی حیثیت سے یونیورسٹی نے نکالا، تو یونیورسٹی نے اس کا ایک شریفانہ جواب دیا اور ان خاندانوں ہی کو نہیں بلکہ ملت پر احسان کیا، اس یونیورسٹی کا معاملہ کسی اصطلاحی درسگاہ کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تاریخی امانت خانہ ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ ایک تاریخی اور ملی خزانہ ہے، جس کو اپنے ان جواہرات کی پوری حفاظت کرنی چاہئے، ان جواہرات کو آخری حد تک چمکا کر اور تاباں بنا کر ملت کو واپس کرنا چاہئے، یہاں سے صرف گریجویٹس کا نکلنا، صرف اسکالرز کا نکلنا، صرف ان لوگوں کا نکلنا جو ملازمتوں کے لئے فٹ پائے جائیں، موزوں پائے جائیں، اور جو صرف ملک کے انتظامیہ کو بہتر صلاحیتیں فراہم کریں، اپنے خاندانوں کی اچھی طرح پرورش کریں، یہ ہرگز کافی نہیں۔

میں ایک علمی تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے بھی اور ایک علمی درسگاہ اور ایک علمی

مکتب فکر کے نمائندہ کی حیثیت سے بھی اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والے کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، اور جو حدیث میں نے آپ کے سامنے پڑھی کہ جسم انسانی میں ایک ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے جو اگر درست ہوجائے تو سارا جسم درست ہوجائے، اور وہ اگر بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جائے، اس لئے یہاں کی جو سب سے بڑی ضرورت ہے، وہ یہ کہ آپ یہاں سے نئی نسل کے وہ افراد ملک کے سامنے پیش کریں جو ایمانی حقائق پر یقین رکھنے والے ہوں، اسلامی تعلیمات کے پورے طور پر حامل، اور اس کے نمائندہ ہوں، اخلاقی صوبوں کے پابند ہوں، ایک کردارر کھتے ہوں، وہ بلند نگاہی اور خودداری کے حامل ہوں، ابھی ہمارے بزرگ قاری شبیر صاحب نے ایک واقعہ سنایا۔ محبوب الٰہی کا، سردیوں کا زمانہ تھا، درس دے رہے تھے، پاؤں پھیلائے ہوئے تھے، ان سے کہا گیا کہ بادشاہ آرہے ہیں، پاؤں سمیٹ لیجئے، انہوں نے جواب دیا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے، وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا، اسی طرح کا واقعہ عرب ملک کا سناتا ہوں کہ حلب میں شیخ سعد حلبیؒ تھے، ابھی سو برس پہلے کا قصہ ہوگا۔ جو دمشق کی ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے درس دے رہے تھے، اتفاق سے اس دن ان کے پاؤں میں تکلیف تھی اور وہ پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے اور جیسا کہ قاعدہ ہے کہ استاذ پشت بہ قبلہ ہوتا ہے، اور اس کے شاگرد سامنے بیٹھے ہوتے ہیں اور دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں تو ان کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور پشت قبلہ کی طرف تھی، اور پاؤں دروازے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک مشہور بانی سلطنت مصر خدیوی سلطنت، جو ابھی فاروق پر ختم ہوئی ہے، ابھی پندرہ بیس برس پہلے تک وہ موجود تھی محمد علی پاشا بیٹا تھا۔

ابراہیم پاشا اس زمانہ میں بڑا سفاک اور جلاد مشہور تھا، وہ شام کا گورنر تھا اور اس کی سفاکی کے قصے لوگوں کی زبانوں پر تھے، اس کو خیال ہوا کہ حضرت کا درس جاکر سنوں اور ملاقات کروں، راستہ ایک ہی تھا، اس لئے وہ دروازے کی طرف سے آیا۔ سب کو خیال تھا کہ حضرت کو ہزار تکلیف ہو اس موقع پر اپنا پاؤں سمیٹ لیں گے، اتنی دیر میں کیا ہوجائے گا۔ لیکن انہوں نے بالکل جنبش نہیں کی، نہ درس موقوف کیا، نہ پاؤں سمیٹا، اسی طرح پاؤں پھیلائے رہے اور وہ پاؤں کی طرف آکر کھڑا ہوگیا۔ اب ان کے شاگرد کہتے ہیں کہ ہم بالکل لرزاں وترساں تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ کیا ہمارے شیخ کی شہادت ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگی، یا تذلیل

ہوگی۔ مشکیں باندھ لی جائیں گی اور کہا جائے گا لے چلو، وہ کھڑا رہا اور شیخ دیر تک درس دیتے رہے، التفات بھی نہیں کیا اور پاؤں بھی نہیں سمیٹا۔ مگر خدا جانے ان بزرگوں کا کیا اثر ہوتا ہے کہ اس نے کچھ نہیں کہا، کوئی سرزنش نہیں کی، کوئی شکایت نہیں کی اور چلا گیا۔

سننے والی جو بات ہے وہ یہ کہ وہ کچھ ایسا معتقد ہوا کہ اس نے جا کر اشرفیوں کا ایک توڑا غلام کے ہاتھ بھیجا اور کہا کہ شیخ کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ یہ حقیر نذرانہ قبول فرمائیں۔ آپ جانتے ہیں انہوں نے جواب میں کیا کہا؟ یہ آب زر سے لکھنے والا جملہ تھا جو علم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ انہوں نے کہا۔ اپنے بادشاہ کو سلام کہنا اور کہنا جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا، یا پاؤں ہی پھیلا لے، یا ہاتھ ہی پھیلا لے، ایک ہی کام ہوسکتا ہے دنیا میں، جب میں نے پاؤں پھیلائے تھے اس وقت یہ طے کرلیا تھا کہ اب ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ "**ان الذی یمد رجله لایمدیده**" ان ہی الفاظ کے ساتھ مؤرخ نے ان کو نقل کیا ہے:

سلم علی مولاک وقل له
ان الذی یمد رجله لایمدیده

بہرحال ہمیں اپنے طلباء کو اس طرح بنانا چاہئے کہ وہ ملک میں اپنے جوہر ذاتی اور اپنی قابلیت اور اپنی زبان دانی، اپنی صلاحیت انتظامی اور اپنی ذہانت اور اپنی کارکردگی سے پہچانے جائیں۔

حضرات! میں ان لوگوں میں نہیں ہوں کہ ان کی اہمیت کا انکار کروں، واقعات پر میری نظر ہے، میں جانتا ہوں کہ یہ سب چیزیں کتنی اثر انداز ہوتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی نمونہ بنیں گے کہ ہم ضمیر فروش نہیں ہیں، ہم کسی حالت میں ضمیر بیچ نہیں سکتے، اس موقع پر بے اختیار علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آ گئے وہ کہتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ دیکھا میں نے افرنگی کا راز
من کی دنیا میں نہ پائے میں نے شیخ و برہمن

یہ شعر جو حقیقت میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

یہ تعلیم، یہ مسلم یونیورسٹی میں اپنے بہت قدیم تعلقات کی بناء پر عرض کرتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ سید احمد خان رحمۃ اللہ کے خاندان کو سید احمد شہید رحمۃ اللہ کے خاندان سے تعلق تھا، علاوہ سیادت کے رشتہ کے میری معلومات یہ ہیں کہ ان کی والدہ بیعت تھیں سید احمد شہیدؒ سے، یہ سید احمد نام ان ہی نے رکھا اپنے پیر کے نام پر۔ ان کے والد شاہ غلام علی صاحب کے مرید تھے اور ان کی والدہ حضرت سید احمد شہید سے مرید تھیں، یہ میرے دل میں بچپن سے نقش ہو گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی نظر اور ان کی توقعات ان کے انداز سے اور ان کی اپنی محنتوں کو جو ثمرہ سمجھتے تھے، وہ اس میں ہرگز محدود نہ تھا کہ یہ لوگ نکالے جائیں جو آسامیوں کے قابل ثابت ہوں اور ان کو عہدے دیئے جائیں اور وہ اپنے محدود خاندانوں کی پرورش کریں، اور اچھی طرح کھائیں پئیں اور زندگی گزاریں، وہ ایک ایسی نسل پیدا کرنا چاہتے تھے جو قیادت کرے، اور یہی وجہ تھی کہ آپ کی یونیورسٹی نے ملت اسلامیہ ہندیہ کو بلکہ برصغیر ہند کو وہ افراد دیئے جن کی مثال نہیں ملتی، مولانا محمد علی جوہر اور ان کی قربانیاں، مولانا ظفر علی خان کی ذکاوت اور ان کی شاعری، اس کے بعد پھر وہ لوگ جنہوں نے بعض سیاسی، انقلابی کام کیے ہیں، تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ اس سے بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، ان لوگوں نے اس وقت وہ کام کئے جو اس وقت ناممکن سمجھے جاتے تھے، اس کے علاوہ مفکرین، مصنفین، اہل قلم اور انگریزی پر قدرت رکھنے والے اور دانش گاہوں کے چلانے والے، سب نکلے، آپ سے یہ عرض کروں گا۔ آپ ایک ایسے طبقے کو پیدا کریں، ہمارے اساتذہ کرام اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور دانشور یہاں سب موجود ہیں جو اس کا خاکہ بناتے ہیں، جو اس کے لئے نئے راستے پیدا کرتے ہیں،

وہ موجود ہیں ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ایسے طبقے کو پیدا کریں جس کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔

یہ بات میں نے انگلستان میں بھی کہی ہے کہ اس طرح آپ کا رہنا کافی نہیں ہوگا، بلکہ آپ کو یہاں اس طرح رہنا چاہئے کہ انگلیاں اٹھیں کہ کون جارہا ہے، یہ ہم سے مختلف معلوم ہوتا ہے، اس کی نگاہیں پاک ہیں اور اس کے خیالات پاک ہیں، انسانیت کا ہمدرد ہے اور یہ ملک کے لئے باعث زینت ہے۔ میں اس موقع پر سید احمد شہید کے ذکر کی رعایت کے ساتھ ذکر کرتا ہوں، جب انہوں نے پشاور فتح کیا تو وہاں کئی دن ٹھہرنا پڑا، ایک دن پشاور کے ایک پٹھان نے ہندوستانی مجاہدین میں سے کسی کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور ہندوستانی بھائی! آپ سے ایک بات پوچھتے ہیں صحیح صحیح بتائیے گا کہ کیا ہندوستان کے لوگوں کی دور کی نگاہ کمزور ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں! کمزور نہیں ہوتی ہے، کہا نہیں ضرور کمزور ہوتی ہیں، انہوں نے کہا خدا کا شکر ہے، کسی کی کمزور ہو تو ہو، لیکن عام طور سے کمزور نہیں ہوتی اور نہ کوئی خصوصیت ہے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آپ یہ پوچھ کیوں رہے ہیں؟

اس پٹھان نے ہندوستانی مسلمان سے کہا، ہم آپ لوگوں کو جانتے ہیں کہ آپ میں سے کوئی دو برس کا نکلا ہوا ہے، کوئی چھ ماہ سے، اپنے گھر والوں، بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا ہے، اور آپ جوان بھی ہیں، اور ایسے مضبوط جوان کہ جہاد کے لئے نکلے ہیں، ہم نے آپ میں سے کسی کو نہیں دیکھا جو یہاں کسی عورت کو تاک رہا ہو، کسی نامحرم کو دیکھ رہا ہو، اور دوسری فطری بات تھی کہ اگر اس طرح لذت نہیں حاصل کر سکتے تو اس طرح لذت حاصل کر لیں۔ لیکن یہ بھی نہیں، تو ہم نے فیصلہ کیا کہ آپ لوگوں کو شاید دور کی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ تو جواب میں کہا نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم

ایمان والوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی اور پاک رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور ہمارے امام اور مرشد کی صحبت کا فیض ہے۔

میں آپ سے یہ عرض کروں گا، معلوم نہیں اس کے بعد موقع ملے نہ ملے، زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، اور زندگی بھی رہے تو ایسے موقر اجتماعات ایسے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص کا ایک جگہ

جمع ہونے کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا، آپ ایسے طلبہ کو نکالیں جو اخلاقی اور ذہنی طور پر، علمی طور پر، ہر طرح سے ممتاز ہوں، یہ سمجھا جائے کہ علی گڑھ کا گریجویٹ اور علی گڑھ کا تعلیم یافتہ رشوت نہیں لیتا، وہ ناانصافی نہیں کرتا، وہ کسی خاندان کے درمیان، کسی قوم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتتا، جب وہ انصاف کرتا ہے تو بے لاگ طریقہ پر انصاف کرتا ہے، اسی طریقہ سے ذہنی طور پر بھی آپ اپنا سکہ جمادیں، کوئی قوم خاص کر اس عہد ترقی میں اور عہد علم وفن میں، عہد صحافت، عہد ادبیات میں، عہد تحقیقات میں، کوئی قوم، کوئی ملت عزت حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنا ذہنی سکہ نہ جمادیں، اپنی ذہانت کا، علمی تفوق، علمی امتیاز کا، اپنی محنت و کاوش کا، قوت مطالعہ کا، اپنی وسیع النظری کا، جب تک کہ وہ اپنا سکہ نہ بٹھادے، اس وقت تک کا احترام نہیں ہوتا، یہاں سے ایسے لوگ نکلے جو ایک طرف تو انگریزی پر پوری قدرت رکھیں، اور ان کے اندر علمی و تحقیقی صلاحیت ہی نہیں بلکہ ان کے اندر اس کام کا جذبہ و جوش ہو، اخلاقی و دینی طور پر وہ ایک امتیاز رکھتے ہوں، فرائض کے پابند ہوں، میں صفائی سے کہتا ہوں کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہوں، فرائض کے پابند ہوں ں، لوگ کہیں کہ علی گڑھ کا ایک جج بیٹھا ہوا ہے، جب نماز کا وقت آئے گا تو وہ نماز پڑھے گا، اطمینان رکھو وہ نماز کے لئے ضرور اٹھیں گے ہم نے دیکھا ہے کہ کتنی بھی مصروفیت ہو جب نماز کا وقت آیا تو نماز لئے اٹھے۔

یہ بات لوگوں میں معروف و مسلم ہو اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ غلط فیصلہ نہیں کریں گے، رشوت کا نام بھی ان کے سامنے نہ لینا ورنہ پھر تمہارا وہاں ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بات علی گڑھ کے گریجویٹس، علی گڑھ کے فضلاء کے لئے تمغہ امتیاز ہو ایک مثال ہو، جیسے آگے آگے ایک جلوس چلتا ہے، اسی طرح سے نیک نامی کا، بلند نگاہی کا، پاک دامنی کا اور عالی نظری کا، گویا ایک جلوس آگے آگے چلے، وہ جلوس انسانی شکل میں نہیں ہوگا، لیکن ان روایات کے شکل میں ہوگا، وہ ان تجربات کی شکل میں ہوگا جو اس کے بارے میں کئے جا چکے ہیں۔ ہمارے ان حضرات میں جن کے ہاتھ میں زمام کار ہے، وہ ہمارے لئے ہر طرح سے قابل احترام ہے اور ان سے ہر طرح کی توقع قائم کی جا سکتی ہے، انہوں نے اور قابل احترام اساتذہ نے تربیت کرنے والوں نے اور ہاسٹلوں کی نگرانی کرنے والوں نے اور علمی مشورہ دینے والوں نے کام کرانے والوں نے اگر یہ فریضہ انجام دیا، یہ خدمت انجام دی، تو پھر علی گڑھ کا نام بلند

ہوگا، صرف یہی نہیں بلکہ پورے ایشیا، اور پوری دنیا میں اس کا سکہ، اور میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں سرسید علیہ الرحمہ کی نظر صرف اسی پر نہیں تھی کہ مسلمانوں کو آسامیاں نہیں مل رہی ہیں اس لئے انگریزی پڑھنی چاہئے، تاکہ ان کو نوکریاں ملیں اور اپنے گھر والوں کی پرورش کرسکیں۔ اگر آپ ''آثارالصنادید'' پڑھیں تو جس طرح انہوں نے شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا ہے، جس عقیدت مندی کے ساتھ کیا ہی، معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلم وروشنائی سے نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ دل سے بات نکل رہی ہے۔ آپ اس سے ان کے جذبات کو، ان کے مسلک کو، طرزفکر کو معلوم کرسکتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ساتھ یہ ایک بہت بڑی ناسپاسی ہوگی، ناقدری ہوگی کہ ہم یونیورسٹی سے ان لوگوں کو نکالنا اپنا فرض سمجھیں جو ملازمت کرسکیں اور ملازمت کی اہلیت رکھ سکیں اور اچھی اچھی آسامیاں پاسکیں، اپنے محدود خاندانوں کی پرورش کرسکیں، اس سے قائدین کو نکلنا چاہئے کہ قیادت کریں اور جو اس وقت قوم پر ہسٹریا کا دورہ پڑا ہوا ہے، یہ فرقہ وارانہ فسادات کا، مادہ پرستی کا، رشوت خوری کا، بےحسی کا اور فرقہ وارانہ منافرت کا، اس دورہ کو دور کرسکیں، اس کا علاج کرسکیں اور اس کے سامنے وہ سینہ سپر ہوکر کھڑے ہوجائیں، ملک کا رخ پھیرنے کی کوشش کریں، تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف، فساد کے بجائے صلح وصفائی کی طرف، بدگمانی کے بجائے نیک گمانی کی طرف، بجائے ایک دوسرے سے ٹکرا کر رہنے کے ایک دوسرے سے مل کر تعاون کرکے، اس ملک کا نام روشن کرنے کے لئے اس ملک میں آئندہ نسلوں کو اطمینان کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے قابل بنانے کے لئے، اپنی ذہانتیں اور اپنی توانائیاں صرف کریں، اسی کے ساتھ میں آپ کی اس مہمان نوازی اور آپ کی اس ہمت افزائی کا بھی حق سمجھتا تھا اور اس کا فرض سمجھتا تھا کہ آپ کے سامنے اپنے ضمیر کے مطابق ہی نہیں بلکہ اس عظیم الشان درسگاہ کے بانی کی توقعات ان کی امیدوں، ان کے خیالات کی ترجمانی کا کسی درجہ میں فرض ادا کروں، کس طرح میں شکریہ ادا کرسکوں گا، اس سپاس نامہ کا اور اس نظم ونثر کا جو میری حقیر ذات کے بارے میں کہی گئیں اور پڑھی گئیں۔

اس کا شکریہ یہ ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ یہاں سے ملت کے وہ جواہر پارے، ملت کے وہ لعل وگوہر نکلیں جو صرف اپنے محلوں کو، اپنے قصبات ہی کو نہیں بلکہ ہندوستان کو چمکادیں،

جس کی روشنی باہر تک پہنچے، میں امید کرتا ہوں کہ میری اس حقیر گذارش کو اپنے بلند ذہن میں علمی اور تعمیری ذہن میں جگہ دیں گے اور اب یونیورسٹی کا رخ اس طرح ہوگا کہ اس ملک کو موجودہ امتحانات ومشکلات سے نکالنے کے لئے وہ افراد پیدا کرے جو اس ملک کو صحیح راستے پر لگائیں اور یہی وہ کردار ہے اور یہی وہ میدان ہے جس کو مولانا محمد علی جوہرؒ نے تحریک خلافت کے علمبرداروں نے یہاں سے نکلنے والے فاضل اور گریجویٹس اور اسکالرز نے انجام دیا۔

مجھے معاف کیا جائے کچھ عرصہ سے اس میں تھوڑا سا تعطل پیدا ہو گیا ہے، اس تعطل کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہی یونیورسٹی کے موجودہ ذمہ داروں کی سب سے بڑی کامیابی اور کارنامہ ہوگا کہ یونیورسٹی کا رخ اب پھر اس طرف پھیریں جس رخ پر سرسید علیہ الرحمہ اس کو چلانا چاہتے تھے، جس ماحول میں وہ افراد نکلے جنھوں نے دنیا میں ہندوستان کا نام پیدا کیا، اور وہ تحریکیں چلائیں جنھوں نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا، سیاسی، ذہنی، شعوری نقشہ بدل دیا، ان ہی الفاظ کے ساتھ پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں بالکل توقع نہیں تھی کہ مجھے اس امتحان سے بھی گذرنا پڑے گا، یونیورسٹی کی رعایت سے کہتا ہوں کہ یہ میرے لئے ایک امتحان ہے، یہ خیال کیا کہ خواہ میں آپ کے یہاں زیادہ نمبر پانے کا مستحق نہ ہوں لیکن خدا اور رسول کے یہاں مجھ سے یہ سوال نہ ہو کہ خدا نے تم کو ایک زریں موقع دیا تھا، تم نے وہاں کوتاہی کی، وہاں حق بات نہیں کہی، ساتھ ہی ساتھ آپ سے معافی بھی چاہتا ہوں اور آپ کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔

وما علینا الا البلاغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذاتی تعلق، ذاتی محنت اور جذبہ خدا طلبی

۲۵ رجب ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۰ نومبر ۱۹۶۵ء بعد نماز ظہر جمالیہ ہال میں طلبائے دار العلوم کی طرف سے فارغ ہونے والے طلبہ کے اعزاز میں الوداعی جلسہ منعقد ہوا، جس میں جانے والے طلبہ نے اپنے تاثرات پیش کیے، آخر میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مختصر طور پر چند کلمات ارشاد فرمائے۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد اعبده ورسوله الذى ارسله الله تعالىٰ بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجامنيرا .

قدیم رسم:

عزیز طلباء! مشرقی تہذیب میں بہت قدیم زمانہ سے یہ رسم چلی آرہی ہے کہ جب کوئی شخص کسی دور دراز سفر پر روانہ ہوتا ہے، یا ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے، تو اس وقت اپنے کسی بڑے مخلص یا تجربہ کار سے کچھ نصیحتیں اور کچھ وصیتیں سننا چاہتا ہے، جو اس نے اپنی زندگی کے تجربات سے حاصل کی ہیں، اس لحاظ سے اس وقت آپ کی یہ خواہش درست اور صحیح ہے۔ میں ہوتا یا میری جگہ پر کوئی اور شخص اور وہ آپ کو اس موقع پر کچھ ایسی باتیں بتاتا جن کو اپنا کر آپ کامیابی کی منزل کی طرف بڑھ سکتے اور آئندہ زندگی میں لائحہ عمل کے طور پر کام میں لاتے تو یہ عین مناسب بات تھی، لیکن میرے عزیزو! آج میں اپنی ان عزیزوں سے کیا کہوں اور کن کن چیزوں کی طرف توجہ دلاؤں، بہر حال اس وقت میں مختصر طور پر کچھ کہوں گا، اگرچہ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ "بسم اللہ......" کو نکال کر سوئے ادب سے بچنے کے لئے شروع میں ۷۸۶ کا عدد لکھ دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ جو برکت بسم اللہ کے اندر ہی، وہ ۷۸۶ سے نہیں حاصل ہو سکتی،

اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ پوری کتاب سے چند سطریں لکھ دی جائیں اور اس کو مختصر کر کے پیش کر دیا جائے، لیکن جس طرح سے میں نے ابھی عرض کیا کہ بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ کا عدد نہیں لے سکتا، اسی طرح سے کتاب اور مضمون کی جگہ اس کی چند سطریں نہیں لے سکتی ہیں، پھر بھی مختصر میں تین باتیں کہوں گا کہ اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو ان کو لوح دل پر ثبت کر لیں اور دل ودماغ کے امانت خانہ میں اچھی طرح محفوظ کر لیں، اس سلسلے میں انسان کے لئے جو سب سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ قابل اعتماد چیز ہو سکتی ہے، وہ اس کے ذاتی تجربات ہوتے ہیں جن میں کم سے کم شبہ کا امکان ہوتا ہے، اس لئے اس وقت میں خود اپنے ہی تجربات آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

ذاتی تعلق:

پہلی چیز وہ ذاتی تعلق ہے، جو مجھے اپنے اساتذہ سے ہمیشہ رہا، وہ تعلق نہیں جو ضابطہ کی خانہ پری کے لئے ہو، بلکہ وہ تعلق جو شب وروز کا تھا، اس تعلق کو میرے مخلص اساتذہ بھی محسوس کرتے تھے اور میں بھی اس کو محسوس کرتا تھا، یہ وہ پہلی چیز ہے، جس نے مجھے بہت نفع پہنچایا اور میں نے جو کچھ حاصل کیا وہ اسی کا صلہ ہے، خوش قسمتی سے میری تعلیم کا نظام کچھ ایسا رہا کہ اساتذہ کی تعداد کم تھی، اور اس کی وجہ سے ان کی قدر کرنے اور ان سے خصوصی تعلق رکھنے کے مواقع زیادہ تھے۔

ایک طالب علم کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کا رجحان جس فن کی طرف ہو، اس کے ماہر اور متخصص کے پاس رہ کر اس سے وہ اپنی صلاحیت کے مطابق استفادہ کرے، بغیر اس ربط کے وہ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اگر آپ ادیب بننا چاہتے ہیں تو اس کی پیروی کریں، جس کا ادب آپ کے لئے زیادہ نفع بخش اور مفید ہو، اسی طریقہ سے اگر آپ کو تفسیر یا کسی اور فن سے لگاؤ ہے تو اس کے ماہر استاذ سے اپنا خصوصی ربط قائم رکھیں، اب آپ کے سامنے میں وہ چند باتیں پیش کرتا ہوں، جن کی رہنمائی اور روشنی میں آپ اپنے سفر زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنے زندگی کے لئے ایک شخصیت کا انتخاب کر لیں، یہ حقیقت ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی مخلص بندہ آپ کو کہیں مل جائے تو آپ اس کو اپنا رہنما مان کر اپنی زندگی کی نئی تعمیر شروع کریں، اس میں

آپ کو پورا پورا اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اور جہاں چاہیں ایشیا یا ایشیا سے باہر دنیا کے کسی گوشہ میں آپ اس کو دریافت کرلیں، بلکہ میں آگے بڑھ کر یہاں تک کہتا ہوں کہ زندوں میں آپ کو کوئی ایسا نظر نہ آئے تو ماضی کی شخصیتوں میں اس کی تلاش کیجئے اور جہاں کہیں یہ بندۂ خدا آپ کو ملے، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیجئے اور کچھ دنوں تک اس کی ہر چیز کو اپنے اندر منتقل کرنے کی کوشش کیجئے۔ انسان میں یہ صفت بہت نمایاں طور پر ہے کہ وہ جس چیز کو چاہتا ہے، اس کو نقل کرلیتا ہے، آپ اس کی ہر چیز کی نقل اتاریئے اس کے بعد آپ بڑے ہو سکتے ہیں، آپ اس سے آگے بھی نکل سکتے ہیں، اور ایسی جگہ بھی پہنچ سکتے ہیں، جہاں آپ کو اس تعلق کی ضرورت نہ ہوگی، اگرچہ یہ بات بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔

ذاتی محنت:

دوسری بات جو آپ سے کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ تاریخ کی شخصیتوں میں سے جس کا بھی نام لیں، جب آپ اس کی سیرت کا مطالعہ کریں گے، اس کی زندگی کی تہہ تک جانے کی کوشش کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے والی سب سے اہم اور بنیادی چیز اس کی ذاتی محنت، اس کی فکر و لگن، مقصد کی دھن اور اس کی تڑپ تھی، اس کے بغیر اگر اساتذہ چاہیں یا عظیم الشان ادارے اس کے لئے کوشش کریں، کسی کے بس میں کچھ نہیں ہے، جو بھی بنا ہے، وہ اپنی ذاتی محنت اور جدوجہد سے بنا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اساتذہ کی رہنمائی بھی ضروری ہے، لیکن اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہے تو پھر اپنی ذاتی محنت سے انسان اپنے آپ کو سب کچھ بنا سکتا ہے۔

جذبۂ خدا طلبی:

تیسری بات جو آپ سے کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت اس چیز کی فکر کرنی چاہئے، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، اور جو چیز اس کو حقیقت میں کام آنے والی ہے، وہ آخرت کی فکر، خدا کی مرضی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا شوق اور جذبہ ہے۔ اگر انسان کے اندر یہ چیز نہیں ہے تو خواہ وہ بڑے سے بڑا ادیب ہو، بہت بڑا مقرر و خطیب ہو، یا بہت بڑا مفسر و فقیہ ہو، اس دولت سے محروم ہی رہے گا، یہ ممکن ہے تھوڑی دیر کے لئے کچھ واہ واہ اور کچھ

ناموری اور کچھ داد و تحسین حاصل کر لے مگر آگے اس کا کچھ حصہ نہیں، حقیقت میں جو چیز کام آنے والی ہے، وہ خشیت الٰہی ہے، وہ آخرت کی فکر ہے وہ اللہ کی مرضی کی تلاش ہے۔ ایک مرتبہ مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ نے ایک طالب علم سے پوچھا تم کیا پڑھتے ہو؟

عرض کیا ''قاضی مبارک''۔

ارشاد ہوا ''استغفر اللہ'' ''نعوذ باللہ! قاضی مبارک پڑھتے ہو، اس سے حاصل؟

ہم نے فرض کیا کہ تم منطق پڑھ کر قاضی مبارک کے مثل ہو گئے، پھر کیا؟ قاضی مبارک کی قبر پر جا کر دیکھو کیا حال ہے، اور ایک بے علم کی قبر پر جاؤ جس کو خدا سے نسبت تھی اس پر کیسے انوار و برکات ہیں۔

میں نے مانا کہ آپ بڑے ادیب و انشاء پرداز بن جائیں (اگرچہ میں اس کا پرزور داعی ہوں اور میں نے اس سے بہت کام لیا ہے) لیکن یہ سب چیزیں اسی وقت کام آسکتی ہے، جب ان سے مطلوب رضائے الٰہی ہو۔

لہٰذا میرے عزیزو! ہر چیز پر اس کو مقدم رکھیں اور اسی کو اپنا مقصد حیات بنائیں۔

(۲۲/ نومبر ۶۵ء کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ ثانویہ کے انعامی جلسہ میں بچوں کو جو نصیحت کی وہ بھی مختصراً درج ذیل ہے۔)

میرے عزیزو! آج تم کو دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے، ایسی ہی جیسے کسی خاندان کے بڑے یا بزرگ کو اپنے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں، اور سب سے بڑی مبارک باد اس پر کہ تم نے محنت کر کے انعامات کا استحقاق پیدا کیا اور تمہارے اساتذہ اور تمہارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے تم کو اس کا اہل سمجھا، ان انعامات کی قیمت بازار میں کچھ زیادہ نہیں ہے جو تم کو کتابوں اور دوسری چیزوں کی صورت میں ملے ہیں، بلکہ اس لحاظ سے انعامات بہت قیمتی ہیں کہ اس وقت جب کہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں یہ کہہ کر دیئے جا رہے ہیں کہ ہمارے ان بچوں نے مختلف چیزوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

آج مجھے افسوس ہوتا ہے کہ جو چیزیں ہم نے اپنے بچپن میں بطور انعام حاصل کیں وہ بچپن کی بے خیالی میں ضائع ہو گئیں، اب میں تم کو نصیحت بلکہ وصیت کرتا ہوں کہ ان کو بہت اچھی طرح اور حفاظت سے رکھنا، آج میں نے تمہاری تقریریں سنیں اور تمہاری تقریریں ریکارڈ

کی گئی ہیں، یہ تقریریں تمہاری عمر اور تمہاری استعداد کے لحاظ سے بڑی غنیمت اور بہت اچھی ہیں، اور ایک اچھے مستقبل کی پیشن گوئی کرتی ہیں، مگر جی یہ چاہتا ہے کہ یہ تقریریں اور زیادہ بے تکلف اور سادہ ہوں، کیونکہ اچھی تقریر وہی ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ سادہ اور بے تکلف ہو، یقیناً تمہاری تقریریں قابل مبارکباد ہیں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمہارے اساتذہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہیں، اب چند باتیں تم سے کہنا چاہتا ہوں جو تمہارے کرنے کی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسان جو کچھ بچپن میں سوچتا ہے بعینہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی موقع پر پورا کردیتا ہے، لہذا جو خیال کرو یا جو آرزو تمنا کرو بہت سوچ سمجھ کر کرو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں افسوس کرنا پڑے، یہ بڑے تجربہ کی بات ہے۔ بچپن کا خیال حقیقت بن کر سامنے آتا ہے، ابھی سے تم یہ ارادہ کرو کہ تم اسلام کا نام روشن کروگے، اللہ کا پیغام پہنچاؤ گے، اسلام کے سچے اور مخلص داعی بنوگے، ایسا نہ سوچو بعض بچے سوچتے ہیں کہ ہم ٹی ٹی آئی بنیں گے اور مفت سفر کیا کریں گے، یا ہم تھانیدار یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں، یہ بات بری نہیں ہیں، بلکہ تم کو اس سے بھی اونچا سوچنا چاہئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ٹی ٹی آئی کے بجائے گارڈ بننے کے لئے سوچنے لگو یا تھانیدار کے بجائے ایس پی بلکہ اللہ تعالیٰ کو بچپن کی معصومیت اتنی پسند ہے کہ اس وقت بچہ جو سوچتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرتا ہے، تم اونچے سے اونچا ارادہ کرو اور اچھی سے اچھی آرزو کرو کہ اللہ نے جو پیغمبروں سے کام لیا وہ ہم کریں گے، اللہ کے ولی اور دوست بنیں گے، ہم بہت بڑے عالم و فاضل بنیں گے اور اللہ کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں گے، دیکھو انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ سب کچھ بن سکتا ہے، فرشتہ بلکہ فرشتہ سے بھی بڑھ سکتا ہے، اس لئے کہ انسان میں بہت سی وہ صلاحیتیں ہیں جو فرشتوں میں نہیں ہیں، جب معاملہ یہ ہے کہ آدمی بہت کچھ بن سکتا ہے اور بہت بڑا بن سکتا ہے تو تم چھوٹی اور گری پڑی آرزوئیں کیوں کرو، تم ہمیشہ یہ آرزو کرو کہ اللہ ہمیں اپنے دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور تم سے وہ کام لے جس کی زمانہ کو ضرورت ہے، ہماری آرزو اور ہماری تمنا اور خواہش تم سے یہی ہے۔

شوق ترا اگر نہ ہو، میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

وما علینا الا البلاغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج نبوت محمدی ﷺ پر الحاد و دہریت کا حملہ ہے کوئی شاہین ہے جو اس کے مقابلہ کی سعادت حاصل کرے؟

۳ جولائی ۱۹۶۶ء کو سلیمانیہ ہال میں طلبائے دارالعلوم کے سامنے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک اہم تقریر کی جو مسلسل دو گھنٹے تک جاری رہی اور ریکارڈ بھی کی گئی، بعد میں شفیق رائے بریلوی نے اس کو قلم بند کیا۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبا لله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد اعبده ورسوله الذى ارسله الله تعالى بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجامنيرا.

طلبہ کی دو قسمیں:

میرے عزیزو! بغیر کسی تکلف وتمہید کے میں تمہارے سامنے چند باتیں رکھنا چاہتا ہوں، عزیزوں سے کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، خاندان میں تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے تصنع برتتا ہو یا چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے بات کرنے میں تکلف وتمہید اختیار کرتا ہو۔

جو لوگ یہاں آئے ہیں اور پڑھ رہے ہیں، ان کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں، ایک قسم تو ان بھائیوں اور عزیزوں کی ہے جو ماں باپ کے اصرار اور تقاضہ سے یا اس تعلق سے مجبور ہو کر جو اس معاشرہ میں والدین کا اولاد سے ہوا کرتا ہے، یہاں آئے ہیں، یعنی یہ کہ ہمارا انکار جو تعلق ہے وہ اس بناء پر ہے کہ وہ ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں یہاں آئے ہیں، ان کی یہاں آنے کی نہ تو خواہش تھی اور نہ ان کے نزدیک اس کا کوئی فائدہ تھا، چنانچہ یہاں آنے کے بعد بجائے اس کے یہاں ان کے دل میں اطمینان کی فضا قائم ہوتی، وہ اپنے والدین کے شکر گزار ہوتے اور

ان کی خیر خواہی کے قائل ہو جاتے کہ انہوں نے بہت صحیح جگہ کا انتخاب کیا اور ان کی زندگی کے لئے اچھا راستہ تجویز کیا، ان کے اندر مزید کشمکش پیدا ہوگئی ہے، اب یہ کسی وجہ سے بھی ہو، میں ان کے اسباب نہیں بیان کروں گا، یہاں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں، ان کے علاج کی ضرورت ہے۔

ان کو یہاں آ کر روز بروز یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کو فائدہ یہاں حاصل نہیں ہو رہا ہے، ان کے والدین غالباً یہاں کے حالات سے واقف نہ تھے، اور یہاں کی افادیت کا پوری طرح اندازہ انہیں نہیں تھا، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جتنا زیادہ یہاں قیام رہے گا اتنا ہی ہمارا وقت گزرتا جائے گا، اور کچھ حاصل نہ ہوگا، کوئی خاص چیز یہاں سے ہم لے کر نہیں جائیں گے اور ہمیں برباد کیا جا رہا ہے، مجھے اس پر تعجب نہیں کہ عربی مدرسہ میں ایسے لوگوں کی بھی کوئی قسم ہو سکتی ہے، اس لئے کہ واقعات کی دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں، جن کو ہم پسند نہیں کرتے، یہ بالکل ممکن ہے کہ اچھے لوگ بھی جو بہت سعید اور صالح ہوں، اور بعد میں جا کر بہت ترقی کریں، علمی ترقی کریں، دینی ترقی کریں، اولیاء اللہ بن جائیں، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ جب تک ان کے دل کو اطمینان حاصل نہیں ہے، وہ کشمکش میں مبتلا رہیں، اور اس قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہیں جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہے، اور کسی وقت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

ان سے مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے فیصلہ میں بالکل آزاد ہیں، وہ اگر یہاں آ کر بھی مطمئن نہیں ہوئے، اگر وہ یہاں کے نظام کے ساتھ، یہاں کے قواعد، قوانین، ضوابط اور یہاں کی فضا کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کر سکتے، اور اس کے ساتھ خوشدلی کے ساتھ نہیں رہ سکتے، انہیں یہاں الجھن ہے، اور دن رات ان کو یہ الجھن ستاتی ہے، اور یہ ان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے تو میں ان سے بہت ہی آزادی کے ساتھ، خلوص اور صاف دلی کے ساتھ کہوں گا کہ وہ طلباء ہمت اور اخلاقی جرأت سے کام لیں۔ اخلاقی جرأت سے بہت مدد ملتی ہے، اس سے لوگوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں، اس سے بڑے بڑے فیصلے صادر ہو چکے ہیں، اور وہ اپنے فیصلہ میں آزاد ہیں، وہ اپنے والدین کو صاف صاف لکھ سکتے ہیں کہ یہاں آ کر ہمیں اطمینان حاصل نہیں ہوا، ہم یہاں آ کر کوئی فائدہ حاصل نہیں کر رہے ہیں اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے، آپ بڑے مغالطہ میں مبتلا ہیں اور خود کو دھوکہ میں رکھے ہوئے ہیں،

آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم یہاں بڑی محنت سے پڑھ رہے ہیں، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، کس وجہ سے؟ یہ ہم آ کر بیان کریں گے، یا پھر کسی موقعہ پر ذکر کریں گے۔ بہر حال حقیقت یہی ہے کہ یہاں ہمارا دل نہیں لگ رہا ہے، یہاں ہمیں کوئی فائدہ محسوس نہیں ہو رہا ہے، ان بھائیوں سے تو یہ کہنا تھا کہ وہ فیصلہ کرلیں، ہمیں انشاء اللہ ان سے نہ کوئی شکایت پیدا ہوگی، اور نہ آئندہ ہمارے ان کے تعلق میں انشاء اللہ کوئی فرق واقع ہوگا، اور نہ ہم ان کے لئے خدانخواستہ کوئی بات زبان سے نکالیں گے۔

ہماری طرف سے اجازت ہے کہ وہ بخوشی اپنے گھر جائیں، والدین کے سامنے ذرا جرأت و ہمت سے پوری بات رکھ دیں کہ آپ نے ہمیں جس دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پانے کے لئے بھیجا تھا، وہاں جا کر ہم مطمئن نہیں ہوئے، ہمارے لئے آپ کوئی دوسرا راستہ تجویز کیجئے۔

دوسری قسم:

اب دوسری قسم وہ ہے جو یہاں آنے کے بعد یا یہاں آنے سے پہلے یہاں سے مطمئن ہوگئی ہے، اور جو یہ سمجھتی ہے کہ ہم مدرسہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں زریں موقع عطا کیا ہے، علوم دینی میں مہارت پیدا کرنے کے لئے دین کے مطالب کو اور اس کے مقاصد کو سمجھنے کے لئے، اس کے حقائق و معارف کو جاننے اور ان کے اندر تعمق پیدا کرنے کے لئے اللہ نے بہت اچھا موقعہ عنایت فرمایا، اس کے تمام سامان یہاں مہیا ہیں، تمام ضروری شرائط جو اس کے لئے ضروری ہیں، یہاں موجود ہیں، جن لوگوں کا کسی درجہ میں اس پر اعتقاد ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دارالعلوم کی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور علوم دینیہ میں کمال حاصل کر سکتے ہیں اور یہاں ہم ان مضامین میں جو پڑھائے جاتے ہیں، اچھی سمجھ اور اعلیٰ دستگاہ پیدا کر سکتے ہیں، اور بہت سے پہلے اپنے لئے سوال ہے **"قوا انفسکم وھلیکم نارا"** اور ہر شخص اپنا ذمہ دار ہے۔ **"لاتزروا زرۃ وزرا اخریٰ"** اس کے بعد اپنے اپنے والدین کے لئے خاندان کے لئے بستی کے لئے پھر اللہ اگر ہمت و توفیق دے تو اپنے صوبے کے لئے اور توفیق وصلاحیت مزید عطا کرے تو ملک کے لئے اور اگر اللہ تعالیٰ اس سے بڑا حوصلہ اور ظرف عطا فرمائے تو پوری انسانیت کے لئے مفید ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف یہ کہ ہم کو

اللہ کا راستہ معلوم ہو جائے بلکہ ہم اس راستہ کی طرف دوسروں کو بلانے کی بھی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نبوت (ﷺ) کی نیابت ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ دولت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے مخصوص بندوں کو جن سے وہ امامت اور ہدایت کا کام لیتا ہے، ملتی ہے۔ ارشاد ہے "وجعلنا هم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا وكانوا بآياتنا يوقنون" (ہم نے ان کو پیشوا بنایا، امامت کا منصب عطا کیا کہ ہمارے حکم سے وہ دوسروں کو بھی ہدایت کرتے ہیں) جو یہ سمجھتے ہیں کہ صلاحیت وتوفیق جس کسی کو نصیب ہو جاتی ہے، اس سے سو آدمی، ایک ہزار اور ایک لاکھ آدمی اور اللہ تعالیٰ کی فیاضی اور شان کریمی سے کچھ بعید نہیں کہ لاکھوں اور کروڑوں آدمی ہدایت پاتے ہیں اس کے نامہ اعمال میں لاکھوں اور کروڑوں آدمی لکھتے جاتے ہیں، جیسا کہ خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے ہیں، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، آج ساری دنیائے اسلام میں جتنے مسلمان ہیں، ان میں سے بہت تھوڑی تعداد مستثنیٰ کر کے تمام مسلمان چار مسلکوں میں بٹے ہوئے ہیں، مسلک حنفی، مسلک شافعی، مسلک مالکی اور مسلک حنبلی!

اب آپ یہ دیکھئے کہ ایک ایک کے حساب میں کتنے لوگ آئے، کروڑوں انسان ایک ایک امام کے حساب میں لکھے گئے، اگر ان کے اس زمانہ سے جس وقت انہوں نے مسائل کا استنباط کیا، اور لوگوں نے اس سے فائدہ حاصل کرنا شروع کیا، اس وقت تک جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں کتنے کروڑ بلکہ کتنے ارب انسان لکھے گئے اور یہ بھی تو دیکھو کہ کس خانہ میں لکھے گئے؟ نماز کی فرد میں لکھے گئے، روزہ کی فرد میں لکھے گئے، زکوٰۃ کی فرد میں لکھے گئے، ارکان اربعہ کی فرد میں لکھے گئے۔ ائمہ اربعہؒ کی فہرست میں جو لوگ لکھے گئے، کس کس عنوان کے ماتحت ان کا اندراج ہوا، کتنی نمازیں ان کے حساب میں آئیں، اربوں انسانوں کے اعمال خیر ان کے نامہ اعمال میں لکھے گئے، آج ابھی ظہر کی نماز آپ پڑھیں گے، یقین کیجئے اس بات پر کہ اس کا ثواب امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ کی روح کو پہنچے گا، اس میں ذرا بھی کلام نہیں، قرآن اس پر شاہد! حدیث اس پر شاہد! فقہ اس پر شاہد! اور تمہارے سامنے یہ علماء

بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے پوچھو کہ کیا اس کا ثواب امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ کو نہیں پہنچا؟ کیا اس کا ثواب امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ کو نہیں پہنچا؟ جن کے مسئلہ کے مطابق تم نے اپنی نمازیں درست طریقہ پر ادا کیں، جن کی محنت و استنباط کے نتیجے میں تم میں سے کسی نے اپنی نماز میں دعائے قنوت پڑھی اور کسی نے چھوڑ دی، ان کو بھی ثواب ملا اور تم کو بھی ثواب ملا۔

کیا کوئی اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے، ان کے اجر و ثواب کا؟ آج کون ریاضی داں ہے، جو ان ائمہ اربعہ اور ان محدثین کرام اور ان فقہائے عظام اور ان مشائخ کبار کے ثواب کا حساب جوڑ سکے، اور اس کی کوئی میزان متعین کر سکے، کیا کسی کو بھی یہ قابلیت ہے کہ امام شافعیؒ، امام غزالی کے ثواب کا حساب جوڑ سکے؟ امام ابوحنیفہؒ کے ثواب اسیدنا عبدالقادر جیلانی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہؒ کے ثواب کی میزان مرتب کر سکے؟ کسی میں ہمت نہیں! یہ وہ جگہ ہے جہاں یورپ کی ساری مشینیں عاجز ہیں، اور ساری دوربینیں عاجز ہیں اور یورپ کے سارے سائنٹسٹ اور ریاضی داں عاجز ہیں۔

عصر حاضر کے فتنے:

میرے عزیزو! خوش قسمتی سے تمہارا تعلق اسی قسم سے ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ ہم عربی مدرسہ میں کیوں آئے؟ یہاں آنے کا کیا فائدہ ہے؟ جس کو یہ اطمینان ہے (خواہ کسی بھی درجہ میں سہی) کہ ہم یہاں رہ کر ان اماموں کی صف میں تو نہیں (کہ اس کی کوئی جرأت نہیں کرسکتا) اس کے خادموں اور کفش برداروں کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں، لیکن اللہ کے احکام جود و سخا میں کوئی فرق نہیں، ان کا فرمان اور اعلان ہے (كلا نمد هؤلآء وهؤلآء من عطآء ربك وما كان عطاء ربك محظورا) وہ پھر کوئی نیا امام پیدا کر دے تو وہ اس پر قادر ہے، اور اگر پھر کسی کو ہدایت کا وہی ثواب عطا کرنے لگے اور وہی کام لے تو بالکل ممکن ہے!

آج کتنے بڑے بڑے فتنے ہیں، جو اس وقت جہنم کے شعلوں کی مانند بھڑک رہے ہیں اور پورے پورے اسلامی ملکوں کو جلا کر خاکستر کر دینا چاہتے ہیں، اور صحابہ کرامؓ کے کارناموں پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں۔

آج قسم قسم کے اسلام سوز، ایمان سوز، اخلاق سوز، انسانیت سوز فتنے ابھر رہے ہیں،

مادیت، الحاد، قوم پرستی، نبوت محمدی ﷺ سے آنکھیں ملانے کے لئے تیار ہے، آج مسلیمہ کذاب نئے نئے روپ میں آرہا ہے اور نبوت محمدی کو چیلنج کر رہا ہے۔

آج رسول اللہ ﷺ کے سرمایہ پر ڈاکہ ڈال رہا ہے، آپ کے قلعہ میں شگاف پیدا کئے جارہے ہیں، آپ کے دار السلطنت پر حملہ کیا جارہا ہے، اگر آج امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ ہوتے تو یقین کرتا ہوں کہ شاید وہ فقہ کی تدوین بھی تھوڑی دیر کے لئے روک دیتے اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کرتے، تم خوش قسمت ہو کہ فقہ حنفی، فقہ شافعی کی تدوین کی خدمت تمہارے ذمہ نہیں ہے، اللہ کی حکمت بالغہ اور اس کی قدرت کاملہ نے اس کے لئے پہلے ہی انتظام کر دیا، اور امت کو امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ جیسے ائمہ عطا کئے، جب کہ ایک لمحہ اور ایک منٹ کی تاخیر کی گنجائش نہیں تھی، تم خوش قسمت ہو، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، آج تمہارے لئے کام کے دوسرے میدان ہیں، آج تمہارے لئے الحاد سے پنجہ آزمائی کا موقعہ ہے۔

تمہارے لئے الحاد اور مادیت سے آنکھ ملانے کا موقع ہے، یقین مانو کہ اس سے امام حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ وامام احمدؒ کی روح نہیں۔ محمد عربی ﷺ کی روح خوش ہوگی، آج کب سے یہ صدائیں لگ رہی ہیں کہ:

گوئے توفیق و سعادت درمیان افگندہ اند
کس بہ میداں در نمی آید سواراں راچہ شد

تمہارا میدان:

آج عالم اسلام کی نگاہیں ان درسگاہوں کی طرف لگی ہوئی ہیں، جو ان باتوں کو سمجھنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتی ہیں، جن کے بانیوں نے اپنے نصاب ونظام میں اس کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ جب عصر حاضر کا کوئی نیا فتنہ پیدا ہو تو ہمارے فضلاء اس کو سمجھ سکیں اور اس کا مقابلہ کرسکیں۔

نبوت محمدی ﷺ پر الحاد و دہریت کا حملہ:

میرے عزیزو! تمہارے لئے کام کے کتنے وسیع میدان ہیں، اور ان میدانوں میں تھوڑی

سی محنت سے آج کیا کچھ مل سکتا ہے، اس لئے جن لوگوں کو یہاں کا قیام عزیز ہو، یہاں کا نظام عزیز ہو، نصاب عزیز ہو، جن کو یہاں کی تعلیم و تربیت اس لئے عزیز ہو کہ نئے خالدؓ اور نئے ابوعبیدہؓ پیدا ہوں، اللہ کی لاکھوں اور کروڑوں رحمتیں ہوں، ان کی پاک روحوں پر لیکن ان کی بے چین روحیں زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ قیامت تک نہیں پیدا ہو سکتے، ہم نے تلوار چلانے اور گردن کٹانے میں ایک لمحہ کا تامل نہیں کیا، ہم نے اپنا کام ختم کرلیا، لیکن آج سر کٹانے اور کاٹنے کی ضرورت نہیں، آج تو باطل سے آنکھیں ملانے کی ضرورت ہے، آج نبوت محمدی ﷺ پر تلواروں کا حملہ نہیں، دلیلوں کا حملہ ہے، مادیت کا حملہ ہے، قوم پرستی کا حملہ ہے، ہمارے جو عزیز طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں رہ کر اس سلسلہ میں کچھ کیا جا سکتا ہے، ان کے لئے یہ سعادت مقدر ہے، وہ اس میں حصہ لے کر ان ابرار و اخیار اور ان شہداء و اتقیا کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دعوت کا ایک ایسا میدان ہے، کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی اس حکمت کی بناء پر جس کا راز کوئی نہیں جانتا۔ اس زمانہ کے پست ہمتوں کے لئے مقدر کیا ہے کہ اس میں تھوڑی سی محنت سے تم بہت کچھ پا سکتے ہو (**من احی سنتی عند فساد امتی فلہ اجر مأۃ شھید**) کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سنت کونسی ہے، بے شک اگر کوئی ایک سنت زندہ کرے گا تو سو شہیدوں کا اجر پائے گا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ''سنتی'' میں سنت کی اضافت جو آپ ﷺ نے اپنی طرف کی ہے، اس کے معنی ہیں میرا چلن، میرا طریقہ، میرا دین اور میرا مسلک، اب ذرا غور کرو کہ رسول اللہ ﷺ جو دین لے کر آئے اس کی دعوت پر جو آج حملے ہو رہے ہیں، ان کے مقابلہ کے لئے اگر کوئی سر بکف ہو کر میدان میں اتر آئے اور ان حملوں کے لئے سپر بن جائے تو اس کا مقام کیا ہوگا، یہ مدرسہ جس کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، یہاں کی ناتمام عمارتیں، یہاں کی متواضع اور خاکسار اساتذہ، یہاں کی بے سروسامانیاں اور یہاں کی بہت سی خامیاں اور یہ کھانے کی خرابیاں ''واللہ العظیم'' اسی بناء پر ہو سکتا ہے کہ یہاں سے ایسے ایسے لوگ پیدا ہوں جو حق و باطل کے معرکہ کارزار کے لئے شہسوار ہوں، اور جانباز ہوں، اور رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کو پھر سے بلند کریں، اور ملحدانہ اور مادہ پرستانہ تحریکوں اور ایمان سوز فتنوں کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کریں، جس کے لئے روح نبوی ﷺ بے چین و مضطرب ہے، اگر ایک ایسی جیتی جاگتی مثال بھی یہاں موجود ہے، اگر ایک دھڑکتا ہوا دل، ایک دیدہ بینا اور ایک گوش

شنوا یہاں حاضر ہے، اور ایک متنفس بھی ایسا ہے، جس کو اس بات کا احساس ہے کہ یہاں رہ کر یہ کام ہو سکتا ہے، جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ دن ہماری عمر، ہمارے خاندان اور ہماری بستی کی زندگی میں بلکہ ہماری اس پوری آبادی کی زندگی میں بڑا مبارک تھا، جس دن ہمارے والدین نے ہم کو دار العلوم بھیجا، ان سے ہم کہتے ہیں کہ آج وہ فیصلہ کر کے اٹھیں کہ یہاں وہ اپنے وقت کو صحیح طور سے صرف کریں گے، یہاں کے درخت سے وہ بہتر سے بہتر پھل توڑیں گے، جس کی توقع کی جا سکتی ہے، وہ یہاں کتاب وسنت کا گہرا اور عمیق علم حاصل کریں گے اور وہ زندگی گزاریں گے جو ایک داعی اور عالم ربانی کی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے۔

یکسوئی کی ضرورت:

کتنا بڑا ظلم ہے کہ لوگ ساری دنیا کے راستے بند کر کے اور ساری کشتیاں جلا کر یہاں آ کر پڑ گئے ہوں، تم یہاں رہ کر یہ معاملہ کرو کہ تمہارا ایک پاؤں یہاں رہے، اور ایک پاؤں خدا کے دشمنوں کے ساتھ، دشمنان اسلام کے قلعہ میں! جسم یہاں رہے، اور تمہارا دل باہر! تم یہاں رہو، تمہاری آنکھیں باہر رہیں، اس کی کون اجازت دے سکتا ہے؟ کوئی چھاؤنی اس کی اجازت دے سکتی ہے؟ مدرسہ بھی ایک چھاؤنی ہے؟ کوئی درسگاہ اس کی اجازت دے سکتی ہے؟ کوئی نظام اس کی اجازت دے سکتا ہے؟ اشتراکی نظام؟ سرمایہ دارانہ نظام؟ کوئی نظام اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ آدمی روس میں رہے، اور امریکہ کا خواب دیکھے یا امریکہ میں رہے اور روس کی طرف دیکھے، تو جب ان آزاد لوگوں میں جن کے لئے دنیا میں کوئی قید و بند نہیں، شراب پیو، جوا کھیلو، بدمعاشیاں کرو، جب ان کے یہاں بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے، اور اب تو اس کی بھی اجازت دینے کے لئے لوگ تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان میں رہ کر آدمی پاکستان کی طرف دیکھے تو بتاؤ ہم تمہیں کیسے اجازت دیں کہ تم یہاں رہ کر کالج کی طرف دیکھو، یونیورسٹی کی طرف دیکھو، رہو یہاں اور تیاری کرو وہاں کے لئے یہ کہاں کی دیانت داری اور کیسی تقسیم ہے؟ کہ ہم تمہارے لئے ایک ایک دانہ مانگ کر لائیں (یہ یقیناً احسان نہیں ہمارا فرض ہے) اور تم اس سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔

جو لوگ ہدایت و دعوت کا کام کریں گے ان کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

"وامر اھلک بالصلوٰۃ واصطبر علیھا لانسئلک رزقاً نحن

نرزقک والعاقبة للتقوی"

بھلا بتائیے یہاں کیا موقع تھا، "نحن نرزقک" کہنے کا؟ بڑے بڑے علماء موجود ہیں، ان سے پوچھو کہ فرمایا تو یہ جارہا ہے کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو اور پھر "لانسئلک رزقاً" ہم آپ سے رزق کے طالب نہیں!

یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ رزق کے طالب نہیں ہوتے، پھر اس کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے وسیع معنی ہیں، یعنی ہم اس کے بھی طالب نہیں کہ آپ بھی رزق کے خود کفیل اور ذمہ دار بن جائیں "نحن نرزقک" ہم اس کے ذمہ دار ہیں! آپ اس کے ذمہ دار نہیں۔ معلوم ہوا کہ امر بالصلوٰۃ اور اس پر محافظت واستقامت سے اللہ کے یہاں رزق کا استحقاق پیدا ہوجاتا ہے، جس کا مطلب یہ نکلا کہ داعی کو اللہ تبارک وتعالیٰ انشاء اللہ بے یار و مددگار اور فاقہ کش کبھی نہیں رکھے گا، بلکہ اس کے طفیل میں ہزاروں آدمی کھائیں گے، ایک شیر شکار کرتا ہے، اس کے طفیل میں سینکڑوں جنگل کے جانور کھاتے ہیں، حضرت نظام الدین اولیاء کے دستر خوان کو دیکھو، اس عہد آخر میں مظاہر علوم میں حضرت شیخ الحدیث کے دستر خوان کو دیکھو! اور جن خوش قسمتوں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دستر خوان کو دیکھا، ان سے پوچھو کہ ایک شیر شکار کرتا تھا اور کتنے جنگل کے اس کے ہم جنس کھاتے تھے۔

اللہ کی ضمانت ہے، کچھ دن تم محنت کرلو، سعید ہونہار، محنتی اور جفاکش طالب علم بن جاؤ اور اپنے اندر اخلاص پیدا کرلو، پھر اللہ کی قدرت ورحمت کا تماشا دیکھو!

ایک فیصلہ:

بس بھائی! سمجھنے والوں کے لئے اور جن کے لئے اللہ نے سعادت اور خوش بختی مقدر کی ہے، اتنا ہی بہت کافی ہے، بلکہ کافی سے بھی زیادہ ہے، لیکن آج جو کچھ آپ نے سنا ہے، اس سے فائدہ اٹھایئے اور فیصلہ کیجئے! "جانے کا فیصلہ ...... یا رہنے کا فیصلہ" جانے کا فیصلہ ہے تو شریفوں کی طرح اور انسانوں کی طرح! اور رہنے کا فیصلہ ہے تو وہ بھی شریفوں کی طرح اور جوانمردوں کی طرح، طالب علموں کی طرح، صاحب عزم اور صاحب ہمت نوجوانوں کی طرح!!

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکیزہ ذوق، علم و مطالعہ کی کنجی ہے

مولانا محمد اویسؒ صاحب نگرامی ندوی، شیخ التفسیر دارالعلوم کی تحریک اور کوشش سے دارالعلوم میں توسیعی خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا، اس سلسلے کا آغاز ۴؍مئی ۱۹۶۷ء کو ہوا، جلسہ کی صدارت جناب مولانا شاہ معین الدینؒ احمد صاحب ندوی نے فرمائی اور حضرت مولا محمد اویسؒ صاحب ندوی کی تعارفی تقریر کے بعد مفکر اسلامؒ نے اس سلسلہ کا آغاز کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

نصاب تعلیم کا دائرۂ عمل:

ہمارے نصاب تعلیم کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ یہ نصاب اپنی خوبیوں اور امتیازات کے باوجود دیگر ضروریات کو مکمل نہیں کرتا، کوئی ایسا شخص جو ذمہ دار اور حقیقت پسند ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا نصاب تعلیم زندگی کی تمام ضروریات پر حاوی ہے، ہمارا نصاب تعلیم بھی اس کا مدعی اور ضامن نہیں، نصاب تو درحقیقت اس ملکہ خاص کا ضامن ہے جو انسان کی زندگی میں قدم قدم پر رہنمائی و قیادت کا کام انجام دے سکے، وہ انسان کے اندر اتنی استعداد پیدا کر دے کہ وہ کتابوں سے فائدہ اٹھا کر نتائج اخذ کر سکے، وہ زندگی کے تمام تقاضوں اور ضروریات کی تکمیل کا ضامن نہیں ہو سکتا، قدیم نصاب تعلیم نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا، اگرچہ ہمارے نصاب میں ملکہ پیدا کرنے کی خصوصیت ہے، لیکن زندگی کے ہر مرحلے میں ہر انسان کی صحیح رہنمائی کر سکے اس کا وہ بھی مدعی نہیں، آج ماہرین تعلیم کے سامنے یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ نصاب تعلیم کے علاوہ طلباء کے لئے ایسی کیا چیز مہیا کی جائے جو زندگی اور منصب و مرتبے کے تقاضوں کو پورا کرے، اور جس ماحول میں ان تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہو اس ماحول سے صحیح رابطہ پیدا کر سکے، یہ مسئلہ مغرب کے دانشوروں سے لے کر مشرق کے عالموں تک سب کے لئے ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔

ذوق کیسے پیدا کیا جائے؟

ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ طلباء کے لئے کتب خانے مہیا کئے جائیں اور پھر اساتذہ

کتابوں کے مطالعہ میں طلباء کی رہنمائی کریں تاکہ طالب علم زندگی کے کاررواں سے بچھڑ نے نہ پائیں، اور جب وہ کسی کتاب کا مکمل مطالعہ کرلیں اوراس پر حاوی ہوجائیں تو ان کی زندگی سے اجنبیت محسوس نہ ہو، ایک راستہ یہ ہے کہ طلباء کو وقتاً فوقتاً ایسے ماہرین تعلیم اور علم وفن کے فضلاء مہیا کئے جائیں جوان کے سامنے نئے زاویئے اور نئے حقائق سے طلباء کو آشنا کریں، اس طریقے کو ہمارے ملک میں بھی آزمایا جارہا ہے، یہ سلسلہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اور مشرق وسطی کے علمی مرکزوں میں بھی رائج ہے، اور حقیقت میں یہ بات انتہائی لائق تحسین و توصیف ہے کہ مشاہیر علم وفن یہاں آکر اپنے خطبات ومقالات سے علم وتعلیم کا نچوڑ آپ کے سامنے پیش کردیں، اور آپ بھی اہل علم کی مجلسوں اور محفلوں میں شریک ہوں، کیونکہ علم وفن کا ذوق جب بھی بنتا ہے، جب اہل علم کی مجلسوں سے ربط قائم رکھا جائے، اس کے بعد انسان بہت تھوڑے مواد سے کام لے سکتا ہے، لیکن ایسا ملکہ جب ہی پیدا ہوگا جبکہ مختلف مجالس اور محافل میں شرکت کی جائے، یہ سب باتیں وہی سمجھ سکتا ہے، جو علامہ شبلی اور سید سلیمان ندویؒ کی محفلوں میں شریک ہوا ہو، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ شبلی کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے اوران کے چشمہ علم سے سیراب ہوتے رہے اوراس کی وجہ سے ان میں وہ شعور اور ذوق اور ملکہ پیدا ہوگیا، جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

ذوق کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے کوئی شعر پڑھا جائے تو آپ اپنے ادبی ذوق سے یہ بتلادیں کہ یہ فلاں شعر ہے، ایسا نہ ہو کہ آپ کے سامنے انیس و دبیر کے اشعار پڑھے جارہے ہوں اوران کو آپ غالب وذوق کی طرف منسوب کریں، یا مومن کا شعر ہو اور آپ اس کو کسی اور کا سمجھ رہے ہوں، لیکن یہ سب باتیں مختلف مجلسوں میں شرکت کے بعد پیدا ہوں گی۔

ہمارے لئے یہ بات افسوسناک ہوگی کہ ہم اس تیز رفتار دور میں طبعیات، سائنس وغیرہ کی ابتدائی معلومات سے بھی ناآشنا ہوں جو اس دور میں لازمی اور ضروری ہے، بلکہ اخبارات و رسائل کے سمجھنے کے لئے ان کا علم ناگزیر ہے۔ اس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اس قسم کی محفلوں میں شریک ہوں اور معلومات حاصل کریں۔

ایک مثال:

انسان کے ذہن میں جب مراتب کا علم نہیں ہوتا اور وہ موٹی بات نہیں جانتا تو اس حیادار

آدمی کے لئے شرفاء کی مجلس میں شریک ہونا بھی دوبھر ہو جاتا ہے، جب میں نو عمر تھا اور میں نے ''نزہۃ الخواطر'' میں مشاہیر ہند کے حالات نہیں پڑھے تھے، اس زمانے میں مولانا سلیمان اشرف صاحب کی مجلس میں شریک ہوا، اس مجلس میں مفتی یوسف صاحب کا ذکر آیا، تو اس تذکرے میں مجھ سے نہ رہا گیا، اور میں بول اٹھا کہ ''مفتی صاحب مولانا عبدالحئی صاحب کے داماد تھے'' تو مولانا سلیمان اشرف صاحب نے فوراً کہا مولوی صاحب! چپ رہو، اس وقت میری بہت سبکی ہوئی، لیکن اس سے عبرت حاصل کیجئے، کیونکہ ہو سکتا ہے اس تذکرے میں مفتی صاحب سے اور کوئی مراد ہوں، یہاں یہ سمجھئے کہ اگر آپ کے سامنے مولانا سلیمان صاحب کا تذکرہ ہو تو کون مراد ہوگا، کئی سلیمان ہیں جو علم و فضل میں بہت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اسی طرح قاضی مبارک کا تذکرہ ہو، اور کسی کو نہ معلوم ہو کہ قاضی مبارک تین ہیں، اب وہ اس محفل میں بول اٹھے تو کتنی سبکی ہوگی، اور شرم و ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں نے علماء کی چند ہی ایسی مجالس دیکھی ہیں، جہاں خالص علمی گفتگو ہوتی تھی، شروع سے آخر تک تذکرہ ہوتا تو علم ہی کا ہوتا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی کی مجلس، شاہ حلیم عطا صاحب کی مجلس اور علامہ اقبال کی مجلس، اگرچہ علامہ اقبال کی مجلس میں صرف دو مرتبہ شریک ہونے کا اتفاق ہوا، مجھے بہت خوشی ہوگی کہ اہل کمال یہاں آئیں جو اپنے جگر کو آپ کے سامنے نکال کر رکھ دیں اور علم کا نچوڑ پیش کر دیں لیکن اس کے بعد بھی اگر آپ میں کوئی تغیر نہ ہو اور آپ کی زندگی میں کوئی انقلاب نہ آئے تو یہ بہت بڑی بدنصیبی اور بدنامی کی بات ہے۔

اگر یہاں تاریخ اور علوم اسلامیہ کے ماہرین کو بلایا جائے تو میرا خیال یہ ہے کہ علوم جدیدہ کے ماہرین کو بھی دعوت دی جائے جو فزکس، طبیعات اور فلکیات وغیرہ پر آپ کے سامنے تقریر کریں۔ اسی طرح ادبی ذوق کی نشو و نما کے لئے ادیبوں اور شاعروں کو بھی دعوت دی جائے۔

...... یہ زمانہ اختصاص کا ہے، آپ کو تمام ایسی معلومات ہونی چاہئیں کہ آپ یونیورسٹی کے طلباء تو کیا اگر وہاں کے پروفیسروں کے سامنے بیٹھیں تو بے تکلفی سے گفتگو کر سکیں، اور اس کے پاس بیٹھنے میں اجنبیت یا ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں۔ ''الاصلاح'' بھی اسی لئے ہے کہ آپ کے اندر ذوقِ علم پیدا ہو اس ''الاصلاح'' کے فائدے کا بڑے بڑے لوگوں نے اقرار کیا کہ اس نے سب کچھ دیا، مولانا نے کتابوں کے مطالعے کے متعلق فرمایا کہ انتخاب بھی بہت بڑی چیز

ہے، مطالعہ کے لئے انتخاب کے ساتھ مولانا نے ان مجلسوں میں شرکت کے فائدے کو بیان کرتے ہوئے شعر پڑھا کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پھر فرمایا کہ دینی ذوق بھی اسی طرح بنتا ہے کہ آپ اہل اللہ کے پاس بیٹھیں، مولانا نے فرمایا کہ ذوق کی تشریح نہیں کی جاسکتی یہ تو خدا جس کو دیتا ہے، وہی سمجھ سکتا ہے، ہر چیز کا ایک ذوق ہوتا ہے جو صرف اہل ذوق سے پیدا ہوتا ہے، ذوق ہر چیز کا بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے، آج حیات انسانی کا ذوق مفقود ہے، صاف ستھری پاکیزہ زندگی گزارنے کا ذوق بھی مفقود ہے، امریکہ اور یورپ اپنی عروج وترقی کی منزلوں کے باوجود انسانی زندگی کا ذوق پیدا نہیں کر سکے، آج بھی وہاں مشینوں کی کثرت کے باوجود انسان کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، اور اس کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، خوب یاد رکھئے کہ یہاں جو آپ کے اساتذہ ہیں، انہیں سے آپ کا کام چلے گا، انہیں ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے آپ کا چراغ روشن ہوگا، انہیں سے آپ اپنے دل کا چراغ منور کریں گے، آپ یہ چاہیں کہ کسی اور طریقے سے یا دوسرے چراغوں سے اپنی زندگی اور دل کے چراغ روشن کرلیں تو یہ ناممکن ہے۔

اعتماد، اعتقاد اور اتحاد:

خوب سمجھ لیجئے کہ ان ہی اساتذہ کی محفلوں میں شرکت کر کے آپ صحیح ذوق وشوق پیدا کر سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اعتماد اور ایک حد تک اعتقاد اور اتحاد کے ساتھ بیٹھیں، یاد رکھئے کہ مخلص وغیرہ مخلص اچھے اور برے بلکہ انسان اور غیر انسان کا فرق سمجھنے کے لئے کہیں بھی اصول وضوابط منضبط نہیں ہوتے بلکہ بات صرف ذوق ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

آج تمام مدارس میں ایک خلا ہے اور وہ یہ کہ اساتذہ اور طلباء میں ربط نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہے، اور وہ صرف درس کے اساتذہ اور درس کے طلباء ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس خلا کو پر کر دینے کی اور اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت ہے، اس میں مدارس کی کامیابی و ترقی مضمر ہے۔

وما علینا الا البلاغ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدرسہ کیا ہے؟

یہ تقریر ۲۲ شوال ۱۳۹۶ھ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو جامعہ ہدایت جے پور کے سنگ بنیاد کے موقعہ پر کی گئی تھی

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن بن ونتوكل عليه ۔ وهو الذی ينزل الغيث من بعد ما قنطوا وينشر رحمته وهو الولی الحميد

راجستھان کا ایک یادگار دن:

جناب صدر، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب، مولانا عبدالحیٔ فائز، سید فاروق حسن صاحب وزیر اوقاف، علماء کرام، معززین راجستھان وحاضرین مجلس!

میں آپ حضرات کی اس عزت افزائی کا شکر گزار ہوں، اور اس سے محجوب اور شرمندہ بھی کہ آپ نے اس بڑے اعزاز کے لئے میری حقیر ذات کا انتخاب کیا، میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ جب میں خطبہ استقبالیہ میں اپنے متعلق بلند الفاظ سن رہا تھا تو کس قدر پانی پانی ہو رہا تھا، ایاز قدر خود راشناس، اگر آدمی اپنی حقیقت نہیں پہچانتا تو وہ کچھ نہیں پہچانتا، میں اس لحاظ سے اس نوخیز ونومولود جامعہ کی خدمت انجام دینے کی ضرور اہلیت رکھتا ہوں کہ میں ایک طالب علم ہوں، میرا ایک علمی خاندان سے تعلق ہے، اس میں کسی تواضع اور خاکساری کی ضرورت نہیں سمجھتا، اس راجستھان کے ایک مردم خیز علاقہ سے بھی۔ میرا قدیم تاریخی تعلق رہا ہے، یہ چیزیں میرے لئے ضرور سفارش کرتی ہیں، لیکن جتنا بڑا اعزاز مجھے عطا فرمایا ہے، وہ ایک بڑی قبا ہے، جو ایک حقیر جسم پر راست نہیں آتی اور جسم کی کوتاہ قامتی کا اعلان کرتی ہے اور اس کے لئے باعث شرمندگی ہے، لیکن:

بر کریماں کارہا دشوار نیست

میں اس سے زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا کہ شاید یہ بھی کسی تصنع اور بے جا خاکساری پر

محمول کیا جائے۔

خزاں رسیدہ انسانیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ:

حضرات! میں نے بھی جو آپ کے سامنے آیت پڑھی ہے، اس کا انتخاب میں نے قاری صاحب کی قرأت سے کیا ہے اور اس نے میری رہنمائی کی ہے اور قرآن مجید اسی طرح ہمیشہ رہنمائی اور مشکل کشائی کرتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے **هو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمته وهو الولی الحمید** (الشوریٰ ۲۸) اللہ وہ ہے جو بارش کو نازل فرماتا ہے، حقیقت میں غیث کا ترجمہ بارش پورا ترجمہ نہیں ہے، غیث اس چیز کو کہتے ہیں جو عین وقت پر مدد کرے، عین وقت پر مشکل کشائی کرے، فریادرسی کرے، دست گیری کرے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح کسی جاں بلب مریض کے حلق میں آب حیات کے کچھ قطرے ٹپکا دیئے جائیں، اس کو کوئی داروئے حیات مہیا کر دیا جائے، اسی طرح سے تپتی ہوئی، سلگتی ہوئی، جلتی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی زمین پر اللہ تعالیٰ آب حیات کے قطرے برسایا کرتا ہے **هو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا** وہ فریادرسی فرماتا ہے، اور زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے، انسانوں کے لئے اس کے بعد کہ وہ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں آسمان سے لگی ہوتی ہیں، وہ بڑے ارمان اور حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پانی برسا کر سوکھی کھیتی کو ہرا کردے **هو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمته وهو الولی الحمید** اور اپنی رحمت کا دامن پھیلا دیتا ہے اور اپنی رحمت کی ہوائیں چلاتا ہے اور وہ "**الولی الحمید**" ہے، یہاں پر جن صفات کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ بڑی معنی خیز ہیں، اللہ کے سب نام اچھے ہیں **وله الاسماء الحسنیٰ** اللہ کی سب صفات اعلیٰ اور بالا و برتر ہیں **وله المثل الاعلی** لیکن یہاں "**الولی الحمید**" کی صفات کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس مضمون سے اور انسانیت کی چارہ سازی اور مسیحائی سے اس کا خاص تعلق ہے۔ یہ انسانیت کس کی ہے؟ اللہ کی ہے! وہی اس کا والی اور وارث ہے، کوئی اپنی کھیتی کو سوکھا نہیں دیکھ سکتا، کوئی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی لگائی ہوئی کھیتی سوکھ جائے، وہ "الولی" ہے، وہی اس کا مالک بھی ہے "الحمید" بھی ہے، وہ حمد کا مستحق ہے، جس کی شان حمید کی ہے، جس کی صفت حمید کی ہے، اس کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو

اس طرح بے یارو مددگار چھوڑ دے۔

مرض اور مسیحائی کے درمیان اٹوٹ رشتہ:

حضرات! پیاس اور سیرابی، ضرورت اور اس کی تکمیل، مرض اور اس کی مسیحائی کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، یہ ازلی اور ابدی رشتہ ہے، جب تک پیاس ہے، سیرابی ضرور ہے، جب تک ضرورت ہے، تکمیل ضرور ہے، جب تک مرض ہے اس کے لئے دوا اور علاج کا سامان ضرور ہے، اسی طریقہ سے صحرا اور علم، صحرا اور ہدایت، ریگستان اور ہدایت کے درمیان بھی ایک ایسا مخفی، ایسا لطیف اور ایسا قدیم اور دائمی رشتہ ہے جس کی شہادت قرآن مجید سے بھی ملتی ہے، اور انسانی تجربات سے بھی ملتی ہے، آپ اس وقت کو یاد کیجئے جب ساری دنیا پر خزاں کا دور دورہ تھا، جب انسانیت کی پوری کھیتی، انبیاء کی لگائی ہوئی کھیتی اور انبیاء کی ہزاروں برس کی کوششوں پر پانی پھر رہا تھا، جب انسانیت کی یہ کھیتی سوکھ رہی تھی، جب انسانیت دم توڑ رہی تھی، اور دیکھنے والوں کو صاف نظر آ رہا تھا (اس کے لئے کسی خاص بصیرت کی بھی ضرورت نہیں تھی، معمولی بصارت بھی کافی تھی) کہ کوئی گھڑی ہے کہ ٹل رہی ہے، چند گھنٹوں، چند منٹوں میں یہ انسانیت دم توڑ دے گی اور یہ اس کا دم واپسیں ہے، اس وقت دنیا میں بڑے لہلہاتے ہوئے ملک تھے، گل و گلزار شہر تھے، وہ ملک بھی تھے جو ہزاروں برس سے تہذیب و تمدن کا مرکز چلے آ رہے تھے، جہاں علم کی ہوائیں چلتی تھیں، جہاں علم کی عطر بیزی تھی، جہاں کی زمین سے علم اگلتا تھا اور جہاں کا آسمان معلوم ہوتا ہے کہ علم برساتا تھا، لیکن سارے ممالک انانیت کی چارہ سازی اور انسانیت کی مسیحائی سے قاصر ہی نہیں تھے بلکہ باغی تھے، منکر تھے، بلکہ وہ انسانیت کے درد میں اضافہ کرنے والے تھے، آپ اگر اس وقت تک کی تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانیت جس سے فریاد کر رہی تھی، انسانیت جس کے خلاف مدعی بنی ہوئی تھی، انسانیت جس کے گریباں گیر تھی، یہ وہی بگڑا ہوا تمدن تھا، یہی منحرف علم تھا، یہ وہی شاطر عقل تھی، وہی چالاکی تھی، وہی دانشمندی تھی، جس نے غلط رخ اختیار کر لیا تھا، جس نے تعمیر کے بجائے تخریب کا رخ اختیار کر لیا تھا، اس وقت یونان بھی تھا، ایران بھی تھا اور ہمارا ملک ہندوستان بھی تھا، چھٹی صدی مسیحی یا ساتویں صدی مسیحی میں یہ ملک تہذیب و تمدن کا بڑا مرکز تھا، ان لوگوں کی طرف انسانیت کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں کہ ان کی طرف سے کوئی باد بہاری کا

جھونکا آئے، ان کی طرف سے کوئی جاں نوازی، مسیحا نفسی کی کوئی کوشش ہوگی، یونان کی طرف آنکھیں لگی ہوئی تھیں، اس نے فلسفہ دیا، لیکن وہ انسانیت کے درد کا درماں نہ تھا، ہندوستان کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں، اس نے حساب اور علم ریاضی دیا، مگر یہ انسان کے مرض کی دوا نہ تھی، ایران کی طرف اس کی نظر لگی ہوئی تھی، اس نے سپہ گری اور شاعری دی، مگر یہ بھی انسانیت کے درد کی دوا نہ تھی۔

صحرا بہار کا پیغام دیتا ہے:

اس وقت تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ صحرائے عرب سے اللہ کی رحمت کے وہ بادل اٹھے، اللہ کی رحمت کے بادل جوش میں آئے اور وہاں سے وہ موج نور چلے جو ساری دنیا کو زندہ کردے، صحرا کا انتخاب صرف اللہ تعالیٰ نے اس لئے نہیں کیا کہ وہ سب سے زیادہ محتاج تھا، اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کا یہ تماشا دکھانا تھا کہ وہ صحرا جو ایک قطرہ پانی کو ترستا ہے، ساری دنیا کو سیراب کرسکتا ہے، وہاں خدا نے کسی دانشمند اور فلسفی کو بھی نہیں پیدا کیا، صحرا کا بھی انتخاب کیا، اور صحرا کے نبی کا بھی انتخاب کیا۔ اس صحرا میں اور صحرا کے نبی میں بھی ایک لطیف رشتہ تھا اور خاص مناسبت تھی، صحراعرب کا اور نبی امّی! کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی کہ دنیا کے دانشور اس کی تاویل کرسکیں، اور کوئی علت معمول کا ایسا مخفی رشتہ تلاش کرسکیں اور اس کی ایسی تشریح کرسکیں کہ جس کو علم وفلسفہ قبول کرسکے، آپ کہہ سکیں کہ ایک عالم نے دنیا کو علم دیا اور ایک گل وگلزار ملک نے دنیا کو بہار کا پیغام دیا۔ صحرا بہار کا پیغام دیتا ہے، اور نبی امّی وہ علم عطا کرتا ہے جو علم ہی نہیں علم گر اور علماء گر ہے، وہ علم تنہا علم نہیں تھا بلکہ وہ تعلیم بھی تھا، اس میں معلم بنانے کی بھی طاقت تھی، کسی ایک شخص کو معلم نہیں پوری امت کو معلم بنانے کی اس میں صلاحیت تھی۔ صحراعرب کا سا صحرا اور پیغمبر نبی امّی جیسا پیغمبر، اللہ تعالیٰ نے یہ دکھا دیا کہ ہماری قدرت اور ہماری کارسازی اسباب کی محتاج نہیں، وہ بلاسبب اور ساری دنیا کے تجربات اور ساری دنیا کے قیاسات کے خلاف کام کرسکتی ہے، پھر کیا ہوا، اقبال سے بہتر الفراظ میں اس کو ادا نہیں کیا جاسکتا۔

از دمِ سیراب آں امّی لقب ﷺ
لالہ رست از ریگ صحرائے عرب

اس امّی لقب کے نوشیں سے آب حیات کا وہ قطرہ ٹپکا جس نے صحرائے عرب کے جگر کو

پھاڑ کر وہ پھول کھلایا جس نے ساری دنیا کو معطر کر دیا۔

ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی:

حضرات! اللہ تعالیٰ اپنی یہ نشانی ہمیشہ دکھاتا رہا ہے، اور جب سے علم کی دنیا میں پھیلنے کا اور سیرابی کا عام ہونے کا یہ سلسلہ صحرا سے شروع ہوا اس کے بعد سے صحرا اور گلزار کی کوئی قید نہیں رہی، نبی امی کا یہ معجزہ مختلف زمانوں میں، مختلف ملکوں میں، مختلف وقتوں میں، مختلف حالات میں برابر ظاہر ہوتا رہا، آپ اسی ہندوستان کو لے لیجئے، بلکہ اس صحرائے راجستھان کو لیجئے جس کو ہم پہلے راج پوتانہ کا صحرا یا ریگستان کہتے تھے، یہاں بھی جب مسلمان آئے تو انہوں نے علم کی دریا بہادیئے۔

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

انہوں نے صرف دہلی کو، صرف لاہور کو، ملتان کو یا صرف لکھنؤ اور جون کو ہی شیراز کا ہمسر نہیں بنایا بلکہ ناگور اور آخر دور میں قریبی شہر ٹونک کو بھی انہوں نے علم کا ایک مرکز بنادیا، آپ اپنے اس راجستھان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں، ہماری تاریخی بے مائیگی اور ہمارے علم کی کوتاہی ہوگی اگر ہم یہ سمجھیں کہ راجپوتانہ کا ہندوستان کی علمی تحریک اور ہندوستان کے علمی کوششوں کی تاریخ میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس نے ایک قائدانہ کردار ادا کیا ہے، دور اول میں ناگور اور دور آخر میں ٹونک نے اپنے امتیاز کا سکہ بٹھادیا، اپنے علماء کی ذہانت اور تبحر کا اور ان کے علمی شغف کا لوہا منوالیا، ناگور کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دربار اکبری کی زینت وہ فاضل نوجوان ہیں جن کو دنیا ابوالفضل اور ابوالفیضی کے نام سے جانتی ہے جو مبارک ناگوری کے بیٹے تھے اگرچہ ہمیں ان کے خیالات سے پورا اتفاق نہیں اور ان کی تاریخ پر تاریخ ہی میں بہت سے پردے پڑے ہوئے ہیں، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اب وہ خدا کے یہاں پہنچ گئے ہیں، لیکن جہاں تک ان کے تبحر علمی، ان کے علمی تفنن اور ان کی ذہانت کا تعلق ہے، جہاں تک فیضی کی شاعری اور ابوالفضل کے زور قلم اور تاریخ نویسی کا تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، آخری دور میں جب ٹونک میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم ہوئی تو ہمارا قریب کا یہ شہر جس کو شاید راجستھان کے باہر بہت کم لوگ جانتے ہیں، وہ بہت بڑا علمی مرکز بن

گیا اور وہاں ایسے علماء پیدا ہوئے کہ جن سے فیض حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے لوگ آتے تھے، علامہ حیدر علیؒ ٹونکی اور پھر ان کے بعد مولانا حکیم برکات احمد صاحب کے علمی و تعلیمی فیوض و برکات ہندوستان اور ہندوستان کے حدود سے متجاوز ہیں، ان کے علاوہ ٹونک میں جو جید اور سر آمد روزگار علماء پیدا ہوئے اگر آپ ان کے حالات پڑھنا چاہتے ہیں تو اردو ہی میں بلکہ عربی کی کتابوں میں بھی ان کے حالات ملیں گے، جو اس وقت عالم اسلام کے تمام کتب خانوں میں موجود ہیں، آخری دور میں مولانا محمود حسن خان صاحب ٹونکی کا نام لیتا ہوں، جن کے ذکر سے ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے جیسا کہ میرے تعارف میں کہا گیا ہے کہ میں مشرق وسطی کے عرب ملکوں سے قریبی تعلق رکھتا ہوں اور میں وہاں آتا جاتا رہتا ہوں، وہاں کی علمی مجلسوں اور وہاں کے جامعات کو بھی خطاب کرنے کا مجھے موقع ملا ہے، جب بھی مولانا محمود حسن خان ٹونکی کے علمی امتیاز اور علمی کارنامہ کا ذکر کیا گیا تو لوگوں کے چہرے پر ایک حیرت اور آنکھوں میں ایک تجسس کی کیفیت پیدا ہوگئی، ہندوستان کی سرزمین میں وہ ٹونک کو نہیں جانتے وہ راجستھان کو بھی نہیں جانتے، وہ ہندوستان کو جانتے ہیں (الہند) تحتی براعظم ہندوستان نے اتنا بڑا مصنف پیدا کیا، جس نے بہت سے مصنفین کو زندہ کر دیا، مصنفین ہی نہیں بلکہ ان مصنفین کے کارناموں کو بھی زندہ کر دیا۔ "معجم المصنفین" کے نام سے انہوں نے ایک کتاب لکھی، جہاں تک میری تحقیق اور میری معلومات ہے، بیس ہزار صفحات میں وہ کتاب لکھی گئی، کیا کوئی یقین کرسکتا ہے کہ یہ ایک تنہا شخص کا کارنامہ ہے، میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ یورپ میں ایک اکیڈمی جو کام کیا کرتی ہے، ہمارے یہاں مسلمانوں میں ایک آدمی کام کیا کرتا تھا، اس ایک آدمی نے ایک اکیڈمی کا کام کیا، معجم المصنفین نے صرف ہندوستان ہی کے مصنفین کو زندہ نہیں کیا بلکہ تمام عالم اسلام کے مصنفین کو جن کا زمانی رقبہ پہلی صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک اور جن کا مکانی رقبہ مکہ اور مدینہ سے لے کر انڈونیشیا، بدخشاں، ختن اور تاشقند تک ہے، ان کے حالات پر سے پردہ اٹھایا، افسوس ہے کہ اس کی چند ہی جلدیں شائع ہوسکیں ہیں، لیکن پھر بھی اس کتاب کی کوئی نظیر نہیں ہے، یہ میں آپ کے اس راجستھان ہی نہیں بلکہ اسی جے پور جہاں آج جامعہ ہدایت کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا، اس سے چند میل کے فاصلے پر جو ایک گمنام سا شہر ہے، میں اس کی ایک تنہا شخصیت کا کارنامہ بیان کر رہا ہوں، تو

صحرا کا علم اور تصنیف سے اور تحقیق سے ایک خاص رشتہ ہے اور یہ رشتہ جو عرب کے ایک نبی امّی کے ذریعہ قائم ہوا ہے، یہ ہمیشہ قائم رہے گا اور آج بھی آپ اس جنگل میں جو منگل دیکھ رہے ہیں، آج آپ کو جو اتنی صورتیں یہاں نظر آ رہی ہیں، آج آپ کو اس اسٹیج پر معززین نظر آ رہے ہیں، یہ بھی درحقیقت اس نبی امّی کا فیض ہے، قیامت تک جو کچھ ہوگا اسی کے طفیل ہوگا، اس نے جو علم کی شمع روشن کی تھی۔

یک چراغیست دریں بزم پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

جہاں بھی آپ کو کوئی علم کی شمع جلتی نظر آئے گی اس شمع، اس دیئے سے جلایا ہوا دیا ہوگا، یہاں جو شمع ہدایت آپ دیکھ رہے ہیں اور جس جامعہ ہدایت کے نام سے آپ یہاں جمع ہوئے ہیں، یہ اسی ہادی برحق اور اسی ہادی کامل کی شمع ہدایت کا پرتو ہے جو آپ کو نظر آ رہا ہے۔

علماء ہند کی علمی خدمات:

حضرات! یہ جامعہ ہدایت کن بنیادوں پر قائم ہو رہا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا کیا پیغام ہے؟ یہ کس ضرورت کی تکمیل کرے گا؟ یہ کس خلا کو پر کرے گا؟ اس کے متعلق میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مدرسہ ہے کیا چیز! مدرسہ کی کیا ضرورت ہے؟ مدرسہ کی معنویت اور اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا ان بلند و بالا جامعات کی موجودگی میں جن کا ایک نمونہ یہاں آپ کو راجستھان یونیورسٹی کی شکل میں بھی نظر آئے گا اور یہاں کالجوں کی شکل میں بھی نظر آئے گا، ان عصری جامعات کی موجودگی میں ایک جامعہ ہدایت کی ضرورت ہے، ایک عربی مدرسہ کی ضرورت ہے، اس کے متعلق نہایت موزوں طریقہ پر مولانا عبدالحئی صاحب فائز نے بلایا، عربی زبان کی اہمیت بتلائی، عربی زبان کی اہمیت اب سب کو تسلیم ہے، ایک زمانہ تھا کہ ندوۃ العلماء نے عربی زبان کی اہمیت کی آواز بلند کی اور آج سے ۸۵۔۹۰ سال پہلے یہ کہا کہ عربی زبان ایک زندہ زبان ہے، اس کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے سیکھنا چاہئے، اور اہل زبان کی طرح اس میں کمال پیدا کرنا چاہئے، یہ اس وقت اس طرح بلند کی گئی جیسے کوئی جنگل میں آواز لگائے اور اس کا کوئی سمجھنے والا نہ ہو، آج زمانہ نے، سیاسی انقلابات نے ثابت کر دیا اور دنیا کی ترقی نے اس بات کو سچ ثابت کر دیا ہے اور عربی زبان کی اہمیت پر جوان روشن ضمیر علماء نے آج سے

تقریباً ایک صدی پہلے سمجھی تھی، زمانہ نے مہر تصدیق ثبت کردی، آج عربی زبان کے بغیر گاڑی نہیں چلتی، آج عربی زبان کسی کو آتی ہے تو وہ ابن بطوطہ کی طرح دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتا چلا جائے تو عربی زبان سے کام لے سکتا ہے۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ جب میں کالی کٹ گیا تو میں مجبور تھا کہ وہاں عربی زبان کے ذریعہ تبادلہ خیال کروں، اردو وہ حضرات سمجھتے نہیں، اردو جس پر ہم کو آپ کو بڑا ناز ہے، اور جس میں آپ نے ایسا فصیح و بلیغ سپاس نامہ یا خطبہ استقبالیہ سنایا اردو کیرالہ کی حد تک بالکل نامانوس ہے۔ میں ہندوستان کا ایک شہری اپنے ہندوستانی بھائیوں سے اپنے اظہار مافی الضمیر کے لئے، اپنے خیالات ان کو پہنچانے کے لئے اس پر مجبور تھا، جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے انگریزی میں گفتگو کروں اور وہاں کے دیندار لوگوں اور مسلمانوں سے عربی میں گفتگو کروں۔ خود اس ملک میں عربی زبان کا سکہ چل رہا ہے، اور اس عربی زبان میں یہاں ہندوستان میں جو کچھ کام ہوا، اس کے متعلق اس وقت کیا عرض کروں کہ اس وقت کا یہ موضوع نہیں ہے، اس پر مستقل تصنیفات ہیں کہ ہندوستان نے عربی زبان کو مالا مال کردیا، اور بعض گوشے ایسے ہیں کہ جس پر تنہا ہندوستان کا کنٹری بیوشن ہے، ہندوستانی مسلمانوں نے اس موضوع کو شروع بھی کیا اور ختم بھی کیا۔

میں مثال کے طور پر کہتا ہوں علمی اصطلاحات نہایت نازک مسئلہ ہے۔ جس طریقہ سے کہ جہاز کا قطب نما یا جہاز کا درست کرنے والا آلہ ہوائی جہاز کا یا بحری جہاز کا ہوتا ہے اس میں اگر سوئی بال برابر بھی ہٹ جائے تو جہاز راستہ بھول جائے گا، غلط راستہ پر پڑ جائے گا، اس طرح علمی اصطلاحات کی نوک پلک اتنی نازک ہے کہ ان کی تشریح میں ذرا سی بھی غلطی ہو جائے تو پورا کا پورا فن آدمی کے لئے چیستان بن جائے گا، اس نازک فن کے موضوع پر دو بہترین کتابیں تیرہ سو برس میں دنیا میں لکھی گئی ہیں، وہ ہندوستانی عالموں کی ہے۔

(۱) ''کشاف اصطلاحات الفنون'' مولانا محمد اعلیٰ تھانوی کی جو بارہویں صدی کے ایک عالم تھے۔

(۲) ''دستور العلماء'' مولانا قاضی عبدالنبی احمد نگری کی جو غالباً گیارہویں صدی کے ایک عالم تھے۔

یہ دونوں کتابیں تنہا ہندوستانی عالموں کے قلم سے نکلی ہیں، اس طریقہ سے حدیث کے

مفردات کی شرح میں سب سے مستند، سب سے وسیع اور سب سے بڑی کتاب جو جامع ہے تمام کتابوں کی وہ ایک ہندوستانی عالم، فخر ہندوستان علامہ محمد طاہر پٹنی گجراتی کے قلم سے ''مجمع بحارالانوار'' کے نام سے نکلی ہے، جس کو سارا عرب جانتا ہے اور اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، سب سے اس نے مستغنی کردیا ہے، اور میں بڑے فخر اور شکر کے ساتھ آپ کے سامنے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ خدا نے ہندوستانی مسلمانوں کو جو سعودی عرب میں ڈیڑھ سو دو سو برس سے رہتے ہیں، لیکن ہندوستان سے انہوں نے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے، نہ ہندوستان کی زبان سے، نہ ہندوستان کی تہذیب سے، خدا نے انہیں کو توفیق دی کہ پہلی بار خوبصورت عربی ٹائپ میں وہ اس کتاب کو شائع کریں، میرا اندازہ یہ ہے کہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان رقم اس پر صرف ہوئی ہوگی، یہ آپ کے پٹنی تاجروں کا کارنامہ ہے کہ جن کا جدہ میں اور مکہ میں اور ریاض میں اور مدینہ میں بڑا تجارتی کاروبار ہے، اس کا سہرا خاص طور پر نورولی خاندان اور اس کے بزرگ الحاج عبدالقادر نورولی صاحب کے سر ہے۔

مدرسہ کس درد کی دوا ہے؟

میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مدرسہ کس درد کی دوا ہے، یہ مدرسہ جو قائم ہو رہا ہے، خدا اس پودے کو پروان چڑھائے اور اس کو ایک شاداب اور سایہ دار درخت بنائے، جس کے نیچے نسلیں آرام پائیں اور اس سے ہدایت حاصل کریں۔ یہ جامعہ کس خلا کو پر کرتا ہے، کس ضرورت کی تکمیل کرتا ہے؟

حضرات! صحیح دینی مدرسہ کے بارے میں میرا نقطہ نظر بہت سے بھائیوں سے اور ان پڑھے لکھے دوستوں سے مختلف ہے جو مدرسوں سے واقفیت کا دعویٰ رکھتے ہیں یا اس سے تعلقات رکھتے ہیں۔ میں مدرسہ کو پڑھنے پڑھانے اور پڑھا لکھا انسان بنانے کا کارخانہ نہیں کہتا، میں مدرسہ کی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، میں اس سطح پر آنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ مدرسہ اسی طریقہ سے پڑھنا لکھنا سکھانے یا یوں کہنا چاہئے کہ پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کا ایک مرکز ہے، جیسے کہ دوسرے اسکول اور کالج ہیں، میں اس کو مدرسہ کے لئے ازالہ حیثیت عرفی کے مترادف سمجھتا ہوں، یعنی اگر میں مدرسہ کا وکیل ہوں یا میں خود مدرسہ بن جاؤں تو میں اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کرسکتا ہوں۔ اگر کوئی مدرسہ کو صرف اتنا حق

دینے اور مدرسہ کو صرف اتنا ماننے کو تیار ہے کہ صاحب! جیسے پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کے لئے بہت سے کارخانے ہیں، بہت سے مرکز ہیں، کوئی اسکول کہلاتے ہیں، کوئی کالج کہلاتے ہیں، ان کے مختلف معیار اور مختلف سطح ہیں، اسی طریقہ سے مدرسہ بھی عربی زبان یا عربی علوم وفنون، فقہ اور دینیات تفسیر و حدیث سکھانے کا ایک مرکز یا کارخانہ ہے، میں مدرسہ کو نائبین رسول و خلافت الٰہی کا فرض انجام دینے والے اور انسانیت کو ہدایت کا پیغام دینے والے، تحفظ و بقاء کا راستہ دکھانے والے افراد پیدا کرنے والوں کا ایک مرکز سمجھتا ہوں، میں مدرسہ کو آدم گری اور مردم سازی کا ایک کارخانہ سمجھتا ہوں، جس طرح فیکٹریاں کرتی ہیں مختلف قسم کی۔ کوئی گن فیکٹری ہوتی ہے، کوئی شوگر فیکٹری ہوتی ہے، کوئی کسی اور قسم کی مشین ڈھالتی ہے، ہیوی الیکٹرک کے سامان پیدا کرنے کے بہت سے کارخانے ہیں، ہم ان کی بہت قدر کرتے ہیں، ہم ان کی ملک میں ضرورت تسلیم کرتے ہیں، ہم ان کی تحقیر نہیں کرتے، لیکن چیزوں کے مختلف درجے ہوتے ہیں، مدرسہ اس طرح کے پڑھے لکھے آدمی پیدا کرنے کا مرکز نہیں، مدرسہ ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کا مرکز ہے جن کا ابھی آپ کے سامنے ذکر کیا گیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ مدرسہ ایسا کر رہا ہے یا نہیں اور ہر مدرسہ یہ کرنا چاہتا ہے یا نہیں؟ اس کا اس اصولی بحث سے کوئی تعلق نہیں، میں مدرسہ کے ایک خادم کی حیثیت سے اور مختلف مدارس سے تعلق رکھنے والے کی حیثیت سے اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ بہت سے مدارس یہ فرض انجام دینے سے قاصر ہو گئے ہیں، پہلے یہ فرض انجام دیا کرتے تھے، اب یہ فرض وہ انجام نہیں دے رہے ہیں، کیوں؟ لیکن مدرسہ کو کیا فرض انجام دینا چاہئے؟ مدرسہ کا فرض کیا ہے؟ مدرسہ کے سپرد کونسا کام ہے؟

مدرسہ کا شجرۂ نسب:

حقیقی مدرسہ کی بنیاد اور پہلے مدرسہ کی بنیاد کہاں رکھی گئی ہے، پہلے مدرسہ کی بنیاد قرطبہ اور غرناطہ میں نہیں رکھی گئی تھی، قیروان اور قاہرہ میں نہیں رکھی گئی، دہلی اور لکھنؤ میں نہیں رکھی گئی، فرنگی محل، ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند میں نہیں رکھی گئی، پہلے مدرسہ کی بنیاد مسجد نبوی میں رکھی گئی، اور مدرسہ کا نام "صفہ" تھا، آپ مجھے معاف کریں میں مدرسوں میں صحیح النسب مدرسہ اور عالی نسب مدرسہ اسی کو سمجھتا ہوں جس کا شجرۂ نسب صفہ نبوی پر جا کر ختم ہو اور میں اسی مسجد کو صحیح النسب مسجد سمجھتا ہوں جس کا شجرۂ نسب کعبہ ابراہیمی پر جا کر ختم ہو اور مسجد نبوی پر ختم ہو۔ میں اس

کے مقابلہ میں دوسرے الفاظ بولنا نہیں چاہتا کہ وہ مسجد کہلائے گی، لیکن قرآن مجید نے بتادیا ہے ہمیں، اور آپ کو کوئی لقب ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ مسجد، مسجد ضرار کہلائے گی جس کا شجرہ نسب ابراہیم ومحمد علیہما السلام کی بنائی ہوئی مسجد پر ختم نہیں ہوتا اور وہ مدرسہ، مدرسہ نہیں بلکہ انسانیت کی قتل گاہ کہلائے گا جس کا شجرہ نسب صفہ نبوی ﷺ پر ختم نہیں ہوتا۔ مسجد نبوی ﷺ پر ختم نہیں ہوتا اور ابوذرؓ وسلمانؓ پر ختم نہیں ہوتا۔ صدیقؓ وعلیؓ پر ختم نہیں ہوتا۔ زیدؓ اور سیدہ عائشہؓ پر ختم نہیں ہوتا۔ ان مبلغان دین، ان ہادیان انسانیت، ان پیشوایان عالم پر ختم نہیں ہوتا، جنھوں نے ہدایت کا پیغام دیا، جنھوں نے قربانی کا پیغام دیا، جنھوں نے خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو نفع پہنچانے کا پیغام دیا کہ اپنا زیاں مقصود ہے اور اپنا زیاں گوارا ہے، لیکن دوسروں کا زیاں گوارہ نہیں، جنھوں نے یہ پیغام دیا کہ اپنے گھر میں اندھیرا رکھ کر دوسروں کے گھروں میں روشنی کا انتظام کرو، اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر (اس لئے ان کا سلسلہ انہیں پر ختم ہوتا ہے، جنھوں نے غزوۂ خندق میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے تھے) دوسرے کے بچوں کا پیٹ بھرنے اور ان کو کھلانے کا انتظام کرو۔ جنھوں نے یہ پیغام دیا کہ مدرسہ کا کام ملازمت دلانا نہیں، مدرسہ کا کام آسامیاں بانٹنا نہیں ہے، مدرسہ کا کام ایسا پڑھا لکھا انسان بنانا جو اپنی چرب زبانی سے لوگوں کو مسحور نہ کرے، مدرسہ کا کام قرآن سنانا ہے، جب کہ دنیا میں ہر حقیقت کا انکار کیا جارہا ہے، اور یہ کہا جارہا ہے کہ دنیا میں صرف ایک حقیقت زندہ ہے، اور سب حقیقتیں مرچکیں، اخلاقیات مرچکے، صداقت مرچکی، صرف ایک حقیقت باقی ہے، اور وہ نفع اٹھانا اور اپنا کام نکالنا ہے، وہ ہر قیمت پر، عزت بیچ کر، شرافت بیچ کر، ضمیر بیچ کر، اصول بیچ کر، خودداری بیچ کر صرف چڑھتے سورج کا پجاری بننا ہے۔ اس وقت مدرسہ اٹھتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ انسانیت مری نہیں ہے۔ اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ نقصان میں نفع ہے، ہار جانے میں جیت ہے، بھوک میں وہ لذت ہے جو کھانے میں نہیں، اس وقت مدرسہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ذلت میں بعض مرتبہ وہ عزت ہے جو بڑی سے بڑی عزت میں نہیں، اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ سب سے بڑی طاقت خدا کی طاقت ہے، سب سے بڑی صداقت حق کی صداقت ہے، یہ ہے مدرسہ کا کام، اور اگر مدرسہ یہ کام اور دنیا کے سارے کام کرنے لگے تو وہ مدرسہ، مدرسہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ ہدایت کا صحیح سنگ بنیاد اسی پر رکھا جارہا ہے۔ میرے

گناہگار ہاتھوں سے نہیں رکھا جارہا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں سے رکھا جارہا ہے، اور رکھا جاچکا ہے۔ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں، یہ واقعہ سینکڑوں بار پیش آچکا ہے، اور دنیا کے چپہ چپہ پر جامعہ ہدایت موجود ہے، جب تک یہ زندہ ہے، جب تک انسانیت کے اندر کوئی سانس اور رمق باقی ہے، اس کے اندر حقیقی انسانیت کی رمق باقی ہے، اس وقت تک دنیا کا کوئی گوشہ جامعہ ہدایت سے خالی نہیں، یہ جامعہ ہدایت درحقیقت ان حقیقی جامعات ہدایت کے خاندان کا ایک فرد ہے، یہ کسی چیز کا آغاز نہیں، ایک تسلسل ہے، وہ تسلسل جو دنیا میں کسی بڑی سے بڑی چنگیزی، بڑی سے بڑی کسریٰ قیصر، بڑی سے بڑی شہنشاہی اور زور شمشیر سے اس کی لائی ہوئی مصیبت کے زمانے میں بھی کبھی نہیں ٹوٹا، مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ انسان پیدا کرے جو اس پست سطح سے بلند ہوں کہ قیمت لگائیے، ہم سب کچھ بیچنے کو تیار ہیں، آج دنیا نیلام کی منڈی کے سوا کچھ نہیں، کہاں کا مدرسہ اور کہاں کا کتب خانہ، کہاں کے اصول اور کہاں کے معیار، ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا ایک بازار ہے، اس میں ہر ایک اپنا جنس ہنر اور اپنا جنس کمال ہاتھ پر رکھے ہوئے بیچنے کے لئے آیا ہے۔ لیکن ہم اس نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کرتے، ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ دنیا محض ایک بازار ہے، ایک منڈی ہے، یہاں جو آئے مال لے کر جائے اور بیچے، صرف مسئلہ قیمت کا ہے، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی کو بیچنے میں کچھ دیر لگ جائے، اس لئے نہیں کہ اس کو اپنا جنس کمال اور اپنا جنس مذہب اور اپنا جنس اخلاق زیادہ عزیز ہے، بلکہ اس کی اس کے منہ مانگے دام نہیں مل رہے ہیں، جب انسانیت پر زوال آیا، جب اخلاقیات پر زوال آیا اور جب لوگوں کو یہ نظر آنے لگا کہ یہ جو حق و باطل کی بات کہی جاتی تھی، یہ محض زیب داستان کے لئے کہی گئی ہے، اور اس کا کہیں وجود نہیں ہے، حق و باطل کوئی چیز نہیں ہے، حلال و حرام کوئی چیز نہیں ہے، کفر و ایمان کوئی چیز نہیں ہے، غلط، صحیح، صواب و ناصواب کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز تو پیسہ ہے، اصل چیز تو طاقت ہے، اصل چیز تو عہدہ ہے، اصل چیز تو مواقع ہیں، اس وقت مدرسہ نے ایسے لوگ پیدا کئے، کوئی ایسا آدمی لا کھڑا کردیا، ایسا بلند قامت انسان، ایسا کوہ پیکر انسان، جس نے کہا کچھ نہیں! ہم نہیں جاتے! اور اگر کسی کو اعتبار نہیں آتا تو ہمیں خرید کر دیکھ لے، اگر وہ ہمیں خرید سکتا ہے تو ہم مان لیں گے کہ دنیا میں اخلاقیات کوئی چیز نہیں، اور ان سب پر مکمل زوال آچکا ہے۔ مدرسہ نے ہمیشہ ایسے لوگ پیدا کئے ہیں میں آپ کو چند مثالیں دیتا ہوں کہ مدرسہ

کیسے آدمی پیدا کرتا ہے، اس تھوڑے سے وقت میں جبکہ آپ کو اس تقریب میں شرکت کرنا ہے، اور آپ دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں، میں مدرسہ کی پوری کارگزاری آپ کو نہیں سنا سکتا، اگر اس کو آپ کو لکھنا ہو تو مدرسوں کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ایک ایک مدرسہ پر ضخیم جلدیں لکھی گئی ہیں، میں مراکش گیا تھا، رباط گیا تھا تو مجھے کئی جلدوں میں جامعۃ القرویین کی تاریخ دی گئی۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی اور تصویروں سے مزین، کئی ضخیم جلدوں میں صرف جامعۃ القرویین کی، ایسے ہی ازہر کی تاریخ آپ پڑھیں، ہمارے یہاں آپ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ آپ پڑھنا چاہیں، ندوۃ العلماء کی تاریخ آپ پڑھنا چاہیں، فرنگی محل کی تاریخ آپ پڑھنا چاہیں تو موجود ہیں، میں آپ کے سامنے چند مثالیں دیتا ہوں۔

یہ ہے مدرسہ کی شان:

امام مالک کا زمانہ ہے اور ساری دنیا میں علم کی دھوم مچی ہوئی ہے اور بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی ہے، کوئی شخص یہ کہے کہ "حدثنا مالک بن انس، حدثنا مالک" یہ اس وقت کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی کہے "حدثنا مالک" سب کے کان کھڑے ہو جاتے تھے اور سب سر اٹھا کر دیکھنے لگتے تھے کہ وہ کونسا خوش نصیب انسان ہے، جس کو امام مالک سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ یہ امام مالک آخری اموی اور ابتدائی عباسی خلافت کے زمانے میں اپنی مسند درس بچھائے بیٹھے تھے، مدینہ طیبہ کے محدود شہر میں، ان کے پاس پیام آتا ہے کی آپ دربار میں زحمت فرمائیں اور خلیفہ کے صاحبزادوں کو سبق پڑھا دیں۔ یعنی شہزادہ امین و مامون کو کچھ سبق پڑھا دیں۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کے گھر سے اس علم کی توقیر وعزت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، آپ کے گھر سے لوگوں نے علم کی توقیر کا سبق سیکھا ہے اور آپ ہی کے ہاتھوں اس کی تذلیل ہو یہ آپ کے لئے مناسب نہیں ہے۔ علم کے پاس آیا جاتا ہے، علم کسی کے پاس نہیں جاتا، چنانچہ امین و مامون وہاں گئے اور انہوں نے امام مالک سے درس لیا، یہ ہے مدرسہ کی شان، یہ میں نے آپ کے سامنے ایک نمونہ رکھا۔

دوسرا نمونہ دیکھئے:

حضرت عطا کا یا طاؤس کا واقعہ ہے کہ انہوں نے منصور کو ایک مرتبہ نصیحت کی، اور لوگ

بھی وہاں مجلس میں بیٹھے تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے کپڑے سمیٹنے شروع کئے، اپنا دامن سمیٹنا شروع کیا کہ ابھی جلاد کو حکم ہوتا ہے اور ان کا سر قلم کردیا جاتا ہے تو کم سے کم ان کے خون ناحق کی چھینٹیں ہمارے دامن پر تو نہ پڑیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بس سہمے کھڑے ہوئے تھے کہ کیا حکم ہوتا ہے؟ منصور نے کہا ذرا یہ قلم دوات رکھا ہوا ہے وہ ان کے قریب تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں نہیں اٹھا سکتا، کیوں؟ انہوں نے کہا مجھے یہ اطمینان نہیں ہے کہ آپ اس سے کیا لکھیں گے؟ ممکن ہے کہ آپ خدا کو ناخوش کرنے الی چیز لکھیں، میں اس میں شریک ہونا نہیں چاہتا، وہ کہتے ہیں کہ پھر ہم نے اپنا دامن سمیٹا کہ اب حکم ہوتا ہے جلاد کو، لیکن ہیبت حق کا یہ حال تھا کہ منصور نے کوئی حکم نہیں دیا، یہ میں نے آپ کو دوسرا واقعہ سنایا، اب میں آپ کو تیسرا اور آخری واقعہ سناتا ہوں۔ اس سے آپ سمجھیں گے کہ علم کی کیا شان ہے؟ ایک بزرگ تھے شیخ سعید حلبی ابھی سو برس پہلے کا قصہ ہوگا جو دمشق کی ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے درس دے رہے تھے۔ اتفاق سے ایک دن ان کے پاؤں میں تکلیف تھی اور وہ پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے اور جیسا کہ قاعدہ ہے کہ استاذ پشت بہ قبلہ ہوتا ہے اور اس کے شاگرد سامنے بیٹھے ہوتے ہیں اور دروازہ سے داخل ہوتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں تو ان کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور پشت قبلہ کی طرف تھا اور پاؤں دروازے کی طرف پھیلائے ہوے تھے۔ اس واقت ایک مشہور بانی سلطنت مصر خدیوی سلطنت جو ابھی فاروق پر ختم ہوئی ہے، ابھی پندرہ بیس برس پہلے تک وہ موجود تھے وہ محمد علی پاشا کا بیٹا تھا، ابراہیم پاشا اس زمانے میں بڑا سفاک اور جلاد مشہور تھا۔ وہ شام کا گورنر تھا اور اس کی سفاکی کے قصے لوگوں کی زبانوں پر تھے، اس کو خیال ہوا کہ میں حضرت کا درس جاکر سنوں اور ملاقات کروں، راستہ ہی وہ تھا اس لئے پہلے دروازے کی طرف سے آیا۔ سب کو خیال تھا کہ حضرت کو ہزار تکلیف ہو، اس موقعہ پر اپنا پاؤں سمیٹ لیں گے۔ اتنی دیر میں کیا ہو جائے گا۔ انہوں نے بالکل کوئی جنبش نہیں کی، نہ درس موقوف کیا، نہ پاؤں سمیٹا، اسی طرح پاؤں پھیلائے رہے اور وہ پاؤں ہی کی طرف آکر کھڑا ہو گیا۔ اب ان کے شاگرد کہتے ہیں کہ ہم بالکل لرزہ و ترساں تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے؟ کیا ہمارے شیخ کی شہادت ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگی یا تذلیل ہوگی، مشکیں باندھ لیں جائیں گی اور کہا جائے گا لے چلو، وہ کھڑا رہا اور وہ دیر تک درس دیتے رہے۔ التفات بھی نہیں کیا اور پاؤں بھی نہیں سمیٹا، مگر خدا جانے ان لوگوں کا کیا اثر

ہوتا ہے کہ اس نے کچھ کہا نہیں، کوئی سرزنش نہیں کی، کوئی شکایت نہیں کی اور چلا گیا۔ سننے والی بات یہ ہے، وہ یہ کہ وہ کچھ ایسا معتقد ہوا کہ اس نے جا کر اشرفیوں کا ایک توڑا غلام کے ہاتھ بھیجا اور کہا کہ شیخ کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ یہ حقیر نذرانہ قبول فرمائیں۔ آپ جانتے ہیں انہوں نے جواب میں کہا۔ یہ آب زر سے لکھنے والا جملہ تھا جو علم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ انہوں نے کہا اپنے بادشاہ کو سلام کہنا اور کہنا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے، وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ یا پاؤں ہی پھیلا لے یا ہاتھ ہی پھیلا لے۔ ایک ہی کام ہو سکتا ہے دنیا میں۔ جب میں نے پاؤں پھیلائے تھے، میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اب میں ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ **(ان الذی یمدرحله لایمدیده)** انہی الفاظ کے ساتھ مورخ نے اس کو نقل کیا ہے۔

جامعہ ہدایت کے طلبہ اور فضلاء کو ہدایت:

میرے دوستو اور بھائیو! ہمیں ایسے مدرسہ کی ضرورت ہے، اور ہم توقع کرتے ہیں کہ جس مدرسہ کا نام ہی جامعہ ہدایت ہے، وہاں کے طلبہ اور فضلاء کو اس سے یہ ہدایت ملے گی کہ وہ غیرت اور خودداری سیکھیں، ان علماء ربانیین سے اور علماء حق سے جن کے واقعات سے تاریخ لبریز ہے، اس خودداری کا سبق سیکھیں کہ پاؤں پھیلا لیں یا ہاتھ پھیلا لیں۔

آج ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو چاہے پاؤں نہ پھیلائیں، میں نہیں کہتا کہ پاؤں پھیلائیں، میں نہیں کہتا کہ آج زمانہ اس جرأت کا متحمل ہے، میں نہیں کہتا کہ اس زمانہ کی تہذیب اس کو گوارا کرے گی یا اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ بے ضرورت پاؤں پھیلائے جائیں، بے ضرورت پاؤں پھیلانے کی میں تبلیغ نہیں کرتا، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ہاتھ نہ پھیلائے۔ عالم وہ ہے کہ جو ہاتھ نہ پھیلائے، آج ہمارے مدرسوں کو ایسے آدمیوں کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور دنیا کو اور انسانیت کو ان عالموں کی ضرورت ہے جن کے متعلق تجربہ ہو جائے کہ یہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے نہیں ہیں اور آج جس بزرگ اور گرامی ذات سے اس جامعہ کا انتساب کیا جا رہا ہے، انہوں نے ہمیں اسی کی تعلیم دی ہے، وہ ہاتھ پھیلانے والے نہیں تھے اور ان کی روح جب ہی خوش ہوگی، جب اس جامعہ سے وہ لوگ نکلیں جو دنیا کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں، آج ہمیں یہ منظر نظر آ رہا ہے کہ سب نے کسی نہ کسی شکل میں ہاتھ پھیلا رکھا ہے، کسی کے ہاتھ پھیلے نہیں ہیں، اس لئے کہ ہاتھ پھیلانے کا ان کو

موقع نہیں ملا، لیکن پھیلنے کے لئے تیار ہیں، مصیبت یہ ہے کہ جو ہاتھ پھیلے نہیں ہیں، وہ پھیلنے کے لئے بے چین و بے قرار ہیں، آج کونسا ہاتھ ہے جو تڑپ نہیں رہا ہے کہ مجھے پھیلنے کا موقع ملے۔ آج دنیا ذہینوں کو نہیں ترس رہی ہے، فلسفیوں کو نہیں ترس رہی ہے۔

میرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے

میں یورپ میں بھی دیکھ آیا ہوں اور مشرق وسطی کا کونہ کونہ میں نے چھانا ہے، آج بڑے بڑے عالموں کی، ادیبوں کی، مصنفوں کی، خطیبوں کی، شاعروں کی، دانشوروں اور فلسفیوں کی کوئی کمی نہیں ہے، آج کمی ہے ان اللہ کے بندوں کی، ان قدسی نفوس کی جو کسی شکل میں بھی ہاتھ پھیلانے کے لئے تیار نہیں، وہ موت کو ترجیح دیں گے، لیکن ہاتھ نہ پھیلائیں گے، وہ اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

دنیا میں سیاسی انقلابات آئیں اور گزر جائیں، حکومتیں قائم ہوں، اور نکل جائیں، ہوا چلے اور بند ہو جائے، کچھ بھی ملک میں ہو لیکن ان کا ہاتھ کسی کے سامنے نہیں پھیل سکتا، وہ ضمیر کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں اور آپ یقین جانیئے کہ یہ زمین اور آسمان اس وقت تک صحیح طور پر قائم ہے، جب تک کسی نہ کسی شکل میں تھوڑی تھوڑی تعداد میں خواہ ان کو دیکھنے کے لئے دوربین کی یا خوردبین کی ضرورت پیش آئے، لیکن ان کا وجود تو ہو، خوردبین بھی تو اسی کو دیکھ سکتی ہے، جس کا وجود ہے، جس کا سرے سے وجود ہی نہیں، اس کو خوردبین کہاں سے دیکھے گی، آج اتنی چھوٹی شکل میں، ایسی غیر مرئی شکل میں سہی، ان لوگوں کا وجود کہیں تو ہوتا جن کو خوردبین سے دیکھا جا سکتا، خدا کا شکر ہے ایسا تو نہیں ہوا کہ دنیا ان کے وجود سے یکسر خالی ہو جائے، لیکن یہ جنس بہت نایاب ہے، اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

بس میرے بھائیو! میرے نزدیک مدرسہ کا صرف ایک کام ہے کہ وہ ایسے حقانی اور ربانی علماء پیدا کرے جو صرف یہی نہیں، یہ تو ان کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا سودا کریں، بلکہ وہ دنیا کو جو ضمیر کا سودا کر رہی ہے، اس کو سرزنش کر سکیں، اس سے کہہ سکیں کہ انسان کا ضمیر اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے کہ وہ روز بکے، روز نیلام پر چڑھے، ایک عہدے پر بک جائے، ایک عہدہ، ایک کرسی، ایک خوشنودی، ایک تبسم اس کو خرید لے۔

حضرات! آپ نے انہی ریاستوں میں، اپنے انہی مرکزوں میں ایسے قصے سنے ہوں

گے کہ لوگوں نے اپنی شرافت پر آنچ نہیں آنے دی، اپنی عزت پر میل نہیں آنے دیا، بڑے سے بڑے نقصان کو گوارہ کرلیا لیکن اس کے لئے تیار نہیں کہ وہ اپنی اس عزت، اس سطح اور معیار سے نیچے اتر آئیں، میں صرف ہندوستان کو نہیں کہتا میری نگاہ ساری دنیا پر ہے، میں ساری دنیا کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں اور یہ میں جو آپ کے سامنے کہہ رہا ہوں یہ میں ہر جگہ کہہ آیا ہوں، یہ نہیں کہ میں آج آپ کے سامنے پہلی مرتبہ کہہ رہا ہوں، میں نے عربوں کے سامنے یہی بات کہی، میں نے ان سے کہا کہ ہم نے، تم سے خودداری کا سبق سیکھا تھا، ہم نے تم سے ایمان کا سبق سیکھا تھا، ہم نے تم سے استقامت کا سبق سیکھا تھا، میں ناصر کے زمانہ میں جب عرب اپنے آپے میں نہیں تھے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی تھی، اس وقت میں نے ان کا گریبان پکڑ پکڑ کر ان سے کہا کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ آپ ایک چیز کو غلط سمجھتے ہیں، اور آپ اس کے پیچھے اس طرح دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں۔

عالم ہر زمانہ میں قبلہ نما رہے:

مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے باضمیر، باعقیدہ، ایسے باایمان، ایسے باحوصلہ اور ایسے باہمت فضلاء پیدا کرے جو اس ضمیر فروشی اور اصول فروشی اور اخلاق فروشی کے دور میں روشنی کی مینار کی طرح قائم رہیں کہ وہ کہیں نہیں جاتا، اپنی جگہ پر کھڑا ہے، راستہ بتاتا ہے، جیسے قبلہ نما کہ آپ کہیں ہوں وہ آپ کو قبلہ بتادے گا، ہندوستان میں بتائے گا، دوسرے ملک میں بتائے گا، پہاڑ پر رکھیں تو بتائے گا، پل پر رکھیں تو بتائے گا، یہ عالم کا کام ہے کہ ہر زمانہ میں ہر جگہ قبلہ نما رہے۔

یہ جامعہ ہدایت جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان مقاصد عالیہ پر اس کی بنیاد رکھی جارہی ہے اور حقیقت میں ہر دینی مدرسہ کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے اور یہی اس کی اصل قدر و قیمت ہے، ان کو آپ ان کی عمارتوں سے نہ پہچانئے، آپ ان کے بوریوں اور وہاں کے فرنیچر کی کمی اور وہاں کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کی تہی دامنی اور ان کی بے بضاعتی سے ان کا درجہ قائم نہ کیجئے جیسے کہ کہنے والوں نے کہا گدائے شاہی میں اور دلق فقیری میں وہ شاہانہ مزاج رکھتے ہیں، ان کا مزاج شاہانہ ہے اور ان کا لباس فقیرانہ ہے، یہ ہمارے علماء سلف تھے، اور آج انہیں علماء سلف کی اس وقت ضرورت ہے۔

مدرسوں نے ہوا کے رخ پر چلنا قبول نہیں کیا:

خدا کا شکر ہے کہ ہوا کے رخ پر چلنا مدرسہ کا اصول نہیں ہے، اگر مدرسہ کا یہ اصول ہوتا تو وہ کب کے انگریزی کے، عربی کے کالج بن چکے ہوتے، لیکن جو اس وقت چند گنے چنے مدرسے باقی ہیں، وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ مدرسوں نے ہوا کے رخ پر چلنے کو قبول نہیں کیا۔

حضرات! میں ان الفاظ کے ساتھ آپ حضرات کی عزت افزائی کا اور بانیان مدرسہ خاص طور پر حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب اور مولانا عبدالحئی صاحب فائز کی ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس اہم اور مقدس اور اس بابرکت اور عالی مرتبہ کام کے لئے مجھ جیسے طالب علم کا انتخاب کیا، جو کچھ میرے متعلق کہا میں اللہ سے دعا کرتا ہوں، آپ بھی کیجئے کہ اس دن مجھے رسوائی سے بچائے جس دن (یوم تبلی السرائر) کا ظہور ہوگا۔ اب میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی گذارش کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس جامعہ کو ہمیشہ سرسبز وشاداب رکھے اور صحیح معنی میں اس کو مرکز بنائے۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دارارقم جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا

ذیل کا مضمون حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی وہ اہم تقریر ہے جو ۳ جنوری ۱۹۹۴ء کو فتح پور میں "مدرسہ دارارقم" کی درسگاہ اور مسجد کے سنگ بنیاد کے موقع پر کی گئی۔

نحمده ونصلي على رسوله الكريم .اما بعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم. واذكروااذأنتم قليل مستضعفون فى الارض تخافون أن يتخطفكم الناس فاواكم وأيد كم بنصره ورزقكم من الطيبت لعلكم تشكرون.

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مسلمانوں کو خطاب کر کے "واذکرو اذ أنتم قلیل مستضعفون فی الارض" یاد کرو جب تم تھوڑے تھے برائے نام تھے، انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اور بہت کمزور سمجھے جارہے تھے جو کمزور کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے وہ تمہارے ساتھ کیا جاتا تھا، تم کو جو چاہتا تکلیف دیتا اور جو چاہتا پریشان کرتا اور روئے زمین پر تم کو کمزور سمجھا جاتا تھا، "فأواکم" تو اللہ نے تم کو پناہ دی "وأیدکم بنصرہ" اور تمہاری مدد کی اپنی نصرت خاص سے، اور تمہاری حفاظت فرمائی اور دست گیری کی "ورزقکم من الطیبات" اور تم کو عطا کیں بڑی بڑی نعمتیں تا کہ تم شکر کرو۔

جب میں قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھتا ہوں تو ذہن "دارارقم" اور شعب ابی طالب کی طرف جاتا ہے، وہ "دارارقم" کون سی جگہ تھی، "دارارقم" وہ گھر تھا جس میں مسلمان کفار کی اذیت سے اور ان کی سنگ دلی سے اور ان کے وحشت ناک معاملات سے بچنے کے لئے، اللہ کا نام اطمینان کے ساتھ لینے اور نماز ادا کرنے کیلئے پناہ لیتے تھے اور بہت بڑے بڑے جلیل القدر نامی گرامی صحابی وہیں جا کر اسلام لائے، جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت سیدنا عمر بن خطابؓ بھی وہیں گئے اور انھوں نے بھی کلمہ پڑھا، یہ تھا "دارارقم"، جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا اور شعب ابی طالب وہ جگہ تھی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو پناہ لینی پڑی اور ان کا مقاطعہ اور بائیکاٹ کیا گیا تا کہ کوئی سودا بیچنے والا ان کے پاس نہ پہنچے کوئی غذائی سامان نہ پہنچائے لیکن اس

میں بعض شریف انسان مکہ مکرمہ کے تھے جو کسی طرح سے کچھ غذا پہنچا دیتے جس سے ان کی زندگی قائم رہے ورنہ ان کی موت کا پورا سامان کیا گیا تھا اور چاروں طرف ایسے پہرے بٹھائے تھے اور ایسا حصار قائم کیا تھا کہ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی رابطہ اور تعلق نہ پیدا ہو پائے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ جب تک یہ آیت پڑھی جائے گی جو لوگ سیرت پاک سے واقف ہیں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پڑھیں گے اور جنھوں نے اسلام کی تاریخ پڑھی ہے اور ادیان کی بھی تاریخ پڑھی ہے، مذاہب اور انقلاب کی تاریخ پڑھی ہے، ان کو ''دارارقم'' ضرور یاد آئے گا، آج ساری دنیا میں شروع عہد صحابہ ہی سے اور اس کے بعد خلفائے راشدین کے زمانے میں اور پھر سلطنت امویہ اور پھر سلطنت عباسیہ کے زمانے میں برے بڑے محلات بنے خلفائے راشدین کے زمانہ میں تو قیصر وکسریٰ کے محلات تھے لیکن جب بنی امیہ خلافت کی کرسی پر آئے تو دمشق میں بڑے بڑے محلات بنائے، عباسیوں تک جب خلافت پہنچی تب بغداد میں بڑے شاندار شاندار محلات بنائے گئے اور بڑے بڑے علمی مرکز قائم کئے گئے اس کے بعد جب اسلام اسپین میں گیا اور اندلس میں گیا تو وہاں کے محلات کا اور قصور کا تو کہنا ہی کیا، میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اندلس مرحوم اور اسپین کو دیکھنے کا موقع عطا فرمایا، وہاں ہم نے قصر الحمراء دیکھا اور بہت بڑے مبصر اور مؤرخ نے بتایا کہ اس کے سامنے تاج محل وغیرہ کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے اور مغلوں کے محلات بھی بھی اس کے سامنے کم درجے کے معلوم ہوتے ہیں، ہم نے قصر الحمراہ بھی دیکھا ہے اور ''جامع بنی الزہراء'' کو بھی دیکھا قرطبہ اور پھر اس کے بڑے بڑے مدارس، آج بھی مصر کا جامعہ از ہر جو قاہرہ میں ہے اور جو عالم اسلام کا سب سے قدیم تر اور سب سے شاندار اور سب سے زیادہ کثیر التعداد طلبا کا مرکز ہے۔

میں تو مصر کا جامع الزہر اور پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں، معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ دیوبند کا دارالعلوم، مظاہر العلوم اور ندوۃ العلماء جس کا میں خادم اور ناظم ہوں سب اس دارارقم کے سامنے ہیچ ہیں، یہ ''دارارقم'' وہ تھا جہاں سے دنیا میں پھر سے ایمان کی روشنی پھیلی اور انسانوں کو معلوم ہوا کہ ہم کو کس نے پیدا کیا اور کس لیے پیدا کیا ہمارا خالق کون ہے اور غرض اور مقصد خلقت کیا ہے ''وما خلقت الجن والانس الالیعبدون'' میں نے جن

وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا تا کہ یہ میری عبادت کریں اور اس دارارقم کا جو رقبہ تھا اور اس عمارت کی جو حیثیت تھی اور اس کی جو وسعت تھی وہ سب اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ اہمیت تو اس کی ہے کہ وہاں سے کون سی تعلیم دی گئی اور وہاں سے کون سا نور اور روشنی پھیلی جس سے انسانوں کو اپنے پیدا کرنے والے کا علم ہوا۔

اس سے بڑھ کر غضب، ناشکری اور جہالت کی بات کون سی ہوسکتی ہے کہ انسان اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ جانے، اگر یہ کوئی نہ جانے کہ اس مدرسہ میں انتظام کس نے کیا اور یہ جلسہ کس نے کیا اور اس میں اتنے دور دور سے لوگ آئے اور ہمارے دارالعلوم کے مدرسین بھی ہیں، جن کا جانا ہر جگہ آسان نہیں ہوتا لیکن ان کو کس نے بلایا اور اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ یہاں کھانے پینے کی دعوت ہونے والی ہے یا نکاح ہونے والا ہے تو آپ سب یہ کہیں گے کہ اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے یہ اتنا نہیں جانتا کہ سنگ بنیاد دی پڑی ہے۔

لیکن انسان کھائے پئے بڑا ہو اور اس کی نسل چلے اور بعض اوقات علم میں آسمان کے تارے توڑ لائے اور بڑے بڑے سمندر وصحراء طے کرلے، لیکن اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ پہچانے، اس سے بڑھ کر جہالت کیا ہوسکتی ہے لیکن دنیا میں یہی ہو رہا تھا، کروڑوں انسان اپنے پیدا کرنے والے کو نہیں جانتے تھے، باپ کو جانتے تھے لیکن باپ کو کس نے پیدا کیا پھر اس کے باپ کو کس نے پیدا کیا؟ پھر اس کو اور حضرت آدمؑ تک چلے جایئے یہ کوئی نسب نامہ نہیں ہے لیکن ہم کو کس نے پیدا کیا، کائنات کو کس نے بنایا، زمین وآسمان کی کس نے خلقت کی، پہاڑ کس نے کھڑے کئے؟ یہ باغ کس نے آگائے؟ اور روزی کون دیتا ہے؟ اور اچھی بری تقدیر کس نے بنائی ہے اور کون موت وزندگی کا مالک ہے؟ آج اگر کوئی شخص ہندی نہیں پڑھا ہے تو لوگ کہیں گے کہ ان پڑھ ہے اور اگر اردو نہیں پڑھا ہے تو مسلمان کے حلقہ میں ناخواندہ کہیں گے اور عربی نہیں پڑھا ہے تو عرب کہیں گے امی ہے جاہل ہے لیکن اس سے بڑھ کر کیا جہالت ہوسکتی ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ جانے کہ وہی عبادت کا مستحق ہے دنیا اس سے بالکل ناآشنا تھی اور پھر اس کے بعد یہ حالت تھی کہ انسان کا خون ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں، عربی میں ایک شعر ہے۔

اذا لمهرة الشقراء ادرک ظهرها
فشب الاله الحرب بين القبائل

اس سے عربوں کا مزاج سمجھئے اوران کے سوچنے کا طریقہ کہ شاعر اپنے وقت کا پڑھا لکھا ہوتا ہے کہتا ہے کہ جب میرا گھوڑا جو سرخ رنگ کا ہے اس کی پیٹھ سواری ہو جانے اور سخت ہو جائے تو اللہ کسی نہ کسی قبیلہ میں جنگ چھیڑ دے تو میں اپنے جوہر دکھاؤں اسے شرم نہیں آتی کہ صرف اپنے گھوڑے کی تیزی دکھانے اور اپنی تلوار کی کاٹ دکھانے اور اپنا نام پھیلانے کے لئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی بہانے سے ان قبائل میں لڑائی چھیڑ دے،بس پھر مزے آ گئیں گے یہ ان کی عقل کا حال تھا اور اللہ کے علاوہ سینکڑوں چیزوں کی پوجا کی جارہی تھی،ہم نے ہندوستان کے آثار قدیمہ گجرات اور بڑے بڑے دور دراز علاقوں میں مہاراشٹر میں ہر جگہ دیکھے ہیں کہ دریا بھی پوجے جاتے تھے اور بعض جانور اور بلکہ ہم نے تو بعض آثار قدیمہ میں انسان کے اعضاء تناسل کی تصویر بھی دیکھی تو معلوم ہوا کہ کسی دور میں ان کی بھی پرستش ہوتی تھی اور انسانوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کا کیا سلوک تھا، کہ کسی کی جان، جان نہیں سمجھی جاتی تھی اور کسی کی عزت،عزت نہیں سمجھی جاتی تھی عورتوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا؟

" واذا الموؤدة سئلت" بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے کہ یہ بڑے جھگڑے کی چیز ہے کہ کہیں شادی ہوگی پھر ہماری نسبت کرنی پڑے گی کہ یہ داماد ہیں،ان کی یہ بیٹی ہے،اس لئے زندہ ہی درگور کر دیتے تھے،ہنستی بولتی بچی کو اپنے ہاتھوں سے زمین میں گڈھا کھود کر مٹی ڈال دیتے کہ کہیں رحم نہ آ جائے اس وقت انسانیت اپنے زوال،اپنے تنزل،اپنی پستی کے بلکہ حیوانیت کے آخری درجے تک پہنچ چکی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر خاتم الرسل کی بعثت فرمائی،آپ حرم شریف میں نماز پڑھتے اور دعا کرتے تو آپ پر اوجھڑی ڈال دی جاتی اور نہ جانے کیا کیا چیزیں ڈالی جاتیں اور پتھر اور ڈھیلے بھی آپ پر پھینکے جاتے تھے،جب آپ راستے سے گذرتے تھے اس وقت دارارقم ہی ایک جگہ تھی کہ جہاں پناہ لیتے تھے مسلمان اوران کو کلمہ پڑھنا ہوتا تھا تو وہاں چلے جاتے تھے اور اسلام لاتے اور نمازیں پڑھتے یہ تھا اس وقت کا نقشہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دین کے ذریعہ" من الظلمات الى النور "اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالا یہاں یہ ظلمت کا لفظ نہیں کہا قرآن نے اس لئے کہ ظلمتیں ہزار ہو سکتی ہیں

لیکن نور ایک ہی ہوگا، عربی زبان کے جو عالم ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ قرآن میں نور کی جمع کہیں نہیں آئی، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ نور کی جمع بلاغت کے خلاف ہے نور کی جمع انوار ہو سکتی ہے، لیکن اس لئے نہیں آئی کہ نور ہے ہی ایک، جب کوئی چیز ایک ہو تو اس کی جمع ہو ہی نہیں سکتی اگر کہیں مثلاً ایک عالم ہو تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہاں علماء ہیں، ایک حافظ ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہاں حفاظ ہیں اور اگر ایک مدرسہ ہو تو دارارقم جیسا، ہمیں معلوم نہیں غالباً اس کے آس پاس کوئی بڑا مدرسہ نہیں ہوگا، تو سارے قرآن مجید میں ظلمت کو جمع کے لفظ سے لایا گیا ہے، " یخرجکم من الظلمات " اللہ تعالیٰ تم کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکال لایا ہے تو نور ایک ہے اور وہ نور عرصہ کے بعد تقریباً ۵ اور ۶ سو سال کے بعد جب حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد تقریباً ۵ اور ۶ سو سال نکلتے ہیں کہ نور پہلی مرتبہ چمکا اور مکہ معظمہ سے چمکا اور دارارقم اس کی پناہ گاہ بن گیا اور وہی مسلمانوں کا مرکز بن گیا پھر اس کے بعد یہ نور تمام دنیا میں پھیلا اور آج اس کو پھر پھیلانے کی ضرورت ہے، کہ آج بہت سے علاقوں میں بہت سی قوموں میں اور بہت سے ملکوں کی آبادی میں یہاں تک کہ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک امریکہ اور برطانیہ جیسے ملکوں کو دیکھا ہے کہ جیسے نہ دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ہے نہ اسے مر کر کہیں جانا ہے اور نہ حساب دینا ہے، ہم نے واشنگٹن میں ایک تقریر میں کہا تھا جب قاری صاحب نے یہ آیت تلاوت کی " ولولا اذدخلت جنتک قلت ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ " ایسا کیوں نہیں ہوا دو بھائی تھے دوست تھے، ایک کے کچھ باغات تھے کچھ کھیتی تھی ایک کچھ پیسے والا تھا وہ فخر کرنے لگا کہ میرے پاس یہ اور یہ ہے تو دوسرے نے کہا ارے تم جب اپنے باغ میں آئے تھے ایسے پھلتے پھولتے باغ میں گلزار میں آئے تھے تو اللہ کو یاد کرتے اور یوں کہتے " لو لا اذدخلت جنتک........ " اللہ جو چاہے جس کو چاہے دے تو ہم نے کہا کہ آج امریکہ کا یہی حال کہ اللہ نے سب نعمتیں دی ہیں لیکن کوئی ماشاء اللہ کہنے والا نہیں ہے یہ کوئی نہیں کہتا کہ یہ اللہ کا دین ہے، یہ اللہ نے دیا ہے ہم کو۔

آج بھی دنیا میں بہت سے ترقی یافتہ ممالک ہیں کہ وہاں نہ اپنے خالق کی پہچان ہے اور نہ پیدا کرنے والے کی، اگر ہے تو عیسائیوں میں کہ ہاں ہم کو اللہ نے پیدا کیا " گاڈ " کہیں یا اور کچھ کہیں مختلف ملکوں میں الگ الگ نام ہیں لیکن اس کی ہدایت پر چلنا اس کو راضی کرنے کی

کوشش کرنا اس کے خلاف کرنے میں ڈرنا، اور بچنا اور اس کے پیدا کئے ہوئے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھنا ان کی عزت کرنا اور ان کی مدد کرنا جب کوئی ایسا موقع آئے مدد کرنے کا، ان کی مدد کرنا، جب کوئی ایسا موقع آئے مدد کرنے کا، ان کی حفاظت کا، ان کو ہلاکت سے بچانے کا، تو آگے بڑھنا یہ سب چیزیں پورے پورے ملک میں بعض جگہ نہیں پائی جاتیں، یہ سب فیض ہے نبوت محمدی کا اور نور محمدی کا اور وہی دارارقم اور شعب ابی طالب کی قربانیوں کا، بدر، احد، حنین اور جو غزوات ہوئے ہیں ان سب کا کہ اللہ تعالی نے آج اسلام کو سارا دنیا میں پھیلا دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان بدر میں فرمایا تھا یا اللہ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں ان میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے اگر گنتی پر فیصلہ ہو یا ہتھیاروں پر فیصلہ ہو یا جنگ کے تجربہ پر فیصلہ ہو تو یہ مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن ایک بات حضورؐ نے فرمائی اور یہ آپ ہی فرما سکتے تھے ہر ایک کی جرأت نہیں ہے،'' وان تھلک ...... ''میں کہتا ہوں کہ اگر تو نے اس مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ چھوڑ دو اسباب پر کہ اگر طاقتور ہیں تو کمزوروں کو ختم کر دیں، یہی دنیا میں اکثر ہوتا ہے'' وان تھلک ھذہ العصابۃ لن تعبد'' اگر تو نے اس مٹھی بھر جماعت کی ہلاکت کا فیصلہ فرمالیا تو ایک کی یعنی تیری عبادت نہیں ہوگی، یعنی عبادتیں تو ہوں گی لیکن تنہا تیری عبادت نہیں ہو سکے گی، یہ آپ ہی فرما سکتے تھے، یہ آپ ہی کا مقام تھا لیکن یہ واقعہ ہے تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے، کہ آج یہی خدائے واحد کا نام لینے والی امت جو کہتی ہے'' لا الہ الا اللہ'' خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی خالق نہیں، کوئی نفع وضرر کا مالک نہیں، کوئی قسمت بنانے بگاڑنے پر قادر نہیں، کوئی جلانے مارنے کی طاقت رکھنے والا نہیں کوئی رزق دینے والا نہیں یہ صرف یہی امت کہتی ہے اور آج ضرورت ہے دو چیزوں کی ایک تو اس کی کہ اپنے اندر اس ایمان کو تازہ کیا جائے اور اس نور کو پہلے اپنے قلب ودماغ میں بسایا جائے پھیلایا جائے اور اس کے بعد اس کو باہر نکالا جائے، وہ نور دوسروں تک پہنچے جہاں تک تعلق ہے نجات کا نجات کیلئے شاید کافی ہو جائے لیکن رفع درجات کیلئے کافی نہیں ہے اس کے لئے ضرورت ہے دوسروں میں کوشش کرنے کی کہ اپنے آس پاس کے گاؤں میں جو ہمارے غیر مسلم بھائی رہتے ہیں انسانیت کے لحاظ سے ہمارا ان سے رشتہ ہے اور ان کا ہم سے رشتہ ہے اور ہم ان کو بھی ایک خدائے واحد کی معرفت عطا کرنے کی اور ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کریں کہ اس کائنات کا زمین وآسمان کا اور ان سارے ملکوں کا، خشکی

وتری کا اور پہاڑوں اور دریاؤں کا درختوں اور پھلوں کا یا جو کچھ بھی ہے جن کو اپنے اپنے وقت پر معبود بنایا گیا سب کا پیدا کرنے والا ہے ایک وہی جلاتا اور مارتا ہے،'' یحیی ویمیت'' وہی رزق دیتا ہے تو ان دو چیزوں کی ضرورت ہے، بڑی خوشی کی بات ہے کہ جب ہم نے دارارقم کا کپڑا (بینر) لگا ہوا دیکھا تو اس پر یہ مضمون ہمارے ذہن میں آیا کہ دارارقم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آج وہ کسی بڑے سے بڑے دارالعلوم اور جامعہ'' اسلامک یونیورسٹی'' کی دانشگاہ کا کسی تحقیقی مرکز کا کسی کا کوئی احسان کا کوئی نسبت نہیں ہے اور سوئی بھی نہیں ہے جو دارارقم سے اللہ تعالی نے فیض پہونچایا یہ بہت مبارک نام ہے لیکن ضرورت ہے کہ ایسے دارارقم کئی بنیں وہ تو ایک تھا لیکن یہ کہ معنوی حیثیت سے اور کام کی نوعیت کی حیثیت سے اور دعوت ومقصد کی حیثیت سے جا بجا دارارقم ہونے چاہئیے مدارس ومکاتب ہونے چاہئیے اس میں پہلا کام یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو وہ ذریعہ حاصل ہو جائے جس سے وہ دینی کتابیں پڑھ سکیں اور اللہ ورسولؐ سے واقف ہو سکیں ان کا زیادہ تر ذخیرہ اردو میں ہے جو عربی کے بعد سب سے زیادہ علمی ذخیرہ اور دینی ودعوتی ذخیرہ ہے، ہماری معلومات کے اعتبار سے وہ اردو میں ہے اردو فارسی سے بڑھ گئی اردو یا عربی نہیں ہے، یا پھر اس کے بعد اردو میں ہے اور اردو میں بھی بعض بعض ایسی چیزیں ہیں کہ عرب ترجمہ کرنے کے خواہشمند ہیں ہم سے بارہا کتنی کتابوں کے متعلق لوگوں نے کہا جب کہ سیرۃ النبی کے متعلق کہا اور خطبات مدراس کا ترجمہ تو ہو چکا ہے، بچیوں کو وہ تعلیم دیجئے جس سے وہ بے تکلف اردو پڑھ سکیں، قرآن شریف کی تلاوت کر سکیں اور کفر وایمان کا، توحید وشرک کا فرق سمجھ سکیں اور معصیت وطاعت کا فرق سمجھ سکیں، اللہ کے محبوب پیغمبر حضورؐ کے حالات پڑھ سکیں اور معلوم کر سکیں اور دوسروں کو بتا سکیں یہ رسم الخط یعنی'' اسکریٹ'' یہ کنجی ہے یہ ایک بڑے مغربی مورخ فلسفی نے لکھا ہے کہ اب کسی کتب خانے کو چلانے کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض زمانوں میں ہوا ہے اور جیسا کہ لوگوں نے مسلمانوں پر بھی الزام لگایا ہے، اسکندریہ کتب خانہ کے متعلق اور وہ غلط ثابت ہوا، تو اب کسی کتب خانے کو چلانے کی ضرورت نہیں، اب صرف رسم الخط بدل دینا کافی ہے، ہم نے ترکی میں دیکھا ہے پوری نسل عربی رسم الخط سے عربی کتابوں کو براہ راست پڑھنے سے قاصر ومحروم ہے۔

ایک کام تو یہ کہ بچوں کو دینی تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ'' کنجی'' ان کو دی جائے، کنجی کیا

ہے؟ وہ ہے اردو کی تعلیم، اردو لکھنے پڑھنے کی قابلیت ہو پھر اس کے بعد اللہ توفیق دے تو عربی مدارس میں بھیجئے، اس طرح مکاتب قائم کیجئے اور جال پھیلا دیجئے، پھر اس کے بعد علم کی تکمیل کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کیجئے، جو ذہین ہوں محنتی ہوں، سعید ہوں ان کو بھیجئے کسی بڑے مدرسہ میں تا کہ وہ اس قابل ہوں کہ وہ آپ کو مسئلہ بتا سکیں اور آپ کو حلال وحرام کا فرق بتا سکیں کہیں آپ سے ناواقفیت میں کوئی غلطی نہ ہو جائے، روزہ نماز کے مسائل اور نماز کا سیکھنا سکھانا بھی ہوگا، اور پھر نکاح وطلاق کے مسائل ہیں اور عائلی زندگی کا قانون ہے، یہ سب اس میں رہنمائی کر سکیں اور پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ ورسول کی باتیں بتا سکیں جس سے آپ کا ایمان تازہ ہو، اپنے آس پاس کے جو غیر مسلم بھائی ہیں، ان کو آپ اسلامی اخلاق کا نمونہ دکھائیں، ان کو یہ محسوس کرائیں کہ کیا مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں، اس موقع پر ہم نے انگلستان میں بھی سنایا تھا کہ حضرت سید احمد شہید ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان کی جماعت میں ان کے اطراف بھی شامل ہوئے ہوں جب انھوں نے پشاور فتح کیا تو وہاں کئی دن ٹھہرنا پڑا۔ ایک دن ایک پشاور پٹھان نے ہندوستان کے ان قصبات کے کسی مسلمان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ او ہندوستانی بھائی، آپ سے ایک بات پوچھتے ہیں، صحیح صحیح بتایئے گا کہ کیا ہندوستان کے لوگوں کی دور کی نگاہ کمزور ہوتی ہے، انھوں نے کہا کہ نہیں کمزور نہیں ہوتی ہے، کہا نہیں ضرور کمزور ہوتی ہے، انھوں نے کہا کہ نہیں خدا کا شکر ہے کسی کی کمزور ہوتو ہو، لیکن عام طور پر کمزور تو نہیں ہوتی اور نہ خصوصیت ہے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ آپ پوچھ کیوں رہے ہیں، تو کہا ہم آپ لوگوں کو جانتے ہیں کہ آپ میں سے کوئی دو برس کا نکلا ہوا ہے کوئی چھ ماہ سے اپنے گھر والوں، بیوی، بچوں کو چھوڑ کر آیا ہے اور آپ جوان بھی ہیں اور ایسے جوان ہیں مضبوط کہ لڑنے کیلئے جہاد کے لئے نکلے ہیں ہم نے آپ میں سے کسی کو نہیں دیکھا جو یہاں کسی عورت کو تاک رہا ہو کسی نامحرم کو دیکھ رہا ہو، اور دوسری فطری بات تھی کہ اگر اس طرح لذت نہیں حاصل کر سکتے اس طرح لذت حاصل کر لیں لیکن یہ بھی نہیں تو ہم نے فیصلہ کیا کہ آپ لوگوں کو شاید دور کی چیز نظر ہی نہیں آتی، تو جواب میں کہا کہ نہیں بلکہ اللہ تعالی فرماتا ہے" **قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم** "مؤمنوں سے ایمان والوں سے کہدو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور یہ ہمارے جو امام اور مرشد ہیں ان کی صحبت کا فیض ہے۔

اس لئے آپ بھی اپنے اخلاق میں افتخار و امتیاز پیدا کریں کہ آپ کو دیکھ کر سمجھ جائیں کہ مسلمان یہ نہیں کرے گا، اس سے اطمینان ہو، دوسری بات یہ کہ یہ احساس دلائیں کہ وہ جانیں کہ ان کا پیدا کرنے والا کون ہے، کون ان کی عبادت کا مستحق ہے۔

وہی نفع ونقصان پہونچا سکتا ہے، اس کا نام لینے سے فائدہ ہے یہ دوسرا فرض ہے، آپ کا یہ فریضہ بھی دارارقم سے ادا ہوا تھا، خدا کرے دارارقم اس ہدایت کا اس توفیق کا مرکز بن جائے اور جا بجا ایسے دارارقم بنیں چاہے نام مختلف ہوں لیکن مقصد ایک ہو اور کام ایک ہو کہ پہلے اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دینا اور ان چیزوں سے بچنے کی ان کی صلاحیت پیدا کرنا جو خدا کے عذاب کے مستحق بناتی ہیں اور جہنم واصل کرتی ہیں ان چیزوں سے نہ صرف دور رہیں بلکہ ان سے ڈر ہو خوف ہو اور وہ طہارت کی، انسانیت کی اور شرافت کی اور پھر ایمان اور دین کی زندگی گذاریں اور پھر یہ روشنی ہمارے آس پاس پھیلے۔

وقت کا سب سے بڑا جہاد

ذیل کا مضمون حضرت مولانا رحمت اللہ کا وہ بصیرت افروز خطبۂ صدارت ہے جو کل ہند دینی تعلیمی کنونشن منعقدہ بلکھنؤ مورخہ 2 نومبر 93ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شبلی لائبریری کے وسیع ہال میں پڑھا گیا۔

الحمد للہ رب العالمین

والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرات! ہمارا آپ کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی اور تعلیم کے لئے اور اپنی ذات کی معرفت عطا کرنے اور اس کا صحیح تعارف کرانے کیلئے (جو عقل وقیاس سے ماوراء ہے اور جس کی کوئی مثال اور نظیر اس دنیا میں موجود نہیں ہے) انبیاء علیہم السلام کے گروہ کو منتخب فرمایا۔ اپنے کلام اور پیغام کے ذریعہ پہلے ان کو پھر ان کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنی ذات وصفات کا صحیح اور مستند علم عطا فرمایا اور اپنے منشا اور احکام اور زندگی گزارنے کے پسندیدہ طریقہ سے آشنا کیا، اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔

وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء

اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ تم کو غیب پر مطلع کردے غیب کی باتیں بتانے کیلئے تو اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔

اللہ کی ذات وصفات اس کی بندگی کے صحیح قاعدے اور زندگی گزارنے کے پسندیدہ طریقہ کو معلوم کرنے کا اور ان پیغمبروں کی اطلاعات اور تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں یہ عقل وذہانت، قیاس آرائی اور طبع آزمائی خواہشات اور قومی رسم ورواج کا میدان نہیں ہے اس کے لئے اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ اس دنیا کو پیدا کرنے والا خود اس کی خبر دے اور وہ اس کی خبر پیغمبروں کے ذریعہ ہی دیتا ہے اس لئے کہ اس علم وہدایت کا ذریعہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں، قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت طریقۂ زندگی کے صحت اعمال کی قبولیت

اور کامیاب انفرادی اجتماعی زندگی گزارنے کی صلاحیت اسی گروہ انبیاء علیہم السلام کی

تعلیمات کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہے انہیں کی تعلیم کیے ہوئے عقائد، انہیں کے دیئے ہوئے حقائق، انہیں کا طریقہ زندگی انہیں کی تعلیم کی ہوئی معاشرت اور اخلاق واصول افراد کی نجات و مقبولیت اور معاشروں (SOGIFTIES) اور ملکوں و معاشروں کی سلامتی اور امن وامان کی ضامن ہیں۔

اس زمانہ کا چیلنج یہ ہے کہ اسلام کو اس کی جداگانہ تہذیب اس کی مخصوص معاشرت، اس کے عائلی قانون، اس کے وسائل معرفت اس ملک اس کے ماننے والوں کی نسلی زبان وادب رسم الخط اور اس کے پورے دینی وتہذیبی ورثہ سے الگ کردیا جائے اور اسلام چند عبادات اور چند رسوم وتقریبات (جو بعض مذاہب کا کل سرمایہ اور بعض قوموں کا واحد مذہبی نشان ہے) اسی میں انہیں مذہبی ومعاشرتی رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ مسلمانوں سے کبھی اشارۃً کنایۃً اور کبھی صاف صاف کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے رنگ ومزاج سے اپنی جداگانہ تہذیب اور ہر اس چیز سے بے تعلقی اختیار کرلیں جو ان میں الگ ملت اور ایک مستقل تہذیب کا وارث ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ خود ہی اعلان کردیں کہ ہم کسی جداگانہ تہذیب کے حامل نہیں۔ وہ خود اپنے عائلی قانون (Personallaw) میں اصلاح وترمیم کا مطالبہ کریں یا پیش کیا جائے تو اس کو قبول کریں وہ اپنے تمام تعلیمی مرکزوں کو جو انہوں نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق قائم کئے تھے حکومت کی تحویل وانتظام میں دے دیں اور ان کے نظم ونسق سے خود دست بردار ہوجائیں تاکہ ان سے ایک نئی طرز کے نمونے (MODELS) تیار کئے جائیں اصل خطرہ نسل کشی کا نہیں معنوی ارتداد اور ذہنی وتہذیبی نسل کشی کا ہے اس خطرہ کو دیکھنے اور اس کو محسوس کرنے کیلئے کسی بڑی فراست اور دوربینی کی ضرورت نہیں یہ تو دیوار کا نوشتہ ہے جس کو ہر ایک پڑھ سکتا ہے اور اب تو بعض برسر اقتدار پارٹیوں اور علاقائی حکومتوں نے نصاب تعلیم کی تبدیلی ہندی زبان کو لازمی قرار دینے اور اس کی جبریہ تعلیم اور ایک نئی تاریخ ترتیب دینے کے اعلان کے ذریعے اس کا فیصلہ اور پالیسی کے طور پر اعلان بھی کردیا ہے۔

"یہ سلطانی جمہور" کا زمانہ ہے ہمارے اوپر پارلیمنٹ اور ریاستوں میں اسمبلیوں کی حکومت ہے اور ان کو آئین سازی کا پورا اختیار ہے پھر حکومت کا دائرہ پہلے کی طرح دفاع، امن قائم کرنے اور ٹیکس وصول کرنے کی حد تک محدود نہیں وہ زندگی کے تمام شعبوں اور تعلیم و

تربیت کے تمام ذرائع پر حاوی ہے آپ کو معلوم ہے کہ پرانی حکومتیں پرائیویٹ معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں ذاتی ملکیتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا آزاد درسگاہوں سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا پرسنل لاء سے ان کا کوئی علاقہ نہیں تھا تعلیم میں کسی خاص عقیدہ، کسی خاص فکر ومقصد و پر ان کو اصرار نہ تھا لیکن اب یہ صورتحال نہیں۔

ایک ایسے ملک کی جمہوری حکومت کیلئے جس کے باشندے اور اس کی آبادی کے مختلف عناصر نسلوں اور صدیوں سے مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں (Cultures) اور طرز معاشرت کے نہ صرف عادی بلکہ ان پر عقیدہ رکھتے ہوں اور وہ ان کو جان ومال سے عزیز رکھتے ہوں نیز وہ حکومت دانشمندانہ اور تجربہ کارانہ نقطہ نظر سے نانذہبیت (Sehularism) اور عدم تشدد (Non Violence) کے اصول کو تسلیم کر چکی ہو اور اس ملک کے اتحاد و باہمی اعتماد امن سکون اور ترقی وخوشحالی کے امکانات کے لئے ضرورت سمجھی ہو اور انہیں تینوں اصولوں (جمہوریت نانذہبیت اور عدم تشدد) کو ملک کی آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والوں اور اسمیں کامیاب ہونے والے دانشمند رہنماؤں نے اپنی وسیع مطالعہ عمیق فکر ونظر اور حقیقت پسندی اور حب الوطنی کی بنیاد پر اس ملک کے لئے ضروری سمجھا ہو اور اس کو بنیادی اصول کا درجہ دیا ہو جس کی صداقت اقوام متحدہ اور ملل کی وسیع تاریخ اور عملی تجربہ سے حاصل ہو چکی ہو اور اس کا کوئی متبادل طریقہ کار نہ ہو یہ ضروری ہے کہ ملک کے آئین عدالتوں کے فیصلے اور نظم ونسق (Administration) کی مساوات اور غیر جانبدانہ طرز عمل کے ساتھ اس ملک کی تعلیم گاہوں پرائمری اور سیکنڈری (Primary and Secondary) ایجوکیشن سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں تک مرحبہ نصاب تعلیم کسی ایک فرقہ کے (خواہ وہ کھلی اکثریت میں ہوں) عقائد، روایات تہذیب وتمدن اور رسم ورواج کا ترجمان وکیل اور انہیں کا آئینہ دار نہ ہو اور نہ وہ ملک کی تاریخ کو اس طرح پیش کرے کہ کسی فرقہ اور مذہب کے ماننے والوں سے پڑھنے والوں میں نفرت اور کم سے کم ان کی حقارت دل ودماغ میں پیوست ہو کر اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اکثریت کے مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) خیالات و روایات بلکہ عقائد دیومالا (Mythology) کی تلقین ہوتی ہو اس طرز عمل سے ملک کی آبادی مختلف عناصر میں جن کو اپنا مذہب عزیز ہے یا تو شدید منافرت پیدا ہوگی یا بعض فرقوں میں احساس کمتری

(Ineferiority Complex) پیدا ہو گا۔ جو ملک کی ترقی و خوشحالی اور جوش و خروش سے کام کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے میں مزاحم ہوگا اور اس کا بھی اندیشہ (اور اندیشہ ہی نہیں اس کا تجربہ بھی ہو چکا) ہے کہ اقلیتی فرقہ اور ملک کے ایک بڑے باصلاحیت اور مفید طبقہ میں اس کا شدید ردعمل (Reaction) پیدا ہو، اور وہ ملک کی ترقی اور اس کی شہریت اور نا موری میں مزاحم ہو، اور بات یہاں تک پہنچے کہ جس کو اپنا مذہب اپنی تہذیب بلکہ اپنی تاریخ بھی عزیز ہے وہ اس نظام تعلیم اس کے مرکزوں کے مقاطعہ پر مجبور ہو، اور اپنی نئی نسل کی تعلیم کا متبادل انتظام کریں اور اس میں ان کی توانائیاں اور وسائل معیشت اور اس سے بڑھ کر ان کی توجہ اور قوت عمل کا بڑا حصہ اس پر صرف ہو۔

اس کے ساتھ اس کا بھی خطرہ ہے کہ جمہوری ملک ہونے کی وجہ سے آبادی کا کوئی ایسا عنصر اقتدار میں آ جائے جس کے مذہبی عقائد اور تہذیب و معاشرت سابق صاحب اقتدار جماعت سے اختلاف رکھتے ہوں تو وہ اس پورے نصاب کو تبدیل کرنے کا ارادہ کرلے اور اس میں ملک قوم کی توجہ اور توانائی کا بڑا حصہ (جو دوسرے میدانوں میں صرف ہونا چاہئے تھا) اس پر صرف ہو اور اس طرح ملک کا نصاب تعلیم عجیب عجیب تبدیلیوں اور تجربوں کا نشانہ اور اختلاف کا بڑا میدان بن جائے بلکہ اس کا اندیشہ ہے کہ وہ "بازیچہ اطفال" اور تنگ نظری اور جارحانہ ذہنیت کا آلہ کار نہ ہو جائے۔

افسوس ہے کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد ہی اس ملک کے اقلیتی فرقوں، بالخصوص مسلمانوں کو (جو اس ملک میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مذہبی، ثقافتی تہذیبی تاریخی اور سیاسی نقشہ میں کم سے کم دوسری سب سے بڑی حیثیت کے مالک ہیں) اس افسوسناک صورتحال کا 47ء کے بعد ہی تجربہ ہوا اس وقت خطرے سے بچنے کیلئے ایک ممتاز دانشمند و دردمند قائد و مفکر قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم کی دعوت و تحریک پر 1959ء میں دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا، اور اس کی پہلی صوبائی دینی کانفرنس 30/31 دسمبر 1959ء کیم جنوری 1960 میں بستی میں منعقد ہوئی کچھ عرصہ کے بعد اس تنظیم کے ایک بڑے مخلص اور لائق کارکن ظفر احمد صاحب صدیقی وکیل مرحوم نے اس وقت کے مروجہ نصاب کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا اور اس کے ان حصوں کو پیش کیا جو مسلمان عائد و مسلمات اور ان کے دین و مذہب سے نہ صرف کھلا تضاد

رکھتے تھے اور جن کو قبول کر لینے کے بعد (ایسی حالت میں کہ کتاب ایک بڑی سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جب کسی چیز کو حق بجانب ثابت کرنا ہوتا ہے تو اتنا کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ "یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے" طالب علم مسلمان نہیں رہ سکتا تھا، یا کم سے کم وہ سخت ذہنی کشمکش اور اپنے قوم اور خاندان سے کٹ جانے پر مجبور ہوتا تھا، یہ وہ اقتباسات تھے جن کو پڑھ کر ہر انصاف پسند آدمی یہی فیصلہ کرے گا اور جو ریاضی کے نتائج کی طرح ظن وقیاس اور اختلاف رائے سے دور اور بے گانہ ہے اور جس کو سن کر اس بارہ میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ان چیزوں کے مان لینے کے بعد طالب علم کا مسلمان رہنا بھی مشکوک ہو جاتا ہے اور اگر وہ نہیں مانتا اور اختلاف کرتا ہے تو اس نصاب تعلیم پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ اپنے مقاصد میں ناکام ثابت ہوتا ہے جو کسی تعلیمی نصاب اور منصوبہ کے لئے کوئی خوش آئند اور قابل مبارکباد نہیں بلکہ اس کی ناکامی کی دلیل ہے۔

پورے نصاب تعلیم کی تبدیلی ایک نئی تاریخ کی وضع وتدوین تو بڑے وسیع اور انقلاب انگیز منصوبے ہیں۔ رسم الخط (SCRIPT) کی تبدیلی ہی قدیم تہذیبی، علمی اور مذہبی سرمایہ سے رشتہ ختم کر دینے اور ان سے بیگانہ بنا دینے کے لئے کافی ہے، آرنلڈ ٹوآئن بی (ARNOLD TOYIN BEE) جو اس زمانہ کا فلسفی مورخ ہے، نے لکھا ہے، (PHILOSOPHER HISTORIAN) کہ اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں رسم الخط (SCRIPT) بدل دینا کافی ہے، اس سے اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے بالکل ٹوٹ جائے گا اور اس کی پوری تہذیب اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ جائے گی، پھر جس طرح چاہو اس کو لے جاؤ، جو چیز کسی ملت کو اس کے ماضی سے اس کے مذہب سے، اس کی تہذیب سے، اس کے کلچر سے ملاتی ہے، وہ رسم الخط ہے، رسم الخط بدلا نسل بدل گئی، آج ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے، فرقہ وارانہ فسادات محض ملک کو بدنام کرتے ہیں، فائدہ ان کا کچھ نہیں ہے، تعلیم کا نظام کافی ہے، آج سے ۶۰، ۷۰ برس پہلے اکبر مرحوم نے کہا تھا۔

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اس سے زیادہ لطیف انداز میں انھوں نے اس حقیقت کو اپنے مشہور شعر میں بیان کیا

ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ان کے ذہن میں کالج کا وہ تصور رہا ہوگا، جس میں صرف قبطی زبان پڑھائی جاتی ہو اور ایسی تاریخ جس میں فراعنہ کی الوہیت ان کے غیر محدود وغیر مشروط اختیارات کا اور مصر کی دوسری نسلوں اور قوموں (بنی اسرائیل اور بیرون مصر سے آئی ہوئی قوموں) کی تحقیر آمیز تصویر اور نفرت انگیز تاریخ پیش کی گئی ہو۔

حضرات: آج ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل کو کیسے بچایا جائے، کیسے مسلمان رکھا جائے؟ اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی وعزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت ودستور آئین کا بھی فیصلہ ہے، لیکن یہ مطلب اس کا ہرگز نہیں ہے کہ اپنی خصوصیات، اپنے عقائد وشعائر، اپنی زبان، تہذیب، اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو جان سے زیادہ عزیز ہیں اس ملک میں رہیں کہ اس طرح رہنے سے وطن وطن نہیں رہ جاتا بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے، جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے، ہمارا خمیر ضرور اس ملک کی خاک سے تیار ہوا ہے اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے لیکن ہمارا ضمیر، اسلامی تعلیمات، اسوۂ رسول، کتاب وسنت اور اسلام کی اس معیاری، قابل فخر اور بینظیر تاریخ کا ساختہ پرداختہ ہے، جو پوری انسانیت کا قابل فخر سرمایہ اور لائق تقلید نمونہ ہے، ہماری تہذیب ابراہیمی محمدی ہے، جس کی بنیاد توحید خالص، خوف وخدا، عقیدۂ آخرت انسانیت کے احترام اور خاندان ونام ونسب، ونسل وطن کے اختلاف سے آزاد ہو کر نسل انسانی کی مساوات پر ہے، مسلمان جس ملک میں بھی رہے گا، اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو، اس کی تہذیب ابراہیمی محمدی ہو گی، ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر وترقی میں شریک اور اس کی دستور سازی میں دخیل ہیں اس لئے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری، انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے، اور اس حق کو جب بھی

چھیننے کی کوشش کی گئی اس سے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔

جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے۔اس کے لئے دینی تعلیم اور دین کی واقفیت کی وہی حیثیت ہے جو ایک انسان کیلئے ہوا، پانی کی ہے۔ایک مسلمان کو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنے کیلئے ،مسلمان کہلانے کے لئے اور پھر آخرت میں خدا اور اس کے رسول کو منہ دکھانے اور نجات حاصل کرنے کیلئے بنیادی دینی عقائد کے جاننے کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے کہ ایک انسان کو زندہ رہنے کیلئے ہوا پانی کی ،اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ،یہی وہ نسبت ہے ،جس کا حضرت یعقوب علیہ السلام دنیا سے کوچ کرتے وقت (حالت احتضار میں) اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے،انھوں نے اپنے سب فرزندوں ، پوتوں ،نواسوں کو جمع کر کے(اور وہ ماشاء اللہ کثیر اولاد تھے) دریافت فرمایا کہ" ماتعبدون من بعدی"(میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟) یہ بات انھوں نے کس سے کہی تھی؟ ان سے کہی تھی جو نبی زادے تھے، نبی کے پوتے تھے، نبی کے پڑپوتے تھے، گویا انھوں نے زبان حال سے کہا کہ میری پیٹھ قبر کی زمین سے نہ لگے گی جب تک دنیا سے یہ اطمینان لے کر نہ جاؤں کہ تم خدائے واحد کی پرستش کرتے رہو گے۔

آج اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اس نسل کو کیسے بچایا جائے ،سرکاری تعلیم کی اصلاح کی کوشش کے ساتھ دینی تعلیم کا کوئی متوازی نظام بھی چلانا چاہیئے ۔اسی بنیاد پر دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی اور اس کی دعوت جدوجہد سے ہزاروں مکاتب ومدارس قائم ہوئے ملک کی موجودہ سیاسی تبدیلیوں ،اور انتخابی نتائج اور مذہبی عصبیت پیدا کرنے کی بعض مواقع کے بہم ہو جانے یا پیدا کر لینے کی وجہ سے اس دینی ، ذہنی اور تہذیبی نسل کشی کا خطرہ کئی گنا بڑھ گیا ہے ،اس وقت کا اہم ترین کام نظام تعلیم کی اصلاح کا مطالبہ اور اس کے لئے جدوجہد کے ساتھ آزاد دینی مکاتب ومدارس کے قیام اور مساجد اور گھروں میں ضروری دینی تعلیم اور مبادی دین کی تلقین ،اردو پڑھنے لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے مراکز اور مواقع پیدا کرنے کی جدوجہد ہے اور اس کو مقبول ترین عبادت ،رضائے الٰہی کا ذریعہ اور اس ملک میں حفاظت دین کا واحد طریقہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آزاد مکاتب ومدارس ،صباحی ،شبیہ حلقہائے تعلیم اور گھر کی دینی تعلیمی تربیت ،اسلامی

اصول اور اخلاق کی پابندی، راست گوئی و راست روی، اور سیرت و تعلیمات نبوی سے واقفیت کے عمومی و موثر انتظامات سے صرف ملت ہی کو فائدہ نہیں پہونچے گا، بلکہ یہ پورے ملک اور جمہوریہ ہند کے مفاد میں بھی ہے، جو تیزی سے اخلاقی زوال، خود پرستی، دولت پرستی اور عمومی بد نظمی اور کرپشن کی طرف جا رہا ہے۔ اس اسلامی تعلیم و تربیت کے اثر سے خاصی تعداد میں وہ طبقہ پیدا ہوگا جو اس حد تک دولت کا پجاری نہیں ہوگا جو اس حد تک یہ وبا ملک میں پھیل گئی ہے، اس کو کسی نہ کسی درجہ میں خدا کا خوف اور خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کا عقیدہ اس انتہا تک پہنچنے سے باز رکھے گا، جس انتہا تک خالص مادی تعلیم نے پہنچا دیا ہے، نبی رحمت کی امت کو اپنے ملک، ماحول اور سماج کے لئے امت رحمت اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے ایک فرض شناس، رحم دل اور ماہر ملاح (کشتی بان) کا کردار (PART) ادا کرنا ہے، جس کی موجودگی میں اس ملک کو تباہ ہونا اور اس کی کشتی کو ڈوبنا نہیں چاہیئے، اس لئے یہ کام تنہا مسلم فرقہ کے مفاد میں نہیں، ملک کے مفاد میں ہے اور اس کو انجام پانا چاہیئے۔

حضرات: آپ اس تعلیمی مسئلہ کو اپنے ایمان و یقین، اپنے عزم و فیصلہ، جوش و ولولہ کار سے حل کرنے کی کوشش کریں، اگر آپ نے یہ شرطیں پوری کر دیں تو یہ مشکل آسان اور یہ عقدہ حل شدہ ہے، اقبال نے سچ کہا ہے۔

نشان یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

چراغ زندگی اور دستور العمل

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ نے مدرسہ ضیاء العلوم تکیہ کلاں رائے بریلی میں مدرسہ کے طلباء و اساتذہ کرام کی موجودگی میں پر اثر تقریر فرمائی جو مدارس اسلامیہ کے طلباء کے لئے مشعل راہ اور دستور العمل ہے۔

نحمده ونصلی علیٰ رسوله الكريم اما بعد فاعوذ بالله من الشطين الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم وان ليس للانسان الا ماسعى وان سعيه سوف يرى ثم يجزاه الجزاء الاوفى."

میرے عزیزو! میں سوچتا رہا ہوں کہ آپ سے خطاب کرنا ہے اور بہت عرصہ کے بعد آپ سے بات کرنی ہے حق ادا کرنے کی کوشش کرنی ہے جو حق ہم پر عائد ہوتا ہے وطنیت کا بھی، جوار کا بھی اور علمی اشتراک کا بھی اور مقصد کے اتحاد کا بھی اور دعوت کے تقاضوں کا بھی کیا کہا جائے کہنے والی باتیں تو بہت ہیں وقت تھوڑا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت دل میں ڈالی جس میں پورا پیغام ہے آپ کی زندگی کا پورا نظام اس کے اندر ہے، زندگی کس طرح گزارنی چاہیے زندگی کے لئے کیا سامان پیدا کرنا چاہیے زندگی دینی زندگی ہو، علمی زندگی ہو، دعوتی زندگی ہو، اصلاحی زندگی ہو ان سب کے لئے کس طرح تیاری کرنی چاہیے اور اس تیاری کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس لئے کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ اس کو فائدہ بھی معلوم ہونا چاہیے کونسی کوشش کا کیا فائدہ ہے؟ فلاں دوا کا کیا خاصا ہے؟ فلاں بیج کا کیا مادہ ہے؟ اور فلاں میدان کا کیا تقاضا ہے؟ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ذہن میں القاء فرمائی اور دل میں ڈالی جس میں پوری زندگی کا نظام آ گیا ہے اور پورا قانون آ گیا ہے اور آپ اس آیت کو سمجھ لیں اس کو اپنا دستور العمل اور اپنا رہنما بنا لیں اور اس آیت کی صداقت پر آپ ایمان لے آئیں اور یقین کر لیں اور دل میں اس کو اتار لیں اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہے دنیا کے تمام حکماء اور

بڑے بڑے ذہین لوگ بھی کوئی بات کہتے ہیں کہ یہ ہوگا اور ایسا ہوگا اس کا یہ نتیجہ نکلے گا تو اس کا پورا سو فیصدی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زندگی کا تجربہ ہے اور تاریخ کا مطالعہ ہے کہ کتنے آدمیوں کی پیشین گوئی غلط نکلی اور کیسے کیسے فائدے فلاں فلاں چیزوں کے بتائے گئے تھے ان میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ پوری تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ فرمادے کہ اس کا یہ خاصا ہے یہ کرو گے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ تو پھر اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا پھر ایسی کیا بات ہے کہ کہی جائے کہ اس کو آپ اپنے دستور العمل بنالیں اس کو اپنا چراغ زندگی بنالیں اور اس کی روشنی میں آپ چلیں۔

کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا

یہ آیت جو ہم نے پڑھی ہے یہ خاص طور پر ہماری تعلیم گاہوں کے لئے اور اصلاحی مراکز کے لئے اور خاص کر ان مرکزوں کے لئے جہاں پر نوجوان ہوں امت کے اور ملت کے بچے و فرزند ہوں جن کی اٹھتی ہوئی عمر ہے اور چلتی ہوئی کشتی ہے تو ان کے لئے اس آیت میں پورا دستور العمل ہے۔ اور ایک چراغ راہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وان لیس للانسان الا ماسعی'' انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے کوشش کی ہے یہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں وہ جب کہہ رہا ہے کہ کوشش شرط ہے اور انسان کی کوشش ہی کا نتیجہ نکلے گا تو پھر دوسرا انسان کیا کہہ سکتا ہے۔ نہیں ہے انسان کے لئے مگر جس چیز کی اس نے کوشش کی ہے۔'' وان سعیه سوف یری '' اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوگا اس کی کوشش کا نتیجہ دکھائی دے گا' آنکھوں کو دکھائی دے گا کہ جو کوشش کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا پھر اس کے بعد بڑی بشارت سناتا ہے۔

''ثم یجزاہ الجزاء الاوفی '' ''الاوفی''

اسم تفصیل کا صیغہ ہے اتنا آپ جانتے ہوں گے؟ پھر اس کو بدلہ دیا جائے گا بھرپور بدلہ زیادہ سے زیادہ بدلہ' ایک تو انسان کی کوشش کا نتیجہ اس کی توقع ہے اس کے استحقاق سے اس کی محنت کی مقدار سے بھی بڑھ کر نکل سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ بشارت سناتا ہے کہ ہوگا ایسا! اور ساری تاریخ بتاتی ہے علم کی تاریخ بتاتی ہے' دعوت واصلاح کی تاریخ بتاتی ہے کاموں سے اشتراک کی تاریخ بتاتی ہے۔ تحقیقات وتصنیفات کی تاریخ بتاتی ہے' اصلاحی کاموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کوشش کا نتیجہ نکلا بعض اوقات ہی نہیں بلکہ اکثر اوقات کوشش سے زیادہ نکلا کوشش کا جو پیمانہ تھا

اس کا جو سائز تھا اس سائز سے بہت بڑھ کر نتیجہ نکلا وہ نتیجہ کوشش کے سائز سے بہت بڑھا ہوا تھا اس سے بڑھ کر بشارت کیا ہو سکتی ہے؟ آپ اگر پکڑ لیں اس بات کو اور دل پر لکھ لیں کہ ہم کوشش کریں گے تو کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا امید ہے کہ کوشش کی حیثیت سے بڑھ کر نکلے گا توقع سے بڑھ کر قیاس سے بڑھ کر نکلے گا اور اس کے لئے نہ کسی بہت بڑی جگہ کی ضرورت ہے نہ کسی بڑی دانش گاہ کی ضرورت ہے، نہ کسی بڑے اونچے خاندان کی ضرورت ہے نہ بہت اعلیٰ درجہ کے اساتذہ خاندان کی ضرورت ہے۔ نہ بہت وسیع کتب خانہ کی ضرورت ہے اس کے لئے کوشش کی ضرورت ہے نیت کی ضرورت ہے، سنجیدگی اور دیانت داری کی ضرورت ہے۔

درس نظامی اور ملا نظام الدین سہالوی

تاریخ اسلام تو بہت بڑی ہے، اس کی مثالیں دینے پر آئیں تو دن بھی کافی نہ ہوگا، ہندوستان ہی کو لیجئے کہ جن لوگوں کا آج دنیا میں نام ہے جن لوگوں کا اس وقت دنیا میں کارنامہ سمجھا جاتا ہے وہ ایک پورے کے پورے دور کے بانی ہیں اور ساری دنیا نے ان کے علم کے آگے سر جھکا دیا ہے، وہ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کہاں پڑھا؟ آج ان بستیوں کا شاید بہت کم لوگ نام جانتے ہوں یہ درس نظامی جو ہندوستان میں کئی صدیوں تک چلا ہے اور یہی شرط اور معیار تھا قابلیت کا علمیت کا یہ ملا نظام الدین کا بنایا ہوا اور ترتیب دیا ہوا ہے اس کی پوری تاریخ ہے کبھی آپ پڑھئے گا ہمارے والد صاحب کی کتاب "درس نظامی کی تاریخ"، لیکن جس کی طرف اس کی نسبت ہے وہ ملا نظام الدین ہیں، کہاں کے رہنے والے ہیں؟ سہالی کے رہنے والے تھے۔ سہالی کہاں ہے؟ شاید اس مجمع میں کوئی بھی نہ جانتا ہو یہ بارہ بنکی میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں کے رہنے والے ہیں پھر بعض بعض کتابیں درس نظامی کی ایسی ہیں کہ جن کی بلندی کو اور جن کے مضامین کی نزاکت کو مضامین کی سنجیدگی کو مضامین کی وقعت کو ساری دنیا نے مان لیا ہے وہ ایسے قصبات کے رہنے والوں نے لکھی ہیں کہ خیال بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً درس نظامی میں سب سے اونچی کتاب جو سب سے زیادہ دقیق سمجھی جاتی ہے وہ ہے شمس بازغہ یہ شمس بازغہ گوپامئو کے ایک عالم کی لکھی ہوئی ہے لیکن بڑے بڑے استادوں نے سر جھکا دیا اس کو پڑھنا اس کو سمجھنا ایک معیار سمجھا جاتا تھا درس نظامی آپ نے پڑھا ہے؟ درس نظامی میں شمس بازغہ آپ نے پڑھ لی ہے؟ سمجھ گئے؟ اسی طرح سے ملا حسن کی کتابیں درس نظامی میں بڑی

اہمیت کی حامل ہیں، یہ سندیلہ کے آدمیوں اور فرنگی محل کے چند لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں بات تو یہ ہے کہ محنت اور حسن نیت واخلاق یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں تو پھر وہ ضائع نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے جو کہ عالم الغیب اور قادر مطلق ہے دیکھئے ایک تو عالم الغیب ہونا یہی ایک بڑی بات ہے لیکن وہ قادر مطلق بھی ہے عالم الغیب بھی ہے مخبر صادق بھی ہے اور رب العالمین بھی ہے وہ جب فرماتا ہے اعلان کرتا ہے اور اس کی ذمہ داری لیتا ہے ''وان سعیه سوف یری'' اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا تو پھر دنیا میں اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی کچھ اس میں اضافہ ہو ہی نہیں سکتا۔

علم اور کمال

رب العالمین، ارحم الراحمین اقدر القادرین عالم الغیب والشہادہ رب الاولین والآخرین وہ جب کہتا ہے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا بس آپ اس چیز کو پکڑ لیجئے پلو میں باندھ لیجئے دل پر لکھ لیجئے کہ آپ کو محنت کرنی ہے پھر ہم خانہ خدا میں بیٹھ کر کہہ رہے ہیں کہ اس کوشش کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا اور بڑے بڑے اہل کمال اس کو مانیں گے مثلاً صحیح عبارت پڑھنا کہ صرف ونحو کے قواعد آپ جانتے ہوں اور ان کی آپ کو مشق ہوئے مرفوع کو مرفوع پڑھیں منصوب کو منصوب پڑھیں اور مجرور کو مجرور پڑھیں اور جانیں کہ کہاں (الف لام) آنا چاہیے کہاں نہیں آنا چاہیے اگر آپ عبارت صحیح پڑھیں تو یہ بہت بڑا کمال ہے ہمارے ہندوستان [illegible] عجمی ملکوں میں خاص طور پر یہ بڑی اہم چیز ہے سب کچھ آپ جانتے ہیں بڑا علم ہے مشکل سے مشکل کتاب سمجھ سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں لیکن اگر عبارت پڑھنے لگے کسی اہل زبان کے سامنے کسی اہل علم کے مجمع میں تو بعض مرتبہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے کہ سب پر پانی پھر جاتا ہے سب کچھ بالکل ختم ہو جاتا ہے کالعدم ہو جاتا ہے اب بات آ گئی تو ہم آپ سے کہیں گے کہ ہم 51ء میں دمشق گئے عمر بہاء الدین سفیر پاکستان بھی تشریف لے گئے تھے انہوں نے کہا کہ آپ کی تقریر یونیورسٹی میں ہونا چاہیے یونیورسٹی سب سے بڑی دانش گاہ ہوتی ہے سب سے بڑا علمی مرکز ہوتا ہے ہم عجمی ہندی یہاں رائے بریلی کے رہنے والے اور وہاں دمشق یونیورسٹی میں ہماری تقریر ہوگی ہمیں معلوم ہوا کہ اس میں پارلیمنٹ کے ممبران بھی شامل ہوں گے اور یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان اور بڑے بڑے چوٹی کے علماء بھی شامل ہوں گے ہم چونکہ

عربوں کو دیکھے ہوئے تھے اور پڑھے ہوئے بھی تھے تو ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے بہت بڑے عالم کو اپنا مضمون سنا دیں کہ خدانہ خواستہ کہیں ہم نے فتحہ کی جگہ پر کسرہ پڑھ دیا یا کسرہ کی جگہ پر فتحہ پڑھ دیا تو سب پر پانی پھر جائے گا لوگوں کا بیٹھنا اور سننا مشکل ہو جائے گا یہ آپ کو بتاتے ہیں کہ غلطی کا مزاج اور ماحول پر اثر پڑتا ہے جیسے ہوا کا اثر ہوتا ہے ایک دم سے گرم جھونکا آ گیا یا ایک دم سے ٹھنڈا جھونکا آ گیا یا پانی برسنے لگا تو آدمی کا بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی ایک غلطی آپ نے کی نحوی غلطی یا صرفی غلطی یا منصوب کو آپ نے مرفوع پڑھ دیا یا جہاں الف لام نہیں داخل ہونا چاہیے وہاں الف لام داخل ہو گیا تو چاہے جتنی ہی آپ کی تحقیقات ہوں کتنا ہی آپ کے متعلق کہا گیا ہو کہ ایسے فاضل ہیں، فلاں جامعہ کے ہیں، ندوۃ العلماء کے فاضل ہیں یا دیوبند کے فاضل ہیں سب بے کار ہو جاتا ہے ہم نے مضمون لکھا وہاں کے حالات کے مطابق ''العوامل الاساسیۃ لکارثۃ فلسطین'' جو وہاں کے حسب حال تھا کہ جو المیہ پیش آیا فلسطین میں مسجد اقصیٰ اور قدس شہر عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور یہودیوں کے پاس پہنچ گیا اس کے حقیقی اسباب کیا تھے؟ اس کے بنیادی اسباب کیا تھے؟ لوگ تو ایسے ہی سطحی سا باب سوچ لیتے ہیں تجویز کر لیتے ہیں لیکن اس میں حقیقی اسباب کیا ہیں؟ کیا چیز اللہ کو ناپسند ہوئی کہ جس کی وجہ سے اس نے نقشہ ہی بدل دیا، الٹ دیا بالکل اور وہ یہودی جو کئی ہزار برس سے حکومت کرنے سے محروم تھے ان کو حکومت مل گئی ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے قرآن کی روشنی میں حدیث کی روشنی میں ہم نے مضمون لکھا العوامل الاساسیہ لکارثۃ فلسطین کتابیں پڑھ کر تیار کیا اس کو کہ مسلمان اور غیر مسلم عیسائی بھی اگر ہوں تو وہ بھی متاثر ہوں اور قائل ہوں پھر ہم نے کہا اتنے بڑے فاصلوں کے سامنے اور بڑے بڑے اساتذہ کے سامنے پروفیسر صاحبان کے سامنے پارلیمنٹ کے ممبران کے سامنے اور ادیبوں کے سامنے مضمون پڑھیں گے ہم ہندوستانی ملک کا اثر پڑتا ہی ہے خدانخواستہ اگر ذرا سی غلطی ہوگئی تو پھر لوگوں کا بیٹھنا مشکل ہو جائے گا سننا مشکل ہو جائے گا اور احتراماً اگر بیٹھے رہے تو پھر اثر کچھ نہیں لیں گے تو ہم علامہ بہجۃ البیطار کے پاس گئے جو اس عہد کے چوٹی کے عالموں میں سے تھے شاید سب سے بڑے عالم ہوں علامہ رشید رضا مصری صاحب مجلّہ ''المنار'' کا جب انتقال ہوا ان کی تفسیر نامکمل رہ گئی تھی تو انہیں کا انتخاب ہوا تھا کہ یہ مکمل کریں البلاغ بھی ان کی ادارت میں دیا گیا ہم ان کے پاس گئے ہم نے کہا کہ شیخ ایک

مضمون پڑھنا ہے دمشق یونیورسٹی میں ہم چاہتے ہیں کہ پہلے کے آپ کو سنالیں آپ کا انتخاب اس لئے کرتے ہیں کہ آپ ہمارے استاد ہمارے مخدوم اور ہمارے سر پرست علامہ سید سلیمان ندوی کے دوستوں میں ہیں (یہ ہمیں معلوم تھا) تو آپ کو سنانے میں کوئی شرم ہمیں نہیں آنی چاہیے انہوں نے کہا نہیں! نہیں! آپ کو سنانے کی کیا ضرورت؟ آپ کی کتاب ''ماذا خسر العالم'' ہم نے پڑھی ہے آپ تو مصنف ہیں (جیسے شریف آدمیوں اور منتظم لوگوں کو کہنا چاہیے) ہم نے کہا نہیں' آپ سن لیجئے انہوں نے سنا اول سے آخر تک الحمدللہ کوئی غلطی نہیں نکلی پھر وہ ایک لطیفہ سنانے لگے کہ آپ تو الف لام کے استعمال میں بڑے محتاط ہیں ورنہ بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے کہ کس ملک پر الف لام آتا ہے کس پر نہیں آتا ہے' یہ بالکل سماعی چیز ہے' قیاسی نہیں عربوں نے جس پر الف لام داخل کر دیا تو اس پر قیامت تک الف لام رہے گا اور جس پر داخل نہیں کیا اس پر کوئی داخل نہیں کر سکتا۔ مصر پر الف لام داخل نہیں ہو سکتا مصر کو مصر کہیں گے المصر نہیں کہیں گے لیکن عراق پر داخل ہوتا ہے تو العراق کہیں گے عراق نہیں کہیں گے۔ فارس پر نہیں داخل ہوتا ہے عرب پر داخل ہوتا ہے اس لئے العرب کہیں گے سندھ پر الف لام آتا ہے اس لئے السندھ کہیں گے لیکن ملتان پر نہیں آتا اس لئے ملتان ہی کہیں گے الملتان نہیں کہیں گے تو اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہے صرف دیکھیں گے کہ کس طرح عربوں نے استعمال کیا ہے اور کس طرح کتابوں میں ہے۔ بس اتنا ہی کافی ہے تو ہم کو ایک لطیفہ سنایا کہ آپ کے ہندوستان کے ایک عالم مکہ مکرمہ کے ایک طالب علم کے پاس گئے اور انہوں نے عربی میں کہا انا ذاہب یا انا ذاہب من المکۃ الی مدینۃ میں المکۃ سے مدینہ جا رہا ہوں کوئی ضرورت ہے؟ مکہ پر الف لام نہیں آتا کیوں نہیں آتا یہ کوئی پوچھ نہیں سکتا یہ طے شدہ بات ہے اور مدینہ پر آتا ہے کہ ہر شہر کو مدین کہتے ہیں تو المدینہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون سا مخصوص شہر ہے تو انہوں نے کہا بس ہمارا اتنا کام ہے کہ مکہ کے سر سے الف لام اٹھا کر مدینہ کے سر پر ڈال دیجئے انہوں نے اصل میں ان کی تنبیہ تہذیب کے ساتھ کی پھر جب آپ پوچھتے ہیں کیا کام ہے؟ تو اتنا کام ہے وہ سمجھ گئے کہ ہم سے غلطی ہو گئی۔

زبان کی حسیت اور خاصہ لسانی سے واقف ہونا ضروری ہے

زبان کا احساس زبان کی حسیت' خاصۂ لسانی یہ بڑا نازک مسئلہ ہوتا ہے زبان ایسی چیز

ہے کہ وہ معاف نہیں کرتی اور زبان کی غلطی معاف نہیں کی جاتی اگر کہیں کوئی نقل میں غلطی ہو گئی ہو تو کہا جائے گا کہ یاد سے لکھ دیا لیکن اگر ایک لفظ بھی غلط آپ بول گئے تو پانی پھر جاتا ہے تقریر پر ہم سے خود عربوں نے کہا جدہ کے لوگوں نے کہا کہ آپ کے یہاں کے بعض لوگ آتے ہیں عالم ہوتے ہیں، مبلغ ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آج تقریر ہوگی سب لوگ بیٹھ جائیں سب بیٹھ جاتے ہیں لیکن چند جملے سن کر ہم نہیں بیٹھ سکتے' اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو آپ سے ایک بات یہ کہتے ہیں کہ یہاں عبارت صحیح پڑھنا سیکھیں اور کس پر الف لام داخل ہوتا ہے اور کس پر نہیں ہوتا کس کو منصوب پڑھنا چاہیے کس کو مرفوع یہ سیکھیں اور اس کے ساتھ یہ کہ ''ث'' کو ''ث'' کس طرح پڑھیں اگر ''ث'' کو ''س'' کہہ دیا ''ص'' ''ث'' یا ''س'' کہہ دیا تو سب پر پانی پھر گیا عربی زبان مختلف المخارج بھی ہے مختلف الاصوات بھی ہے ث' س' ص یہ ملتی جلتی آوازیں ہیں لیکن ث ث کس طرح ادا ہوگا س' س س کس طرح اور ص' ص کسطرح ادا ہوگا مخارج عربی زبان کی خصوصیت ہے انگریزی یا کسی دوسری زبانوں یں یہ چیزیں نہیں ہیں تو اگر بڑی تحقیقات آپ نے کی ہیں بڑی نئی نئی باتیں آپ نے پیش کی ہیں لیکن آپ نے ث کو ص پڑھ دیا ص کو س پڑھ دیا تو عربوں کو سننا مشکل ہو جائے گا تو ایک تو یہ کہ آپ یہاں کوشش کریں کہ صحیح عبارت پڑھ سکیں صرف ونحو آپ کی مضبوط ہو آپ اعراب سے واقف ہوں اور آپ کا لہجہ درست ہو اور جو بھی حروف حلقی ہوں ان کو حروف حلقی کس طرح ادا کریں اور جو حروف حلقی نہیں ہیں ان کو اسی طرح ادا کریں یہ کام یہیں سے ہوسکتا ہے اس کی بنیاد یہیں پڑے گی اگر یہاں نہ پڑی تو پھر آپ دار العلوم ندوۃ العلماء چلے جائیں دار العلوم دیو بند جائیں کہیں جائیں پھر اس کا درست ہونا مشکل ہے یہیں کوشش کریں کہ آپ کو معلوم ہو کہ کس کو منصوب پڑھنا چاہیے کس کو مرفوع پڑھنا چاہیے اور کیوں پڑھنا چاہیے؟ سب عوامل اور ان کے جو اثرات ہیں ان سے واقف ہوں۔

مسائل کا استحضار

دوسری بات یہ کہ آپ دینیات میں' فقہ میں جو ابتدائی مسائل ہیں جو کتابیں آپ کے یہاں پڑھائی جاتی ہیں مثلاً شرح وقایہ یا دوسری فقہ کی کتاب دوری وغیرہ ان کے مسائل آپ کو مستحضر ہوں نماز کے مسائل آپ کو معلوم ہوں' زکوۃ کن پر فرض ہوتی ہے اس کا کیا نصاب ہے'

سب معلوم ہو اگر خدا ج کو لے جائے تو اس کے ارکان اور مسائل بھی پہلے سے مستحضر ہوں زکوٰۃ کے مسائل آپ کو معلوم ہوں اور اگر کوئی موٹا مسئلہ آپ کے خاندان میں کوئی پوچھے گاؤں میں کوئی پوچھے تو آپ بتا سکیں اس کو معلوم ہو کہ ہمارے گاؤں کے ایک صاحبزادہ کے جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مسئلہ بتاتا ہے یہ بات آپ کو یہیں سے آنی چاہیے اس کی مشق کریں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ جو دینی رنگ ہونا چاہیے جو دینی سطح ہونا چاہیے ایک دینی عربی مدرسہ کے طالب علم کی یعنی نمازوں کی پابندی وقت سے آنا بلکہ وقت سے پہلے آنا اور خشوع وخضوع کے ساتھ اور احترام کے ساتھ بیٹھنا دنیا کی باتیں نہ کرنا' قرآن مجید کی تلاوت کا جو معمول مقرر کیا ہے اس کو پورا کر لینا اذکار وتسبیحات جو آپ کو بتائی ہیں یا آپ کو معلوم ہیں اور آپ کا معمول ہے...... ان کو پورا کر لینا پھر استادوں کا ادب' تواضع' خاکساری' خدمت کا جذبہ یہ سب باتیں ہونی چاہئیں یہ چیزیں یہیں سے پیدا ہوسکتی ہیں اور یہاں نہ ہوئیں تو پھر آپ جامعہ ازہر چلے جائیے وہاں بھی یہ بات پیدا نہیں ہوں گی اور یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب کسی طالب علم میں یہ بات شروع سے پیدا نہ ہوئی تو پھر بعد میں پیدا ہونی مشکل ہے ہم نے بڑی بڑی جامعات کو دیکھا ہے کئی جگہ تقریر کرنے کا موقع بھی ملا ہے وہاں کے بڑے طالب علموں سے اور اساتذہ سے بے تکلف باتیں ہوئیں' صحبتیں رہیں' دمشق میں' قاہرہ میں' بغداد میں اور مراکش ورباط میں سب جگہ علمی حلقہ سے الحمدللہ واسطہ پڑا ہے لیکن دیکھا ہے کہ جن لوگوں کی تربیت ہوگئی اور طالب علمی کے زمانے میں ان کا سانچہ بن گیا وہ بڑے باکمال نکلے اور انہوں نے بڑے دینی کام کئے لیکن جن کا سانچہ وڈھانچہ طالب علمی کے زمانے میں نہیں بنا وہ کسی کام کے نہیں رہے تو یاد رکھئے سانچہ وڈھانچہ ان مدرسوں میں بن سکتا ہے اس کو بنایئے اور پھر اساتذہ سے رابطہ آپ کا رہے ان سے پوچھیں کہ ہم خارج اوقات میں کیا پڑھیں؟ یہ بہت اہم بات ہے ہم دعوے سے نہیں کہہ سکتے مگر اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے آپ کو ایسے اساتذہ دیئے ہیں اور پھر جواز بھی عطا فرمایا ہے کہ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہمیں سیرت پر کونسی کتابیں پڑھنی چاہئیں؟ صحابہ کرام کے فضائل و خصائص پر کون کون سی کتابیں پڑھنی چاہئیں اپنی اصلاح کے لئے ہمیں کون کون سی کتاب پڑھنی چاہیے جو دستور العمل ہو اور پوری زندگی کے لئے اس میں رہنمائی ہو اور اسلاف کے حالات سے واقف ہونے کے لئے کون سی کتاب پڑھنی چاہیے۔

مادر علمی سے محبت

آپ سے یہ بات بھی کہنا چاہوں گا کہ آپ کو یہ بھی احساس ہونا چاہیے کہ آپ کہاں تعلیم پا رہے ہیں یہ کون سی جگہ ہے کیا جوار ہے؟ یہ ہر جگہ کے لئے ضروری ہے' دیو بند میں اگر کوئی پڑھتا ہے تو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ دار العلوم کس نے قائم کیا؟ حضرت مولانا قاسم نانوتوی جو کہ قاسم العلوم والخیرات کہلاتے ہیں اور ایک دور کے بانی ہیں ان کے حالات سے واقف ہونا چاہیے اور پھر ان کے بعد ان کے جانشینوں میں ان میں سب سے بڑھ کر مشہور و مبارک شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیو بندی ہیں جو انگریزوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے انگریزوں نے ان کو گرفتار کیا پھر ان کو مالٹا بھیجا گیا ان کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی تھے مولانا عزیز گل اور کوڑا جہان آباد کے جہاں ہماری قرابت بھی ہے۔ مولانا حکیم سید نصرت حسین صاحب بھی تھے ان کا وہیں انتقال ہو گیا اور یہ حضرات جیل سے رہائی کے بعد واپس آئے اسی طرح مولانا انور شاہ صاحبؒ جیسا محدث اس کو ملا اور مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا حکیم الامت اور شیخ طریقت پیدا کیا۔ مولانا حسین مدنی صاحب ''شیخ العرب والعجم جو بڑے عالم مجاہد' غازی اور اہل اللہ میں سے تھے اور سہارنپور کے رہنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مدرسہ کس نے قائم کیا ہے یہاں کے سب سے بڑے رہنما اور سرپرست مولانا خلیل احمد صاحب امیٹھوی پھر ان کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ اور دوسرے جو بڑے بڑے اہل اللہ پیدا ہوئے جیسے مولانا اسعد اللہ صاحبؒ وغیرہ۔ اسی طرح جو ندوۃ العلماء میں پڑھے اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ کس نے اس کی بنیاد ڈالی' مولانا محمد علی مونگیری' مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری پھر اسکے بعد علامہ شبلی نعمانی' مولانا عبد الحئی صاحب جو ہمارے والد اور یہیں کے رہنے والے تھے' پھر مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری' مولانا مسیح الزماں صاحب' نواب صدر یار جنگ صاحب' مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی صاحب اور اس کے مایہ ناز فرزند علامہ سید سلیمان ندوی جن کو فخر ندوہ کہا جاتا ہے۔ مولانا عبد السلام صاحب ندوی' مولانا عبد الباری صحب ندوی' اور اخیر مین مولانا محمد ادریس صاحب نگرامی ندوی جیسا ماہر قرآن اور عالم ربانی ان سب کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے اسی طرح آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کہاں ہیں؟ آپ کس بستی میں ہیں یہ دائرہ شاہ علم اللہ ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں

چوٹی کے علماء اور بڑے بڑے مسائخ آنا اپنی سعادت سمجھتے تھے اور فخر سمجھتے ہیں' مولانا حسین احمد مدنی تشریف لائے کسی نے کچھ کہا تو فرمایا کہ ہمارا تو یہاں چلہ گزارنے کا دل چاہتا ہے اور ایک رات تو ضرور یہاں گزارنے کو جی چاہتا ہے جیسا کہ میاں جینور جھنجھانوی کے حجرہ میں اور مولانا الیاس صاحبؒ یہاں آئے تو اپنی حیرت کا اظہار کیا اور شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحب کے سامنے کہا کہ شاہ علم اللہ صاحبؒ تو بہت بڑے آدمی تھے پھر شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری جو ہمارے شیخ ومربی اور مرشد تھے تشریف لائے اور بڑے ادب واحترام سے رہے اور بہت ہی خوش ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ یہاں سے گذرے تو رائے بریلی کے اسٹیشن پر بڑے بلند الفاظ کہے مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ نے ہمیں خود سنایا کہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی گاڑی یہاں کھڑی تھی پتہ نہیں کیا بات ہوگئی تھی دیر تک ٹھہری تو اتر کر چلنے لگے میں ساتھ ہوگیا مجھ سے فرمایا کہ حضرات تکیہ کے انوار یہاں تک ہیں اور یہاں آنے کا ارادہ فرمایا مگر موقع نہیں ملا ایسے ہی حضرت شیخ الحدیث ایک سے زائد مرتبہ تشریف لائے اور شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی شریف لائے تو آپ کو واقف ہونا چاہیے کہ شاہ علم اللہ صاحب کون تھے؟ کب پیدا ہوئے؟ تعلیم وتربیت اور اصلاح کا تعلق ان کا کن سے تھا ان کے بارے میں ان کے معاصر کیا کہتے تھے؟ کیا ان سے پہنچا؟ کون سی اور اتباع سنت تھی یہی اس جگہ کا پیغام بھی ہے اور اس جگہ کا خاصا بھی ہے اور یہاں کی ہوا میں جو بات ہونی چاہیے خدا کرے وہ اب بھی ہو، وہ ہے توحید خالص **الا للہ الدین الخالص**.

عقیدہ توحید اور اتباع سنت

دائرہ شاہ علم اللہ کا پیغام عقیدۂ توحید اور اتباع سنت کا پیغام ہے سارے عالم کے لئے اور خاص کر ہندوستان کے لئے۔ اتباع سنت میں تو شاہ علم اللہ صاحب اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ ایک واقعہ تاریخ میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ اچانک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو بہت گھبرائے معلوم ہوتا کہ مغلیہ سلطنت کا زوال ہونے والا ہے گھبرا کے علماء سے پوچھا کہ آج میں نے یہ خواب دیکھا ہے اللہ خیر کرے انہوں نے کہا کہ آپ گھبرائیے نہیں تاریخ لکھ لیں اسی تاریخ کو شاہ علم اللہ صاحب کا رائے بریلی میں انتقال ہوا ہوگا اس لئے کہ ان سے بڑھ کر متبع سنت کوئی نہیں چنانچہ یہاں سے چٹھی گئی جو واقعات نگار رہا

کرتے تھے انہوں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ آج فلاں تاریخ کو شاہ علم اللہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسی ہستی کو پیدا کیا یعنی حضرت سید احمد شہید کو جن کا ڈنکا اب بھی بج رہا ہے خاص طور پر ہندوستان میں ہم تاریخ کے طالب علم بھی ہیں، مصنف بھی ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ کس ہستی سے اتنا بڑا انقلاب ہوا ہو اتنی بڑی اصلاح ہوئی ہو جتنی بڑی اصلاح سید صاحب سے ہوئی تیس لاکھ آدمی تو ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے بیعت کے معنی یہ تھے کہ ابھی ہاتھ پر ہاتھ رکھا شرک سے نفرت ہوگئی، بدعت کے روادار نہیں رہے، معاصی سے نفرت ہوگئی، تاریخ میں اس کے بیسیوں واقعات ہیں وقائع احمدی اور منظور السعداء میں اس طرح کے واقعات بھرے پڑے ہیں۔

بیعت کر لیجئے

لکھنؤ میں ٹیلہ والی مسجد میں قیام تھا لوگ کہنے لگے بھائی کہاں آ گئے؟ آپ نے فرمایا کیا بات ہے بولے بڑے بدنام ہیں، ڈاکو ہیں، رہزن ہیں، ان کا یہاں کیا کام ہے؟ آپ نے کہا کچھ کہنا نہیں چور آئے اور کہنے لگے ہم کو بیعت کر لیجئے فرمایا جلدی کیا ہے پھر کر لیں گے، کہا نہیں ابھی کر لیجئے، بیعت ہوئے اس کے بعد گھر گئے اسی دن یا ایک دو دن کے بعد ان کی پارٹی کے لوگ آئے کہا بہت دنوں سے ہم نے کام نہیں کیا ہے یعنی ڈاکہ نہیں ڈالا ہے آج کل تنگی ہو گئی ہے چلو کہیں کام کریں، انہوں نے کہا اب نہیں ہوگا یہ کام، پوچھا کیا بات ہے اب نہیں ہوگا یا کبھی نہیں ہوگا اب کبھی نہیں ہوگا، کہا کیا بات ہے بولے ایک بزرگ رائے بریلی سے آئے ہیں ان کے ہاتھ پر ہم نے بیعت کی ہے کہ ہم چوری نہیں کریں گے۔ انہوں نے بھی توبہ کی کہا ہم بھی بیعت ہو سکتے ہیں؟ کہا ہاں، وہ بھی بیعت ہوئے۔

ہدایت اور انقلاب

ہدایت کا یہ معاملہ ہے کہ نواب بہادر یار جنگ صاحب نے جو مہدوی فرقہ کے مصنف ہی نہیں بلکہ مہدوی فرقہ کے بہت بڑے لیڈر اور قائد مقرر تھے وہ لکھنؤ آئے مولانا عبدالباری صاحب ندوی حیدرآباد میں رہ چکے تھے۔ ان سے واقف تھے بھائی صاحب سے کہا کہ ان کو

دار العلوم گھمانا چاہیے اور ان کا خطاب ہونا چاہیے ہم ان کو لائے انہوں نے مسجد کے صحن میں خطاب کیا تو انہوں نے بہت سی باتیں کہتے ہوئے کہا کہ مولانا کرامت علی صاحب سید صاحب کے بڑے خلفاء میں تھے مولانا کرامت علی صاحب کے ہاتھ پر میری معلومات کے مطابق دو کروڑ آدمیوں کو ہدایت ملی۔

جب ہم بنگلہ دیش گئے سفر میں ہمارے ساتھ عزیزان محمد رابع اور محمد واضح اور مولوی سعید الرحمن بھی تھے تو وہاں کے واقف عالموں نے کہا کہ دو کروڑ سے بھی زیادہ لوگوں کو مولانا کرامت علی صاحب کے ذریعہ ہدایت ملی اور چالیس ہزار سے اوپر آدمی مسلمان ہوئے اور یہ حالت تھی کہ جب رائے بریلی سے کلکتہ جانے لگے دریا سے سفر کیا گنگا کنارے کی بستی ڈلمئو اترے اور پھر ڈلمئو سے آگے جہاں جہاں جاتے وہاں بس بالکل انقلاب آجاتا تھا تعزیے کے چبوترے توڑ دیئے جاتے تھے تعزیے توڑ دیئے جاتے تھے لوگ غیر مشروع مراسم سے تائب ہوتے تھے اور آپس میں حق کی لڑائیاں تھیں وہ اتحاد کر لیتے تھے بنارس گئے تو اور بھی زیادہ کلکتہ گئے تو ایک طوفان اٹھا معلوم ہوتا تھا کہ شہر ہل گیا شراب خانوں سے انگریزوں نے ٹیکس مانگا۔ انہوں نے کہا کہ ہم کہاں سے ٹیکس دیں؟ کوئی بھول کر بھی ہمارے شراب خانے کی طرف نہیں آتا۔ بولے کیا بات ہے۔ کہا جب سے رائے بریلی سے سید صاحب آئے ہیں اس وقت سے کوئی ہمارے شراب خانے کا رخ ہی نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا اچھا اب یہی حالت رہے تو معاف کر دیں گے اور ان کے جانے کے بعد پھر آنے لگیں تو پھر ٹیکس دینا پڑے گا ایسے انقلاب کے واقعات تاریخ میں ہیں جو صدیوں میں نظر نہیں آتے تو یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کہاں ہیں؟ اور آپ کو اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے فخر کرنا چاہیے کہ ہم ایسی جگہ پر پڑھ رہے ہیں جو بالکل اس کے جوار میں ہے وہاں کی ہوا کے جھونکے یہاں آتے ہوں گے اور انشاء اللہ اس میں کچھ نہ کچھ برکتیں بھی ہوتی ہوں گی اور اس کے بعد ہم آپ سے یہ کہتے ہیں کہ دو چیزیں ضرور پڑھئے گا موقع ہو تو یہیں پڑھ لیجئے ایک تو سیرت سید احمد شہیدؒ اور ایک تذکرہ سید شاہ علم اللہ تذکرہ شاہ علم اللہ بڑے بڑے ادیبوں نے پڑھی پروفیسر رشید احمد صدیقی تو بہت متاثر ہوئے تذکرہ سید شاہ علم اللہ سیرت سید احمد شہیدؒ اور حیات عبدالحئیؒ اگر ہو سکے تو یہاں پڑھ لیجئے ورنہ نوٹ بک پر لکھ لیجئے کہ انشاء اللہ ہم یہاں سے جانے کے بعد ان کتابوں کو ضرور پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں کون لوگ پیدا ہوئے تھے۔

دعوت اور پیغام

میرے عزیزو! یہاں کا پیغام آپ لے کر جائیں صرف یہاں سے کتابی علم لے کر نہ جائیں شخصی علم لے کر نہ جائیں بلکہ یہاں کی دعوت بھی لے کر جائیں‘ پیغام بھی لے کر جائیں اور آخری بات یہ کہ یہاں کا مزاج بھی لے کر جائیں‘ ہر جگہ کا ایک مزاج ہوتا ہے ہر دعوت کا‘ ہر ادارہ کا ہر مقام کا ایک مزاج ہوتا ہے اور یہاں کا مزاج ہے توحید خالص‘ اتباع سنت‘ فرائض کی پابندی اور تبلیغ کا جذبہ‘ اصلاح کا جذبہ جہاد کا شوق اور اعلاء کلمۃ اللہ کا ارادہ اس کے لئے جو کچھ ہو سکے وہ ہم کریں گے۔ بس یہ سب باتیں ہیں ان کو ذہن میں رکھ لیں پھر آپ سے کہتے ہیں کہ پختہ استعداد پیدا کیجئے عبارت صحیح پڑھنا سیکھیں اور سمجھنا سیکھیں اس کے بعد فرائض میں پابندی نماز میں خشوع وخضوع ہو‘ دعا ہو‘ یہاں بیٹھ کر دعا کریں کہ یہ اولیاء اللہ کا جوار ہے‘ انشاء اللہ دعا میں اثر رہے گا اور پھر اس کے بعد یہ کہ استادوں کی خدمت کریں‘ قدر کریں‘ ذہن میں کچھ چیزوں کو محفوظ کریں کہ یہاں سے جانے کے بعد یہ کام کرنا ہے جو کام یہاں نہیں ہو سکا وہ گھر جا کر یا دوسرے مدرسے میں جا کر کریں گے اور پھر اس کام کو جاری رکھیں گے اور یہ کہ دعوت وتبلیغ کا ارادہ کریں کہ یہاں سے یا کسی دوسرے مدرسے سے فارغ ہو کر دعوت وتبلیغ کا کام کرنا ہے‘ مسلمانوں کی اصلاح کا کام کرنا ہے‘ عقائد کی اصلاح کا اعمال کی اصلاح کا رسم و رواج کی اصلاح کا کام کرنا ہے۔ شادی بیاہ کی رسوم ان کی فضول خرچیاں اور جہیز مطالبے ان سب کے خلاف آواز بلند کرنا ہے‘ خود بھی بچنا ہے اور دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ مسلم پرسنل لا پر جو دست درازیاں ہوتی ہیں اور اس کے لئے جو خطرات ہیں ان کا تدارک کرنا ہے۔ اس کی دعا اور کوشش کرنی ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں شرعی قانون پر شرعی قانون ازدواج وقانون وراثت پر پرسنل لاء پر عمل کرنے کی آزادی رہے اور جو تنظیمیں جو انجمنیں جو ادارے اس کام کو کر رہی ہیں اس کا بیڑا جنہوں نے اٹھایا ہے ہمیں ان کا ساتھ دینا ہے مسلم پرسنل لاء بورڈ جس کا مرکز پٹنہ میں ہے اور صدر ہمیں بنایا گیا ہے یا دینی تعلیم کونسل ہے یا ملّی مشاورت ہے ان سب تنظیموں میں اور پھر تبلیغی جماعت جو ساری دنیا کے لئے عالمی جماعت ہے اس کے لئے بھی کوشش کرنا ہے اور اسلام کی بقاء وتحفظ اور سربلندی کیلئے کام کرنا ہے۔

وما علینا الاالبلاغ المبین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نزول قرآن کا مقصد اور حاملین قرآن کی ذمہ داریاں

حضرات! حضرت مولاناؒ نے ۱۹۶۰ء میں برما (میانمار) کا دورہ فرمایا اسی سفر میں برما کے مختلف مقامات پر حضرتؒ کی تقاریر ہوئیں۔ یہ تقریر بھی برما کے جمعیۃ الحفاظ کے ایک جلسہ میں کی گئی تھی جس میں نزول قرآن کا مقصد اور حاملین قرآن کی ذمہ داریوں کو اجاگر کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ اس بیان کو نافع ثابت فرمائے۔

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھد اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ و نشھد ان محمد اعبدہ و رسولہ الذی ارسلہ اللہ تعالی بالحق بشیرا و نذیرا و داعیا الی اللہ باذنہ و سراجامنیرا

حضرات! جمعیۃ الحفاظ کے اس جلسہ میں شریک ہونا میرے لئے سعادت بھی ہے اور ایک طرح کی عبادت بھی، اللہ تعالیٰ کے کلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز خواہ وہ حفظ ہو یا تجوید، تفسیر ہو یا قرآن مجید کی تلاوت، بڑی معزز اور مکرم چیز ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور ساتھ ہی آپ کے منصب نبوت کے فرائض، اور اس کی ذمہ داری کے سلسلہ میں فرمایا ہے، ھوا الذی بعث فی الا مییں رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ و زکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین .(الجمعۃ) وہ پاک ذات ہے جس نے کہ ان پڑھوں میں ایک ایسا پیغمبر مبعوث فرمایا جو ان کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی تربیت فرماتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلی بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

منصب نبوت اور اس کا کام:

رسول اللہ ﷺ کے منصب نبوت کے چار شعبے ہیں، جو گویا فرائض چہارگانہ ہیں۔

تلاوتِ آیات:

تلاتِ آیات پہلا فریضہ اور پہلا شعبہ ہے، یہ بھی اتنی اہم چیز اور ایسا بلند فریضہ ہے کہ اللہ تعالی نے منصبِ نبوت کے شعبوں میں سب سے پہلے اسی کو ذکر فرمایا ہے۔

تزکیۂ نفس:

دوسرا شعبہ ہے یزکیھم ،نفوس کی تربیت کرنا ،مہذب بنانا۔ اخلاق رذیلہ نکالنا اور اخلاق فاضلہ پیدا کرنا۔ اور وہ صفت پیدا کرنا جس کا قرآن مجید میں دوسری جگہ ذکر ہے۔

ولکن اللہ حبب الیکم الا یمان وزینہ فی قلوبکم و کرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان اولئک ھم الراشدون.

اور لیکن اللہ تعالی نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا۔ اور کفر اور فسق اور عصیان سے تم کو نفرت دے دی ایسے لوگ راہ راست پر ہیں۔

نزولِ قرآن کا اہم ترین مقصد:

قرآن مجید کے نزول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ الفاظ اور حروف کی شکل میں کتابوں میں اور اس کے بعد سینوں میں محفوظ ہو جائے کہ لوگ اس کو پڑھ سکیں اور اس کو سنا سکیں، اس کو یاد کریں اور پڑھتے رہیں، بلکہ نزولِ قرآن کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عقائد کی اصلاح ہو، قلوب اور نفوس کی اصلاح ہو، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں فریضوں کی تکمیل فرمائی، صحابہ کرام آپ کی اس محنت کا زندہ ثبوت تھے، ان کے نفوس کیسے مصفّٰی تھے، ان کی کیسی تربیت ہو چکی تھی کہ کفر و شرک کی نفرت ان کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی، اور ایمان کی محبت اور ایثار کا مادہ ان کے اندر پیوست ہو چکا تھا۔ عبادت کا ذوق ان پر غالب آچکا تھا، خدمتِ خلق کا جذبہ ان کے اندر رچ گیا تھا، ان کے اندر سے نفسیات کا کانٹا نکل چکا تھا، جب دنیا ان کے اندر سے بالکل باہر ہو چکی تھی، حب جاہ کا خاتمہ ہو چکا تھا، صحابہ کرام میں سے ایک ایک رسول اللہ ﷺ کے منصب تزکیہ کا زندہ ثبوت ہے۔

حضرت ضرار بن عمرو رضی اللہ عنہ ایک صحابیؓ ہیں کہتے ہیں کہ میں شرک کی حالت میں اس

نیت سے نکلا کہ وہ کام کروں جو قریش نہیں کر سکے یعنی معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ کے وجود گرامی پر دست درازی کروں، موقع اچھا تھا، آپ تنہا طواف کرر ہے تھے۔ میں نے بھی طواف کرنا شروع کر دیا اور اس فکر میں رہا کہ ذرا کچھ موقع ہو کہ آپ کا اور میرا سامنا ہو جائے، تو میں اپنا کام کروں۔ آپ نے مجھ کو دیکھ کر بلایا۔ میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا، ضرار تمہارا کیا ارادہ تھا؟ میں نے کہا کچھ نہیں طواف کرر ہا تھا۔ آپ ہنسے، اور آپ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ خدا کی قسم آپ نے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ کہ گویا سینے کے اندر کی ساری آلائش نکل گئی، اس کے بعد میں وہاں سے گھر چلا آیا، ایک عورت جس کے یہاں جلسہ ہوا کرتا تھا اور محفل گرم ہوا کرتی تھی اور اس میں داستان آرائی وقصہ گوئی ہوتی تھی، میں رند مشرب تھا، اس عورت نے مجھے دیکھا تو آواز دی، میں نے کہا اب کچھ نہیں ہوسکتا، اب میں مسلمان ہو گیا ہوں، ایسی فوری تبدیلی کے واقعات بھی بہت ہیں، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ پر تین دور گزرے ہیں، ایک دور مجھ پر ایسا گذرا ہے کہ روئے زمین پر کوئی ہستی آپ سے بڑھ کر مبغوض نہ تھی، معاذ اللہ! اگر اس وقت مجھے موقع مل جاتا تو میں اپنی عاقبت خراب کر لیتا، اللہ نے فضل فرمایا، موقعہ ہی نہیں ملا، اس کے بعد دوسرا دور مجھ پر ایسا گذرا کہ روئے زمین پر کوئی ہستی آپ سے بڑھ کر محبوب نہیں تھی۔ خدا کی قسم میں آپ کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر مجھ سے کوئی حضور اکرم ﷺ کا حلیہ پوچھے تو میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میری نظر آپ کے چہرۂ مبارک پر جمتی ہی نہیں تھی۔ اور مجھ میں آپ کو دیکھنے کی تاب ہی نہیں تھی۔ جب میں نے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا، اور بیعت کی تو میں اپنا ہاتھ نکالتا ہی نہیں تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا ہاتھ کیوں نہیں چھوڑتے؟ میں نے کہا، یا رسول اللہ! فرمائیے کہ میرے گذشتہ گناہوں کا کیا ہوگا؟ میں تو بہت سیاہ کار انسان ہوں آپ ﷺ نے فرمایا۔ کہ تم کو معلوم نہیں کہ اسلام اپنے ماقبل کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔

ایسے بہت سے واقعات ہیں، وحشی جنہوں نے حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب اللہ کے شیر کو خود شہید کیا تھا، اور ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ آپ کو معلوم ہے، حضور ﷺ کے سامنے جب وہ آئے اور انہوں نے بیعت کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے ان کی بیعت قبول کی، انہوں نے کلمہ پڑھا اور ایمان لائے، آپ ﷺ نے فرمایا وحشی! اگر تم میرے سامنے بار بار نہ آؤ

تو اچھا ہوگا۔ اس لئے کہ مجھے اپنے چچا یاد آجاتے ہیں، یہ قدرتی بات بھی ہے، اور بہت لطیف جذبہ، احساس اور اعلیٰ درجہ کی انسانیت، لیکن انہوں نے جو کلمہ پڑھا اور آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ اس نے ان کے اندر ایسا انقلاب پیدا کردیا، ایسی روحانیت پیدا کردی، اور ایسی ایمانی طاقت پیدا کردی جس پر آج بڑے بڑے اولیاء اللہ رشک کررہے ہیں، یہی وحشی ہیں جنہوں نے مسلیمہ کذاب کو قتل کیا، میں جب اس واقعہ کو پڑھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ حضرت وحشیؓ کی بھی نگاہ انتخاب کو داد دینی چاہئے کہ انہوں نے ایک ایسی ہستی سے اسلام اور مسلمانوں کو محروم کیا تھا جو اسلام کے لئے تقویت کا باعث تھی اور رسول اللہ ﷺ کو بہت محبوب تھی تو اس کی تلافی اور کفارہ کے لئے انہوں نے ایسی ہستی کا انتخاب کیا جو سب سے بڑھ کر حضور ﷺ کے نزدیک مبغوض تھی، ایک وہ شخص تھا جو نبوت کا بہت بڑا حامی اور مددگار تھا، پھر ایک وہ شخص تھا جو اس نبوت کے مقابلہ میں سینہ تان کر آیا تھا اور منصب نبوت کا گویا حریف اور رقیب تھا۔ انہوں نے گناہ کے کفارہ کے لئے جو بہترین انتخاب ہوسکتا تھا انتخاب کیا، یقیناً حضور ﷺ کی روح مبارک ان سے خوش ہوئی ہوگی، یہ سب ان کی ایمانی قوت کا نتیجہ ہے یہ تو فوری انقلاب کی چند مثالیں ہیں، باقی صحابہ کرامؓ کے اندر جو تبدیلی تربیت اور صحبت سے پیدا ہوئی اس سے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گئے اخلاقی پستی سے، اعمال کی پستی سے، عقائد کی تاریکی سے اور جاہلیت سے روحانیت اور ایمان و اخلاق اور تربیت و علم کے بلند مقام تک پہنچ گئے۔

تعلیم کتاب:

تیسرا شعبہ تعلیم کتاب و حکمت، یعنی کتاب کی تعلیم دینا ہے، پہلے قاری تلاوت کرتا ہے پھر اس کے تزکیہ کا عمل کرتا ہے اس میں قرآن مجید کی تفسیر، اس کے حقائق کا بیان، اس کے علوم کا اظہار اور مقاصد قرآن کی تشریح و تفصیل سب شامل ہے۔ یہ ہے **یعلمهم الکتاب والحکمة** ان کو سکھاتے ہیں کتاب اور حکمت۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کے طالب علموں، اس کے حاملین اور سامعین میں تفقہ پیدا کیا جائے، یہ وہ چیز ہے جس کی طرف اشارہ ہے۔ **من یرد اللہ به خیراً یفقهه فی الدین** ۔ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

یہ درحقیقت حامل قرآن کے فرائض چہارگانہ اور حامل قرآن کی ذمہ داریاں اور اس کے

کمالات اور اس کی سیرت ہے اس کے بعد صحابہ کرامؓ جو علماء تھے، اور جن کے علم کی خود رسول اللہ ﷺ نے تعریف کی اور جن حضرات کی طرف آپ ﷺ نے اشارے فرمائے، امت کو ان کی طرف رجوع ہونے کا مشورہ دیا، مثلاً حضرت ابی بن کعبؓ آپ ﷺ نے ان کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی خصوصیت بیان کی ہے کہ قرآن مجید سے ان کو خاص مناسبت تھی۔ حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی تھے، قرآن مجید کا بہت بڑا علم رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قرآن مجید پڑھنے کی تعریف آپ نے خود فرمائی تھی۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔

اللّٰهم علمه الكتاب وفقهه في الدين .

اے اللہ ان کو کتاب کا علم عطا فرما۔ اور دین کی سمجھ دے۔

یہ حضرات بھی ان چاروں صفات کے جامع تھے، یعنی قرآن مجید کے ''قاری'' بھی تھے اور ''معلم الکتاب'' بھی تھے اور ''معلم حکمت'' بھی اور ''مزکی'' بھی تھے، یہ چاروں شے ان حضرات میں جمع تھے، پھر تابعین کا دور آیا، اس دور میں بھی کثرت سے ایسے لوگ تھے جو ان چاروں چیزوں کے جامع تھے مثال کے طور پر حضرت حسنؒ بصری کا نام لے سکتا ہوں کہ وہ ان چاروں شعبوں کے جامع تھی۔ اسی طرح حضرت سعید بن جبیر اور محمد بن سیرین اور حضرت سعید بن مسیّب، یہ وہ فضلائے تابعین تھے جو ان چاروں کمالات کے مظہر اور ان چاروں شعبوں کے جامع تھے۔ تبع تابعین میں بھی اسی طرح کی بے شمار ہستیاں پیدا ہوئیں جو ان چاروں چیزوں کی جامع تھیں۔ جیسے ائمہ اربعہ، محدثین، فقہاء اور صوفیاء تابعین جیسے حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت معروف کرخیؒ، اور امام احمد بن حنبلؒ اسی طرح سے جنید بغدادی، یہ سب حضرات ان چاروں چیزوں کے جامع تھے، پھر انحطاط کا دوسرا دور شروع ہوا، اور شعبوں کی تقسیم ہونے لگی نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں مختلف گروہ بن گئے اور ایک شعبہ سنبھال لیا۔ بعض نے تلاوت آیات کو اپنا شعار بنالیا۔ انہوں نے قرآن مجید کو حفظ کیا اور اس کی تجوید اور مخارج کی تصحیح کی، اور اتقان کے ساتھ پڑھنا انہوں نے اپنا فرض سمجھا۔ اللہ تعالیٰ امت کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے کہ بہت بڑا فرض کفایہ ادا کیا اور قرآن مجید کے لطف اور طریقہ ادا کو محفوظ کر دیا۔ جس طرح اس کے حروف کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع کیا تھا اور

حضرت عثمان غنیؓ نے اس کی نقلیں کرا کے عالم اسلام میں بھیجی تھیں۔

بعض حضرات نے تعلیم کتاب وحکمت کو اپنا شعار بنایا۔ وہ علماء ظاہر کی جماعت ہے جنہوں نے قرآن وحدیث کے رموز کو بیان کیا، ان کے مضامین کی اشاعت کی، اور ان کے مشکلالت کی تشریح کی۔

تربیت وتزکیہ:

بعض حضرات نے تزکیہ اپنے ذمہ لیا، وہ حضرات صوفیاء کرام ہیں، جنہوں نے اپنے مریدین کی اور جولوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے ان کے نفوس کی اصلاح وتربیت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو تہذیب واخلاق اور اصلاح باطن کا ایک فن بنادیا، ان حضرات کی تعداد خدا کے فضل سے اتنی بڑی ہے کہ ان کا ذکر کرنا مشکل ہے، مثال کے طور پر سیدنا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی اور خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمھم اللہ۔

تجدید سلوک:

پھر ان کے بعد جنہوں نے فن سلوک کا کام کیا اپنے زمانہ کی پھیلی ہوئی بدعتوں کو اور تحریفات کو انہوں نے دور کیا اور اپنے زمانہ کی طبیعتوں کا لحاظ کر کے انہوں نے طب نبوی ﷺ کی تجدید کی، ان میں سے خاص طور پر حضرت شیخ امام ربانی مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہد، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانوی وہ حضرات ہیں جنہوں نے فن سلوک کی تجدید کا کام انجام دیا، اور اپنے زمانہ کے مطابق ان کو بنایا، اور ان کے فائدہ کو عام کیا۔

حامل قرآن کی ذمہ داریاں:

اصل میں حامل قرآن کا کام صرف تلاوت اس کو پڑھ کر سنا دینا، صحیح طور پر یاد کر لینا اور اس کو صحت کے ساتھ ادا کر دینا، اور کسی مجلس میں، کسی جلسہ میں قرآن مجید پڑھ دینا نہیں ہے بلکہ حامل قرآن کی بہت بڑی ذمہ داری ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس شخص کو عذاب دیا

جائے گا، جس کو اللہ نے قرآن مجید کا علم دیا، وہ رات کو سویا اور سوتا رہا، یہاں تک کہ صبح کی نماز قضا ہوگئی۔ قرآن مجید کی ذمہ داری بہت بڑی ذمہ داری ہے، اس کو یاد کرنے کی اور اس کو یاد رکھنے کی، اس پرعمل کرنے کی، یہی وجہ تھی کہ جب جنگ یمامہ پیش آئی جو اسلام کی شدید ترین جنگوں میں ایک جنگ ہے جس میں زور کا رن پڑا، اور زور کی لڑائی ہوئی، اور کشتوں کے پشتے لگ گئے بس ایک موت کا بازار گرم تھا اور کسی طرح فیصلہ نہیں ہوتا تھا کہ میدان جنگ میں ایک صحابیؓ نے للکارا، اور کہا اے حاملین قرآن، اور وہ لوگ جن کے سینوں میں قرآن ہے، آج قرآن پرعمل کر کے دکھاؤ، اور قرآن پر قربان ہو جاؤ، اس کے لئے اگر یہ ارتداد کا فتنہ نہ ختم ہوا، تو قرآن مجید کا باقی رہنا مشکل ہے، چنانچہ جو حفاظ تھے وہ آگے بڑھے اور فیصلہ کرلیا، بے جگری کے ساتھ لڑے، اور پروانوں کی طرح نثار ہوئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فی صحف مکرمة مرفوعة مطهرة بایدی سفرة کرام بررة.

قرآن مجید بڑی عزت والے صحیفوں میں سے ہے اونچے اور پاک کئے ہوئے ایسے سفیروں کے ہاتھوں میں جو بڑے شریف اور پاک باز ہیں۔

معلوم ہوا کہ حاملین قرآن کی یہ تصویر "**کرام بررة**" ہونا چاہئے، حاملین قرآن کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتوں کی صفت ہے، بلکہ معلوم ہوا کہ جو قرآن مجید کو اٹھانے اور سینے میں رکھنے کا حوصلہ کرے اس کو ایسا بننا چاہئے۔ **لا یمسه الا المطهرون** ، اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ اس قرآن مجید کو مطہر ہی چھوئیں، صحابہ کرامؓ میں سے جو لوگ قرآن مجید کے حافظ ہوتے تھے اور جن میں قرآن مجید کا علم خاص ہوتا تھا، وہ ممتاز اور اپنے اخلاق وتقویٰ اور عبادت میں دوسروں سے بڑھے ہوئے ہوتے تھے، اس لئے حضور ﷺ جب میدان احد میں شہداء کی لاشوں کو دفن کرنے لگے تو قرآن مجید جس کو زیادہ یاد ہوتا اس کو پہلی صف میں رکھتے جاتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے:۔

یؤمکم من أقرأکم.

امامت وہ کرے جو زیادہ پڑھا ہوا ہو

تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خالی حافظ ہو، جس کو قرآن مجید کا علم زیادہ ہو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حفاظ کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

عبرت آموز واقعہ:

دیکھئے! جس شخص کو کوئی بڑی چیز ملتی ہے وہ چھوٹی چیزوں سے بلند ہو جاتا ہے، پھر چھوٹی چیزوں کی طرف اس کی نگاہ نہیں جاتی، میں نے ایک مرتبہ اپنے مدرسہ میں ایک قصہ سنایا، وہ قصہ آپ کو بھی سناتا ہوں۔ بڑا عبرتناک قصہ ہے، بڑے کام کی بات ہے۔

ایک شخص نے کہیں سفر پر جاتے ہوئے شہر کے کسی معزز آدمی کے یہاں اپنی امانت رکھوا دی، اچھی خاصی رقم تھی، کئی ہزار روپیہ کی، اور کہا کہ میں سفر پر جارہا ہوں، وہاں سے آ کر لے لوں گا، انہوں نے کہا اچھا رکھ دو، اللہ مالک ہے، آنا تو پھر لے لینا۔ وہ بے چارہ سفر کر کے آیا، عرصہ کے بعد اس نے ان سے جا کر کہا کہ ہماری امانت دے دیجئے تو وہ بالکل انجان بن گئے، کہنے لگے کہ میں تم کو پہچانتا نہیں کہ تم کون ہو اور کب آئے تھے اور کب رکھوایا تھا؟ بے چارہ حیران ہو گیا، شریف سمجھ کر نہ اس نے کوئی لکھا پڑھی کی تھی، نہ دستاویز لکھوائی تھی۔ اب وہ جتنا یاد دلاتا، وہ بھولتے جاتے یہاں تک کہ ناراض ہو گئے، اور کہنے لگے کہ ایک شریف آدمی کو بدنام کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم مجھے چور بناتے ہو، اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا، اس نے جا کر قاضی سے شکایت کی۔ قاضی صاحب بہت ہی سمجھدار اور ماہر نفسیات تھے، انہوں نے کہا کہ اس کا علاج میں کروں گا۔ تم کسی سے ذکر نہ کرنا تھوڑے دنوں کے بعد ایک شخص کو بھیجا اور کہلوایا کہ آپ قاضی بننے والے ہیں، وہ سن کر بہت خوش ہوئے، بڑا اعزاز تھا، اس دن کے بعد اس شخص سے کہا کہ جا کر اپنی امانت مانگو، وہ گیا اور اس نے کہا کہ شاید آپ کو یاد آ جائے کہ میں فلاں وقت آیا تھا۔ کہا۔ ہاں مجھے یاد آ گیا اور تمہارے جانے کے بعد ہی مجھے یاد آ گیا تھا اور میں تمہارا منتظر تھا، تمہارے گھر کا پتہ مجھے معلوم نہیں تھا بہت اچھا کیا کہ تم آ گئے، تمہاری امانت وہاں رکھی ہوئی ہے جا کر لے لو، جیسے تم رکھ کر گئے تھے ویسے ہی رکھی ہوئی ہے وہ گیا اور لے آیا اس کو بڑا تعجب ہوا، اور ان دو باتوں میں تعلق سمجھ میں نہیں آیا، اس نے قاضی سے کہا جو قاضی القضاۃ تھے، خیر میری امانت مجھے مل گئی۔ مگر یہ انتظام آپ نے کیسے کیا؟ اور انہوں نے اقرار کیسے کیا؟ اور وہ انکار کے بعد اقرار! قاضی صاحب نے کہا۔ کہ بھائی بات یہ ہے کہ ان کو اس سے بڑی چیز ملنے والی تھی۔

اصل میں اس اعلیٰ چیز سے اس کا گراوٹ کا کوئی جوڑ نہ تھا جس کو قضاۃ مل رہی ہو یا

وزارت مل رہی ہو، تو وہ کسی کے پانچ سو یا دو سو روپئے کیا مارے گا، اب ان کے ذہن کی سطح ایک دم سے بلند ہوگئی، تو وہ سوچنے لگے کہ میں قاضی ہوں، اب قاضی کی حیثیت سے معاملہ کو سوچنے لگے، تو یہ حرکت ان کو بہت گری ہوئی معلوم ہونے لگی، اور انہوں نے سوچا کہ پانچ سو کی کیا حقیقت ہے۔

تو میں نے اپنے طلبہ سے کہا کہ تم یہ سمجھو کہ تم عالم ہونے والے ہو، وقت یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تم کو اتنی گری ہوئی معلوم ہوں گی، کہ تمہیں ان کے تصور کرنے سے تکلیف ہوگی، کہ ہم عالم ہو کر ایسی بات کر سکتے ہیں، ہمارے سینے میں جو اللہ کا کلام ہے، حدیث ہے اور حضور ﷺ کا کلام ہے تو ہم ایسی اوچھی اور گری ہوئی بازاری باتیں کر سکتے ہیں۔

قرآن کی دولت سب سے بڑی دولت ہے:

یہی میں آپ سے کہتا ہوں کہ جب آپ یہ سوچ لیں کہ آپ کے سینہ میں اللہ کا کلام ہے تو پھر آپ میں جو کم درجہ کی باتیں ہیں، کوئی بھی گناہ، کوئی بھی گراوٹ کی بات، کوئی بھی سوقیانہ اور اوچھی حرکت، جیسے مال کی محبت، عہدہ کی محبت اور تراویح کا تھوڑا تھوڑا معاوضہ لینا یہ ساری چیزیں آپ کی نظر سے ایسی گر جائیں کہ اگر آپ اپنی حیثیت پہنچان لیں، جس طرح سے وہ شخص جس نے صاف کہ دیا کہ میں تمہیں نہیں جانتا کہ تم نے کب امانت رکھوائی؟ پھر اقرار کر لیا۔ کہ ہاں! ہاں! تم نے امانت رکھوائی تھی اور پھر دے دیا، اسی طرح سے آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے، تو پھر کبھی کسی گناہ کی طرف، کبھی کسی ادنیٰ کام کی طرف، کبھی کسی پست خیالی کی طرف آپ کا ذہن نہیں جا سکتا، بس آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کے سینہ میں کیا ہے۔

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج
در سینہ تو ماہ تمامے نہادہ اند

شاعر نے تو چاند کو خطاب کر کے کہا، کہ ہلال جب باریک ہوتا ہے، تو بے چارہ حقیر معلوم ہوتا ہے، تب اپنے اوپر، اپنے مستقبل پر نظر ڈالو، اپنی تہی دامنی پر رنج نہ کرو کہ تو خالی ہے بالکل بال کی طرح۔

در سینہ تو ماہ تمامے نہادہ اند

تیرے سینہ میں چودھویں کا چاند سو رہا ہے، اور چودھویں کے چاند کی کیا حقیقت ہے، آپ کے سینہ میں اللہ کا کلام ہے، سر الٰہی ہے، علم الٰہی ہے، علم اعظم ہے، لوگ اسم اعظم کے پیچھے پڑتے ہیں، آپ کے سینہ میں علم اعظم ہے، اسی علم اعظم میں اسم اعظم بھی ہے، آپ تو حامل علم اعظم، حامل اسم اعظم ہیں، رسول اللہ نے قرآن کریم کی فضیلت میں فرمایا، ہر حرف کے بدلہ دس نیکیاں ملیں گی اور میں نہیں کہتا کہ الم ایک ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

خیر کم من تعلم القرآن و علمه'

دیکھ لیجئے قرآن مجید کے کیسے کیسے فضائل ہیں، اگر حافظ تیس پارے پڑھے اور رمضان المبارک جیسے مقدس مہینے میں پڑھے، اور مسجد میں رمضان کی راتوں میں پڑھے، اور اس کے بعد سو دو سو پانچ سو روپیہ معاوضہ لے، حیرت کی بات یہ ہے کہ کیسے ایک انسان اس پر تیار ہو سکتا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے ایک روز بہت جوش میں آ کر کہنے لگے، خدا کی قسم اگر کوئی پورا ایک ملک پیش کرے اور کہے کہ پوری سلطنت لے لو اور ایک مرتبہ اللہ کہنے کا ثواب مجھے دے دو، واللہ میں راضی نہ ہوں گا۔ اور قرآن تو اللہ کے ذکر سے بھرا ہوا ہے، ایک ایک حرف اللہ کا کلام ہے، اور اس عالم میں سب سے بڑی قیمتی چیز، جس کا براہ راست اللہ سے تعلق ہے وہ قرآن مجید ہے اور جو سب سے بڑی دولت اس آسمان کے نیچے ہے، وہ قرآن مجید ہے، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نسبت ہے، اللہ کا کلام، اس کو کلام قدیم کہتے ہیں، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ متکلم ہے اور یہ اس سے بڑھ کر تو کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتیں، اس لئے اپنی قدر خود کرنا چاہئے، اور سمجھنا چاہئے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے؟ اگر آپ کو پتہ چل جائے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے تو آپ کے قدم زمین پر نہ پڑیں، کسی امیر کی کسی دولت کی وقعت آپ کے دل میں نہیں ہو سکتی، اگر ہوتی تو ہزار بار استغفار کرتے، ارے میرے دل میں، میرے سینہ میں اللہ کا پورا کلام ہے اور میں اس تاجر کو اس وزیر کو معزز سمجھتا ہوں۔

حضرت حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے تھے کہ میرے دشمن میرا کیا بگاڑیں گے، میری جنت تو

میرے سینہ میں ہے، وہ مجھ سے کیا چھین لیں گے، میں تو اپنی جنت لئے پھر رہا ہوں اللہ کا کلام، اللہ کا علم میرے سینہ میں ہے، میرا باغ تو میرے ساتھ ہے، وہ مجھے کیا قید کریں گے، میں تو بالکل آزاد ہوں، جہاں بھی رہوں گا آزاد رہوں گا۔

روحانیت پیدا کرنے کے لئے عظمت اور اکتساب ضروری ہے:

کیوں ایک شخص کے اندر اتنی روحانیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اتنی ترقی کرتا ہے اور ایک شخص وہ ترقی نہیں کرتا، فرق صرف عظمت اور اکتساب کا ہے، کلام اپنی جگہ عظیم ہے، لیکن اس کی عظمت کا استحضار بھی ضروری ہے، شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مثالوں کے بادشاہ تھے، عجیب عجیب مثالیں دیتے تھے، وہ اس کی مثال دینے لگے، کہنے لگے کسی چیز کا ہونا اور چیز ہے، اور اس کا علم حضوری اور چیز ہے، نواب محبوب علی خاں جو شاہ دکن تھے، موجودہ نظام کے والد، ان کی یہ عادت تھی کہ کبھی کبھی وہ بھیس بدل کر شہر میں گشت کیا کرتے تھے، تو ایک دن یونہی بھیس بدل کر شہر میں گشت کر رہے تھے، ایک تانگہ میں بیٹھ گئے ان کے ساتھ دوسرے صاحب بھی تانگہ میں بیٹھے چلے جا رہے تھے، دونوں یہ بات کرنے لگے، کہو بھائی! آج کل کیا خبر ہے، دوسرے صاحب یہ جان نہ سکے کہ یہ کون صاحب ہیں انہوں نے کہا کہ آج کل گلی کوچہ میں محبوب علی خاں جو ہمارے نواب ہیں، کے منہ پر ہر شخص تھوک رہا ہے اور ان کو برا بھلا کہہ رہا ہے اور ایک قصہ جو اس زمانہ میں مشہور ہوا تھا وہ ذکر کر کے اس نے کہا کہ آج کل یہ مشہور ہو رہا ہے کہ وہ یہ کر رہے ہیں اور جو منہ میں آیا کہنا شروع کیا، محبوب علی خاں وہیں بیٹھے رہے، اس کے بعد انہوں نے بیڑی نکالی، اور کہا دیا سلائی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں، ہے، رات کا اندھیرا تھا اس نے جو ماچس جلائی تو پہچان لیا کہ یہی محبوب علی ہیں، بس اس کی ہاتھ پاؤں پھول گئے اور رعشہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے کہا گھبراؤ نہیں۔

بزرگان دین چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں، انہوں نے کہا کہ محبوب علی خان تو وہی تھے جو آکر بیٹھے، اس وقت محبوب علی خاں صاحب تھے، جب پوچھا تب بھی محبوعلی خاں تھے، جب اس نے کہا تب بھی محبوب علی خاں تھے، اور اس وقت جب ماچس جلائی اور منہ دیکھا تو محبوب علی خاں بدل گئے، تو اس پر ہیبت کیوں طاری ہوئی، وجود پہلے سے تھا، علم اب حاصل ہوا، حالت ہی بدل گئی، تو وجود قرآن تو وہی ہے جو آج سے تیرہ سو سال

پہلے تھا، جو آپ نے بچپن میں پڑھا، آپ نے جوانی میں پڑھا، جو آپ بڑھاپے میں پڑھ رہے ہیں یا پڑھیں گے، جو آپ تہجد میں پڑھتے ہیں، جو آپ تلاوت کرتے ہیں وہی قرآن مجید ہے، اس میں ایک نقطہ کا اضافہ نہیں۔ لیکن جو آپ کے اندر یہ بات پیدا ہوگئی کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور کسی اللہ کا کلام، جس کی صفت یہ ہے اور کون سا کلام جس کی یہ شان ہے، اب آپ کی کیفیت اور کیفیت ہوگئی۔

لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرأیته خاشعاً متصدعاً من خشیة الله۔

الله نزل احسن الحدیث کتباً متشابهاً مثانی تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم ثم تلین جلودهم وقلوبهم الیٰ ذکر الله۔

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دب جاتا، پھٹ جاتا۔

اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے ایک کتاب باہم ملتی جلتی ہوئی، اور بار بار دہرائی ہوئی، اس سے ان لوگوں کی جلد جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں کانپ اٹھتی ہے پھر ان کی جلد اور ان کے قلب اللہ کے ذکر کے لئے نرم ہو جاتے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ دو چیزیں پیدا کرنا ہیں۔ ایک کلام اور صاحب کلام کی عظمت، دوسرے ثواب کی نیت اور ثواب کا یقین کہ ثواب مل رہا ہے، بس یہ دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ایک شخص اعلیٰ مقام ولایت تک پہنچ جاتا ہے۔

قرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن کریم ہے:

بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ سلوک کا آخری درجہ قرآن ہے، اور نوافل میں قرآن مجید پڑھنے سے حاصل ہوتا ہی، جب سالک تمام مقامات طے کر لیتا ہے جو ذکر سے طے ہوتے ہیں، اس کے بعد جو آخری درجہ ہے قرب الٰہی کا، وہ کلام الٰہی کی کثرت تلاوت سے حاصل ہوتا ہے، حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی فرماتے ہیں کہ جو قرب قرأت کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس قرب کو کوئی نہیں پہنچ سکتا، اور یہ قرب استحضار سے، عظمت سے اور ثواب کے یقین سے حاصل ہوتا ہے، پڑھتے جائیے اور یقین کرتے جائیے کہ ثواب مل رہا ہے، ہر حرف پر دس نیکیاں مل رہی ہیں، اس کا شوق آپ کے دل میں زیادہ ہونا چاہئے، جتنا

زیادہ پڑھیں گے، اتنی زیادہ نیکیاں ملیں گی، بس بھائیو! اگر اپنے اندر یہ صفت پیدا کرلیں تو قرآن مجید کی تلاوت میں روح پیدا ہو جائے۔

قرآن کو بطور پیشہ پڑھنا گناہ ہے:

اور اگر اس کو پیشہ بنائیں تو اس سے بہت اچھا ہے کہ دنیا کو آدمی ذریعہ بنائے کسب معاش کا، قیامت کے دن وہ لوگ جو حلال روزی حاصل کرتے تھے اور جائز طریقوں سے کاروبار کرتے تھے، ان دنیا دار قاریوں، حافظوں اور عالموں سے بدر جہا آگے ہوں گے، جنہوں نے دین کو ذریعہ بنالیا تھا اپنا پیٹ بھرنے کا اور دنیا کمانے کا، تاجروں میں بکثرت اولیاء اللہ نکلے ھیں جو سمجھتے تھے ہم دنیا دار ہیں، صرف بچوں کے پالنے اور اپنا پیٹ پالنے کے لئے ایک دھندہ کیا ہے، اور اس میں ذکر کرتے تھے، نماز پڑھتے تھے، ڈرتے رہتے تھے، استغفار کرتے رہتے تھے، وہ کئی عالموں اور حافظوں سے بڑھ کر نکلیں گے، جنہوں نے قرآن مجید اور علم حدیث کو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ بنایا۔

قرآن سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے صحبت اور محنت ضروری ہے:

اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو یہ دولت عطا فرمائی ہے، تو اس میں روح بھی، خشیت بھی اور تقویٰ بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں، اور یہ بات بغیر صحبت کے اور بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوتی، قرآن مجید کے یاد کرنے میں آپ نے جتنی محنت کی ہے، اب اس یاد میں جان ڈالنے اور موزونیت پیدا کرنے کے لئے بھی آپ کو محنت کرنی چاہئے، اگر آپ نے قرآن مجید کے یاد کرنے میں دو برس لگائے تو سچی بات یہ ہے کہ اس میں چار برس لگائیے، اس لئے کہ وہ تو الفاظ ہیں جس کو کافر و مومن سب پڑھ سکتے ہیں، اور بے شک کافر کو یاد ہونا مشکل ہے، لیکن یاد ہوتا ہے، اب بھی مصر و شام میں کتنے غیر مسلم ایسے ہیں، جن کو قرآن مجید یاد ہے، المنجد کا مصنف جو عیسائی تھا وہ حافظ تھا، تو معانی قرآن، علوم قرآن اور قرآن مجید کو دل میں راسخ کرنے کے لئے، اپنے اخلاق کو صحیح کرنے کے لئے، آپ کو وقت لگانے اور محنت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھا ہوا جا رہا تھا، میں نے عرض کیا کہ حضرت اس سفر میں قرآن مجید میں جو بات حاصل ہوتی ہے اور سمجھ میں آتی ہے وہ

گھر پر نہیں آتی، تو حضرت بہت خوش ہوئے، اور دوسروں کو مخاطب کیا کہ دیکھو مولانا کیا کہہ رہے ہیں؟ یہی سچی بات ہے۔ میدان جہاد میں جن لوگوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا، اور خدمت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا اور محنت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا، ان کی سمجھ تو ہمارے یہاں قرآن مجید پڑھنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔

قرآن مجید سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک وتعالی آپ کو قرآن مجید کی تعظیم کرنے کی، اس پر عمل کرنے کی، اور اس کا لطف لینے کی، اور اس سے قرب حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وما علینا الا البلاغ

متنوع اور گہرے مطالعہ کی ضرورت

ذیل کی مضمون حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ کی اس طویل تقریر کا دوسرا جزء ہے جس میں طلبہ کو مطالعہ بڑھانے اور حالات وزمانہ کی نبض پہچاننے اور اس کے مطابق دعوتی کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی دعوت دی گئی۔

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نو من بہ و نتو کل علیہ و نعوذ باللہ من شرر انفسنا و من سیأت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضل اللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحد ہ لاشریک لہ و نشھد ان سید نا ومولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد.

عالم اسلام کی موجودہ صورتحال کا تقاضا

عزیز طلبہ: عالم اسلام کی جس صورتحال کی تصویر ہم نے پیش کی ہے، اس نے ہمارے لئے ایک زبردست چیلنج کھڑا کر دیا ہے، وہ چیلنج یہ ہے کہ ہم کیسے اس کا مقابلہ کریں اور ان چیلنجوں کا جواب کیسے دیں، ظاہر ہے اس کے لئے بڑی تیاری کی ضرورت ہوگی، اس سلسلہ میں ایک باخبر تعلیم وتدریس کا کام کرنے والے تجربہ کار کی حیثیت سے آپ کو علمی تیاری کے سلسلے میں مطالعہ کا مشورہ دوں گا۔

کورس کی کتابوں اور مطالعہ کی کتابوں میں فرق

عزیز دوستو: یہ بات یاد رکھئے کہ کورس کی کتابوں اور مطالعہ کی کتابوں کے درمیان ایک نازک فرق ہے وہ یہ کہ کورس کی کتابوں اور نصاب تعلیم پر ایک خاص قسم کی سرکاری مہر یا کسی خاص جماعت کی اور اس کے انتساب کی مہر لگی ہوتی ہے، اس لئے وہ ایک طرح سے حجاب بن جاتا ہے، لیکن مطالعہ کی کتابوں میں ایسا نہیں ہوتا، مطالعہ کی کتابیں اپنے شوق رغبت سے خریدی جاتی ہیں اور ان کا انتخاب مرضی کے مطابق کیا جاتا ہے اور آزادی کے ساتھ وہ پڑھی

جاتی ہیں، اس لئے ہم مطالعہ کی کتابوں اور ان کے مواد کے نتائج کو نظر انداز نہیں کر سکتے، کورس کی کتابوں کی تنقیص یا اس کی تحقیر کوئی کیسے کر سکتے ہے، کورس بہر حال کورس ہے، اس پر محنت کرنی چاہئے، وہی کامیابی وناکامی کا امتحان اور پیمانہ ہے۔

اسلام کے بارے میں موجودہ دانشور طبقے کے خیالات

غلط کتابوں کے مطالعہ سے جو ذہن تیار ہو رہے ہیں اور جو طبقہ اس وقت دانشور کہلاتا ہے، وہ اس بات کا قائل نہیں کہ اسلام ایک زندہ اور ابدی مذہب ہے اور وہ ہر زمانہ اور تغیر پذیر دنیا میں قیادت کی صلاحیت رکھتا ہے، بلکہ اس کا عقیدہ اور خیال یہ ہے کہ بانی اسلام ایک اچھا مذہب تھا، اس نے آج سے چودہ سو سال پہلے اچھا کام کیا تھا، اس نے زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو مزید زندہ درگور ہونے سے بچایا تھا، علم کو اس نے عام کیا تھا، لیکن اس جدید دور اور سائنس وٹیکنالوجی کے اس عہد میں اس کا کوئی کام صحیح نہیں ہے اس زمانہ میں بار بار اسلام کا نام لینا اور شریعت پر عمل کرنے کی دہائی دینا صحیح نہیں ہے، اس طرح کی دعوت گویا زمانہ سے ناواقفیت کی بات ہے، ایسی کتابوں کے مطالعہ کے برعکس ایک صالح و مصلح اور ایک ایمان افروز اور یقین آفرین ادب اور انسانیت ساز اور اخلاق ساز ادب کا مطالہ اور اس کے نتائج کو دیکھئے کہ ایسے ادب کا مطالعہ اتنا ہی مؤثر اور مفید ہے جتنا وہ مضر اور نقصان دہ ہے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ جن سے کام لے رہا ہے اور جن سے اس نے کام لیا ہے، ان میں صلاحیت اور استعداد پیدا ہونے اور ان صلاحیتوں کو بروے کار لانے میں بہت دخل اس صالح ادب کے مطالعہ کو تھا، جس نے ہمیشہ آڑے وقتوں میں ہلاکت کے آغاز میں گرنے سے بچایا ہے، اس کی میں چھوٹی سے مثال دیتا ہوں۔

جس زمانہ میں الندوہ، مولانا عبدالسلام قدوائی اور ہماری ادارت میں نکل رہا تھا ہم نے مشاہیر اہل علم سے درخواست کی تھی کہ آپ حضرات ایک مضمون لکھ کر یہ بتائیں کہ آپ کی محسن کتابیں کون سی ہیں تا کہ ہمارے رسالہ کے پڑھنے والے اور طلبہ اس سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمان کاں شیروانی، مولانا مناظر احسن گیلانی،

مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا اعزاز علی صاحب جیسے علماء ادباء کے ساتھ جدید طبقہ کے بعض اہل علم اور فضلاء کے مضامین اس موضوع پر آئے، یہ تمام مضامین بعد میں الگ سے بھی کتابی صورت میں شائع کر دیئے گئے تھے۔

ان تمام مضامین میں ایک مضمون لاہور کے مشہور فاضل بشیر احمد (آکسن) کا بھی تھا، انھوں نے لکھا کہ جب میں آکسفورڈ میں پڑھتا تھا تو مجھ پر بار بار تشکیک اور الحاد کا حملہ ہوتا تھا، کبھی کمیونزم کا حملہ ہوتا تھا، ایسے موقع پر علامہ شبلی کی کتاب الفاروق ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی تھی کہ وہ شخصیت جس کے بارے میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، وہ گمراہ نہیں ہو سکتی۔ وہ شخصیت جس دین پر بھی اور جس کے قلم سے یہ لکھی گئی ہے، اس کو ہم گمراہ نہیں مان سکتے، حق اس کے ساتھ ہے، ہم کو تو اس کی زندگی گذارنی چاہئے اور اس پر مرنا چاہئے، ایسے ہزاروں اور لاکھوں واقعات ملیں گے کہ صحیح مطالعہ بلکہ زبان وعلم افروز مطالعہ نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

کتاب کے اندر علمی وزن، طرز نگارش اور نفسیات شناسی بھی ضروری ہے

میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بعض اوقات تنہا ایمانی طاقت کو غذا پہنچانے والی اور ایمان کے نام سے اپیل اور مطالعہ کرنے والی چیزیں کافی نہیں ہوتیں اس کے ساتھ علمی وزن اور طرز نگارش اور نفسیات شناسی بھی چاہئے، جن کتابوں میں ان امور کا لحاظ رکھا گیا، انھوں نے زندگیوں کو بنا دیا اور اپنی زندگیوں کے ذریعہ انھوں نے پورے معاشرے پر اثر ڈالا۔

میں دوسروں کے سنے سنائے واقعات کے بجائے خود اپنا واقعہ بیان کرتا ہوں کہ جب میں اردو پڑھنے کے قابل ہو گیا تو سب سے پہلے جس کتاب نے ہمیں متاثر کیا وہ سیرت خیر البشر تھی۔

مین چونکہ مکتبات کی فہرست دیکھنے کا عادی تھا، لکھنؤ میں شبلی بکڈ پو اور بمبئی میں عربی کتب کا واحد مکتبہ قیمہ تھا میں نے فہرست اور رحمۃ للعالمین نامی کتاب کا اشتہار دیکھا جو قاضی سلیمان منصور پوریؒ کی قلم سے لکھی ہوئی تھی، میں نے اس کتاب کا آرڈر دیدیا جب وہاں سے کتاب کی وی پی آئی تو میرے پاس اس کے چھڑانے کے لئے پیسے نہیں تھا، والد صاحب کا

انتقال ہو چکا تھا، والدہ صاحبہ کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ دیتیں، حالانکہ اس زمانہ میں کتابوں کی قیمت بہت کم ہوا کرتی تھی، والدہ صاحبہ نے قیمت دینے سے معذرت کر دی، اب کیا کروں، اس نازک صورتحال دیکھ کر میں ابھی ان خوردسال صحابہ کرام کی طرح رونے لگا جو جہاد میں شامل نہ کئے جانے پر رو رہے تھے، والدہ صاحبہ نے مجبور ہو کر کہیں سے اس کا انتظام کیا اور وہ وی پی ہم نے چھڑا لی، ہم نے اس کتاب کو پڑھا، بلکہ ہم اس کتاب میں ڈوب گئے، اس زمانہ میں ہمارے ایک عزیز میڈیکل کالج میں داخل تھے، ہم وہاں رہتے تھے، ایک استغراق کا عالم تھا، کالج کی شاندار عمارت کے بیچ اور سڑکوں پر آنے جانے والوں کی ہمیں کوئی خبر نہیں ہوتی تھی، ہماری آنکھیں ان کے بجائے بدر واحد کے میدانوں کو زیادہ دیکھتی تھیں اور وہاں کی شہادت گاہوں کو دیکھتی تھیں، پروفیسروں اور طلبہ کو دیکھنے کے بجائے ہماری آنکھوں میں بدر واحد کے مجاہدین اور خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کا تصور بسا ہوا تھا، ایک طرح سے اس میں اس کتاب میں فنا ہو گیا تھا۔

یہ بھی ایک معمہ ہے جو ابھی تک سمجھ نہیں سکے کہ کانپور میں ۱۹۲۶ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ تھا اس میں مولانا سلیمانؒ منصور پوری بھی آئے تھے، انھوں نے ہمارے بھائی صاحب مرحوم سے پوچھا کہ ہم نے آپ کے چھوٹے بھائی ابوالحسن کو کتاب رحمت للعالمین بھیجی تھی وہ ملی یا نہیں ان کے دل میں یہ کیسے خیال کہ ان کا چھوٹا بھائی اس کتاب کو پڑھے گا اور اسے فائدہ ہوگا۔

ہمارے گھر پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ ہمارے چچا سید فاروق صاحب کے گھر میں مولانا شبلیؒ، مولانا سید سلیمانؒ ندوی اور مولانا حالیؒ وغیرہ کی کتابیں تھی، ان میں الفاروق اور الغزالی بھی تھی، اور حیات سعدی بھی، ایک اور کتاب تھی، ارشاد رحمانی جو مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء کی کتاب تھی، جس میں انھوں نے اولیں زمانہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کی خدمت میں اپنی حاضری، ان کی نگاہ شفقت اور ان کی تاثیر اور برکتوں کا ذکر کیا ہے، اس کتاب نے بھی پر بڑا اثر ڈالا پھر اور کتابیں دیکھنے میں آئیں، اس کے بعد زمانہ آیا جب ہم نے انگریزی اتنی پڑھ لی کہ جدید مغربی مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کر سکیں۔

ہم یہاں آپ کو ایک حقیقت سے باخبر کرنا چاہتے ہیں، ایک چیز ہوتی ہے،

فیکٹر FACTOR اور دوسری چیز ہوتی ہے ایکٹر ACTOR، ہم نے اپنی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ مسلمان خربوزہ کی طرح ہے، وہ چھری پر گرے تو اس کا نقصان اور چھری اس پر گرے تو خربوے کا نقصان یعنی مسلمانوں میں صرف اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے اثر ڈالنے کی نہیں، ہمارے گھر میں جو ماحول تھا وہ اعتدال اور توازن اور حقیقت پسندی کا تھا ایک طرف ہمارے بھائی صاحب تھے جو ندوہ کے فاضل، دیوبند کے فاضل، دوسری طرف سائنس کے بہترین طالب علم میڈیکل کالج میں امتیاز کے ساتھ انھوں نے امتحانات پاس کئے، اور انھیں سونے کا تمغہ بھی ملا تھا، دوسری شخصیت ہمارے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب کی تھی جو ایک طرف ایم اے تھے تو دوسری طرف شرقی علوم کے فاضل ان دونوں کی گفتگو میں بڑا توازن اور حقیقت پسندی تھی۔

مغربی تہذیب کا سوفیصدی انکار صحیح نہیں ہے

یہ نکتہ آپ یاد رکھئے کہ محض مبالغہ اور رادعا سے کام نہیں چلتا، یہ چیز اکثر مضر ہوتی ہے، مثلا یہ کہہ دیا جائے کہ مغربی تہذیب کچھ نہیں، اس میں کوئی چیز قابل استفادہ نہیں، ٹھوکر مارنے کی چیز ہے، لیکن جب آدمی کو اس کے خلاف کوئی ثبوت ملے گا یا اس کو تجربہ ہوگا، سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد کا تو وہ پھر منکر ہو جائے گا، اس لئے یہ حقیقت ان لوگوں کے سامنے رکھنی چاہئے جو دعوت تربیت کا کام کرتے ہیں، کہ انھیں توازن واعتدال اور حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے، نہ یہ کہ انکار پر آئے تو سوفیصدی انکار کہ اس مغربی علوم میں کوئی خوبی نہیں، مغربی علوم میں بہت سی چیزیں قابل استفادہ ہیں اور قابل قدر ہیں، ان کی ضرورت ہے، لیکن وہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہیں، ان کی اخلاقی عنصر اور ان کے اندر تربیتی صلاحیت، خوف خدا پیدا کرنے اور ضمیر کو بیدار کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، یہ حقیقت بھی یاد رکھئے کہ عدم توازن بعض اوقات ارتداد تک پہونچا دیتا ہے، اور یہ آدمی کا رخ بدل دیتا ہے، ان دونوں حضرات کی محبت اور گفتگو سے حقیقت پسندی پیدا ہوئی، میں نے امریکی مصنف ڈریپر کی مشہور کتاب ''معرکہ مذہب وسائنس اور لیکی کی'' تاریخ اخلاق یورپ'' پڑھی ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے یورپ ذہن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی، مغربی تہذیب اور اس کے عوامل ومحرکات کو سمجھنے کے

لئے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے، مذہب و سیاست کے درمیان کشمکش کے موضوع پر علامہ اقبال نے کہا ہے۔

خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کلیا کہ پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

مسیحی مذہب اور اس کے اجارہ دار کلیسا کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ زندگی کی رہنمائی کرتا اس کی وجہ سے کلیسا اور سیاست کے درمیان ایک رقابت بلکہ محاذ آرائی ہونے لگی، کلیسا میں کیا کمزوریاں تھی اور سیاست کیا چاہتی تھی اور اس دور میں سیاست تھی اس کتاب میں معرکہ مذہب وسائنس سے ہمیں بڑا فائدہ پہونچا۔

دوسری کتاب تاریخ اخلاق یورپ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ یورپ کے اخلاق اور اس کے معاشرہ کی تشکیل میں مادہ پرستی کا جو کردار رہا ہے، اس کے اسباب وعوامل کیا ہیں، وہ اس کتاب سے معلوم ہوا۔

پھر ایک تیسری کتاب لندن یونیوسٹی میں شعبہ کے صدر کی کتاب AGUIDTO MODERN WICKEDNESS پڑھنے کو ملی جس میں اس نے بتایا ہے کہ اس وقت کی خباثت کیا ہے، دوسری کتاب A NEW PHILOSPHY FOR OUR TIMES پڑھنے کو ملی جس سے بڑا فائدہ ہوا۔

یہ دونوں کتابیں مولانا عبدالماجد دریابادی کے ذریعہ ملیں۔

یہ توجہ جملہ معترضہ تھا، بتانا آپ کو یہ ہے کہ ان کتابوں کے مطالعہ نے یہ صلاحیت ہی بلکہ داعیہ اور داعیہ ہی نہیں بلکہ ایک اضطرابی کیفیت پیدا کی ہم ایسی کتاب لکھیں جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ مسلمانوں کا ارتقاء اور عروج کا اور مسلمانوں کا انحطاط دنیا کے اخلاقی، انسانی، معنوی، ذہنی، مذہبی، معاشرتی اجتماعی، اور سیاسی ہر طرح کے انحطاط کا سبب ہے، یہ موضوع بالکل نیا تھا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ القاء تھا اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے اس کو لکھا ہماری حقیر ذات سے کچھ کام لینا تھا، ممالک عربیہ میں، یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے لکھوائی، عرب نوجوانوں اور دانشوروں اور مفکرین نے پڑھا، سید قطب جیسے چوٹی کے لوگ جو وہاں تھے، انھوں نے جس نظر سے دیکھا پھر اس کتاب سے نئے طبقہ پر جو اثر پڑا جس احساس کمتری میں عرب ممالک کے نوجوان ادیب اور اہل قلم مبتلا ہو رہے تھے، اس میں فرق پڑا اس کے بعد اور کتابوں کے لکھنے کی توفیق ہوئی۔

چند بنیادی کتب جن کا مطالعہ ضروری ہے

اب میں چند کتابوں کے نام لیتا ہوں، آپ ان کتابوں کا ضروری مطالعہ کریں، ایک تو آپ سیرت کے موضوع پر علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی کتابیں ہیں، اس کتاب ''سیرت النبیؐ'' کو اول درجہ کی کتاب عرب ممالک میں مانا گیا ہے، سید صاحب کی کتاب خطبات مدراس کا ضروری مطالعہ رکھیں، اس کے ساتھ صحابہ کرام، خلفائے راشدین کی سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، انہیں اپنے مطالعہ میں رکھیں، علامہ شبلی کی الفاروق، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی سیرۃ الصدیق اور ہماری حقیر تصنیفات میں المرتضٰی، ماذا خسر العالم اور اس کا ترجمہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر مسلمان ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش ضرور پڑھیں، یہ وہ بنیادیں کتابیں ہیں، جو آپ کے ذہن سے اپنے نظام تعلیم، نظام فکر اور اس سے آگے بڑھ کے اسلامی تعلیمات اور اسلامی ہدایات کے بارے میں اگر احساس کمتری ہے اس کو دور کریں گے، تاریخ دعوت وعزیمت کے پانچوں حصے بھی آپ پڑھیں، میں بغیر کسی تواضع اور معذرت کے کہتا ہوں کہ یہ اپنے موضوع پر بالکل منفرد کتاب ہے، ابھی تک کسی اسلامی زبان میں اس طرح تاریخی تسلسل، دینی وتاریخی، نقطہ نظر اور بحث وتحقیق کے ذریعے پھر مؤثر طریقے سے مصلحین امت اور مجددین ملت کا تذکرہ نہیں لکھا گیا،

اس کا انگریزی، عربی، ترکی وفارسی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

نقوش اقبال یا روائع اقبال بھی آپ پڑھیں ابھی جو نظم پڑھی گئی اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اقبال کو عشق رسول سے حصہ وافر ملا تھا، میں دو مرتبہ ان سے ملا ہوں اس وقت بہت کم لوگ زندہ ہوں گے جو اقبال سے ملے ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے موقع دیا، میں ان کی مجلس میں بیٹھا، ان کی باتیں سنیں، ان کے انتقال سے چند مہینے پہلے ان سے ملا تھا، مدینہ منورہ کا نام سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

ایک مار مدینہ منورہ میں مجھے بعد نماز مغرب تقریر کے لئے مدعو کیا گیا، مجھے شرم آئی کہ میں اللہ کے محبوب رسول کے علاوہ اگر کسی اور شخصیت بارے میں یہاں تقریر کروں تو یہ زمین میں گڑ جانے کی بات ہے اور سخت شرمندگی اور تائب ہونے کی بات ہے، میں نے اپنی تقریری میں کہا کہ جوار رسول میں غیر رسول پر تقریر کرنے کا اگر جواز ہے تو یہ کہ جس شخصیت (اقبال) کے بارے میں میں تقریر کرنے جارہا ہوں وہ عاشق رسول تھے، پھر میں نے دو شعر ان کے فارسی کے پڑھے۔

باین پیری رہ یثرت گرفتم
نواخوں از سرور عاشقانہ
چوآں مرغے کہ در صحرا سر شام
کشاید پر بہ فکر آشیانہ

میں بڑھاپے میں مدینہ کی طرف چلا تو لوگوں نے کہا کہ یہ عمر اور مدینہ کا سفر، یہ عمر اور عرب کا سفر کہاں جا رہے ہو اور کیا سوچ رہے ہو، میں نے کہا کہ پرندہ دن بھر اڑتا رہتا ہے، مارا مارا پھرتا ہے، لیکن شام ہوتے ہی وہ تیز کی طرح اپنے آشیانہ کی طرف جاتا ہے، میں بھی اپنے اشیانہ کی طرف جارہا ہوں۔

مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ مہاراجہ کپورتھلہ نے فارسی میں کسی قانونی دستاویز پر انگریز ی میں ترجمہ کرانے کیلئے ڈاکٹر اقبال کو بلایا ان کی رہائش کے سارے انتظامات کئے، رات کو اچانک مہاراجہ کو خیال آیا کہ کہیں ڈاکٹر صاحب کو کوئی ضرورت نہ ہو یہ دیکھنے کیلئے جب گئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب مسہری پر آرام کرنے کے بجائے زمین پر لیٹے ہوئے ہیں، مہاراجہ نے

کئی بار پوچھا تو انھوں نے کہا کہ مجھے خیال آیا کہ میرے آقا تو زمین پر لیٹتے تھے میں چارپائی پر لیٹوں، مجھ سے لیٹا نہیں گیا۔

کلیات اقبال ضرور پڑھئے

اس لئے آپ کو مشورہ دوں گا کہ کلام اقبال میں بال جبرئیل اور ضرب کلیم ضروری پڑھئے، فکر کا بھی فائدہ ہوگا، اور ادبی فائدہ بھی ہوگا، ہم نے بعض عرب فضلاء کو دیکھا ہے کہ وہ روائع اقبال کے صفحے کے صفحے زبانی پڑھتے تھے، ان میں عمان کے مفتی خلیلی بھی ہیں۔

حیاۃ الصحابہ کی افادیت

مولانا یوسفؒ صاحب کی مقبول ترین کتاب ''حیاۃ الصحابہ'' آپ ضروری پڑھیں، اس میں صحابہ کرام کے مؤثر اور طاقتور ترین واقعات ہیں اس کتاب کے پڑھنے سے احساس کمتری کے دور کرنے میں مدد ملے گی۔

ہمارا رسالہ اسلامی بیداری کی لہر یا عربی تحریر ترشیدہ الصحوۃ الاسلامیہ ضرور پڑھیں، اس وقت دینی جماعتوں میں کیا کمزوریاں ہیں، مسلمانوں کے کیا طبقات ہیں، اور ان کی ضرورتیں کیا ہیں، ان کے عقلی مدارک کیا ہیں اور کس زبان اور کس مواد کی روشنی میں ان سے بات کرنی چاہئے، اور کس لہجہ میں ان سے خطاب کرنا چاہئے، اس میں بتایا گیا ہے کہ بہت سی تحریکیں جمود توڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہیں لیکن خود جمود کا شکار ہو جاتی ہیں، ان پر کائی جم جاتی ہے، جیسے ساحل پر کائی جم جاتی ہے، اس کائی کو کئی مرتبہ ہٹانا کافی نہیں ہوتا بلکہ بار بار دیکھنا چاہئے، آپ کو چونکہ دعوتی کام کرنا ہے، اس لئے ان کتابوں کو پڑھنے سے آپ کی ذہن سازی ہوگی، اور آپ کو فکری غذا فراہم ہوگی، دعوت کے موضوع اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ اور نشأۃ اسلامیہ پر ہمارے مقالات اور تقریروں کا مطالعہ کریں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مدرسہ دینیہ سے فارغ ہونے والے طلبا کے نام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلباء کے سامنے دردبھرے لہجے میں ناصحانہ اور عالمانہ انداز میں یہ فکرانگیز الوداعی تقریر ۸ دسمبر ۱۹۹۶ء میں فرمائی، جوافادۂ عام کی غرض سے ہدیہ ناظرین کی جارہی ہے

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نو من بہ و نتو کل علیہ و نعوذ باللہ من شرر انفسنا و من سیأت اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضل اللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحد ہ لاشریک لہ و نشہد ان سید نا ومولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد .

فرزندان عزیز! میں اس مجلس کے لئے اور یہاں سے فارغ ہوکر جانے والوں کے لئے اس سے بہتر پیغام اور اپنے مطالعہ ومعلومات اور اپنے علمی ذوق وجستجو میں اسے بڑھ کر کوئی وصیت نہیں پاتا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر پر جانیوالے صحابہؓ سے فرمایا تھا ''**استودعک اللہ دینک وامانتک و خواتیم اعمالک**'' میں اللہ کے حوالے کرتا ہوں تمہارا دین، تمہاری امانت اور تمہارے خواتیم اعمال۔ ان الفاظ میں لفظ امانت ایسا ہے جس کے مفہوم کو ایک مفرد لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ضمیر کی بیداری، احساس فرض، فرائض کی ادائیگی، اللہ تعالیٰ کا خوف، انسانوں سے محبت، احکام الٰہی کا احترام اور ان پر عمل، یہ سب مفاہیم اس ایک لفاظ میں شامل ہیں، قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ''**انّا عرضنا الامانتہ علی السموات و الارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوماً جہولا**''۔

ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اسے اٹھالیا بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا (احزاب)

عزیزو میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ان تینوں چیزوں کو گرہ میں باندھ لیجئے بلکہ لوح دل پر لکھ

لیجئے دین امانت اور حسن خاتمہ، ان میں خواتیم اعمال کی ذمہ داری آپ پر اس طرح نہیں ہے جس طرح دین وامانت کی ذمہ داری آپ پر ہے یہ اللہ تعالیٰ کے کرنے کی چیز ہے، لیکن اس کے لئے بھی کچھ اسباب ہیں، کچھ صفات وخصوصیات ہیں جن کا آپ کے اندر ہونا ضروری ہے۔ وہ ہے آپ کا طرز عمل، آپ کا عقیدہ اور آپ کا عمل ہوگا تو اللہ کی طرف حسن خاتمہ کا فیصلہ ہوگا۔ وہی حسن خاتمہ نصیب کرے گا شرط یہ ہے کہ ان بنیادی صفات سے آپ متصف ہوں جن پر حسن خاتمہ کا انحصار ہے۔

اپنا وقار بلند کریں

عزیزو! میں صاف صاف آپ سے کہتا ہوں اور اس میں کسی اشارے کنائے سے کام نہیں لیتا، آپ نماز پنجگانہ کی پابندی کریں، نوافل تسبیحات، کو بھی ترک نہ کریں، تاکہ معلوم ہو کہ آپ کسی دینی درسگاہ سے پڑھ کر آئے ہیں مسجد کی طرف جانے میں، بلکہ تمام کاموں میں ثواب کی نیت سے کریں۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جو منزلیں اور جو امتحان وآزمائشیں آپ کو پیش آنے والی ہیں۔ اور یہ ملک بلکہ ملت اسلامیہ جس راستہ سے گزر رہی ہے۔ پھر معاشی ذمہ داریاں، خاندان کی پرورش کا مسئلہ، پھر جو اخلاقی بیماریاں اور امراض ہیں وہ سب نماز کی ادائیگی میں فرق پیدا کر سکتے ہیں اور اس کی طرف سے توجہ ہٹا سکتے ہیں۔ مگر اس نماز سے بھی پہلے بنیادی اہمیت عقیدہ توحید کی ہے آپ کا عقیدہ خالص اور بے آمیز توحید کا عقیدہ ہو، اس سلسلہ میں مسلک ولی اللہ آپ کا معیار اور شاہ اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان آپ کا دستور العمل ہو۔ اس عقیدہ پر ہماری جماعت کی بنیاد پڑی ہے۔ اس دور میں کم سے کم ہندوستان بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایشیاء اور پورے مشرق میں جو فکر سب سے زائدہ عمیق اور علمی بنیادوں پر استوار اور اسلام کی کلی تعبیر اور صحیح تعبیر کے لحاظ سے، نیز سب سے زیادہ مفید، قابل عمل اور وقت کے اعتبار سے زندہ اور طاقتور بھی ہے شاہ ولی اللہ کے مسلک سے بہتر کوئی مسلک نہیں، آپ حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ بھی کریں جس میں نظام عبادات کی مربوط تشریح کی گئی ہے ہمارے کتاب دعوت وعزیمت کا وہ حصہ خاص طور پر پڑھیں جو شاہ ولی اللہ دہلوی سے متعلق ہے اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ فکر ولی اللہ سے بڑھ کر ترقی یافتہ عالمانہ، محققانہ، حقیقت پسندانہ کوئی اور مکتب تجدید واصلاح اور مکتب دعوت نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام میں ان کی نظیر

نہیں آپ اس مسلک کو اپنائیں اور اس کو دستور العمل بنائیں۔

زہد و استغنا کی ایسی مثال قائم کریں کہ.........!!

تیسری بات یہ ہے کہ آپ زہد و استغنا کی ایسی مثال قائم کریں کہ بڑی سے بڑی حکومت وسلطنت آپ کو خرید نہ سکے، اس دین کے اب تک باقی رہنے کا راز بھی یہ ہے کہ ربانی وحقانی علماء کو آج تک کوئی خرید نہیں سکا۔ شیخ سعید حلبی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ جامع اموی میں بیٹھے درس دے رہے تھے، ان کے پاؤں میں تکلیف تھی جس کی بناء پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھے۔ کہ اتنے میں شام کا گورنر آیا جو بڑا سفاک اور جبار قسم کا حکمراں تھا اور معمولی بات پر گردن اڑا دیا کرتا تھا شیخ اسی حالت میں درس دے الگ رہے تھے کہ گورنر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آیا۔ وہ کچھ دیر تک حلقۂ درس کے پاس کھڑا دیکھتا رہا، شیخ بے نیازی سے اپنے کام میں مصروف تھے، یہ صورت دیکھ کر طلبا نے کپڑے سمیٹ لئے کہ کہیں اسی مجلس میں ہمارے شیخ صاحب کی گردن نہ اڑا دیجائے۔ جس کے خون کے چھینٹے ہمارے کپڑوں پر پڑ جائیں۔ گورنر تھوڑی دیر کھڑا رہ کر واپس چلا گیا۔ اس نے وہاں سے اشرفیوں کا توڑا شیخ کو بھیجا کہ یہ قبول کرلیں، شیخ صاحب نے وہ توڑا یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ تم اپنے آقا سے سلام کہنا اور یہ کہنا کہ پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا''۔

''سلم علی مولاک وقل له من یمدر جله لایمدیده''

اسی طرح کا ایک قصہ خواجہ نظام الدین اولیا کا ہے کہ ان کو سردیوں میں دھوپ لینے کی ضرورت تھی۔ سڑک کے کنارے کی طرف رخ کرکے پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ ابھی بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے آپ پاؤں سمیٹ لیتے تو اچھا تھا آپ نے یہ سن کر بڑا بلیغ جملہ کہا ''جو ہاتھ سمیٹ لیتا ہے اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں''، یعنی بادشاہ کی مدد سے جو ہاتھ سمیٹ لے اس کی کوئی مدد قبول نہ کرے تو پھر اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

آپ اپنے کو پوری طرح آزاد رکھئے۔ کسی حکومت کی سرپرستی، اور کسی مالی سرچشمہ اور سرپرستی سے آزاد رہئے۔ اس وقت یہ عام ہوا چلی ہوئی ہے عربی پڑھنے والے خلیجی ملکوں میں جاتے ہیں اور خاص طور پر سعودی عرب جاتے ہیں تاکہ بڑی نوکری تلاش کریں۔ میں بڑی

صفائی سے کہتا ہوں کہ اس ملت کا سب سے بڑا فریضہ اور وقت کا جہاد یہ ہے کہ جس کی اللہ تعالی کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہوگی۔ آپ بلاد عربیہ دعوت دینے کیلئے جائیں، جہاں سے ہمیں ایمان کی دولت ملی، ان عربوں کو ان کا فریضہ یاد دلانے کیلئے جائیں، آپ کے عربی پڑھنے کی یہی قیمت ہے، الحمدللہ یہاں ایسا لٹریچر تیار ہوگیا ہے جس نے وہاں تک ہماری آواز پہنچائی۔ عرب قوم پرستی کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر اور طاقتور آواز ندوۃ العلماء سے بلند ہوئی۔

اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں

عزیزو! آپ اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں اور اپنے جسم کو بھی آزاد رکھیں، اس وقت بہت بڑا خطرہ پیدا ہوگیا ہے وہ خطرہ یہ ہے اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہوں کیلئے باقاعدہ تحریک چلائی جارہی ہے۔ کہ انہیں حکومت کے خزانے سے تنخواہیں اور تمام سہولتیں دی جائیں۔ اسکا مطلب یہی ہوگا کہ اماموں سے الیکشن کے موقع پر کام لیا جائے گا۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے خلاف کام لیا جائے گا۔ اس لئے کہ جب مساجد محکمہ اوقاف کے ماتحت ہوں گی اور وہ سرکاری ملازم قرار پائیں گے تو ایسے ائمہ مساجد کے منبروں سے آزادی کے ساتھ دین کی بات نہیں کہہ سکیں گے۔ اس لئے آپ اپنے دین کی حفاظت کیجئے، عقائد کے لحاظ سے بھی اور اعمال کے لحاظ سے بھی، حقوق کے لحاظ سے بھی اور فرائض کے اعتبار سے بھی

امانتک: کا مطلب یہ ہے کہ ملت کی طرف سے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آپ پر کیا ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں ملت کن خطرات سے گزر رہی ہے، کس وادئ خار سے گزر رہی ہے۔ آج مسلم پرسنل لاء کو مٹانے کی کیسی کیسی کوششیں کی جارہی ہیں۔ مشرکانہ تعلیم کے ذریعہ، جبری طور پر نئی نسل کو کس طرح نئی سانچہ میں ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش ہورہی ہے۔ اور یہ منصوبہ ہر جگہ تیار ہے کہ مسلمان صرف نام کے باقی رہیں باقی ان کی تمام خصوصیتیں ختم ہوجائیں۔ اس ملک کو اسپین بنانے کی زبردست سازش کی جارہی ہے۔ آپ کو اصلاح معاشرہ کا کام بھی کرنا ہے۔ کہ یہ بھی ونیکم میں شامل ہے۔ اس وقت جاہلی رسوم و رواج وبا کی طرح پھیلے ہوئے ہیں ہیں دولت پرستی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ معمولی چیز کی خاطر جانیں لی جارہی ہیں۔ آپ کو اس مہم کے خلاف بھی مہم چلانی ہے۔ بلکہ اس مہم کی پوری ذمہ داری آپ کو قبول کرنی ہے، پھر ثقافتی اور فکری لحاظ سے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی آپ کو حفاظت کرنی ہے،

رسم الخط اور کلچر کے لحاظ سے بھی اور زبان کے اعتبار سے بھی، اگر آپ قربانیاں دیں گے زہد واستغنا سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا۔ یہ ملت اپنے تشخصات کے ساتھ باقی رہے گی، اور یہ دین باقی رہنے کے لئے آیا ہے، اس وقت یہودیت، عیسائیت، ہندوازم، بودھ ازم، یہ تمام ادیان و مذاہب نہ صرف بدل گئے بلکہ ان کی اصل شکل ایسی بگڑ گئی کہ ان کو پہچاننا ناممکن ہوگیا ہے، پھر ان مذاہب وادیان میں طویل عرصہ سے اصلاح وتجدید کی کوئی تحریک بھی نہیں اٹھی ہے، اسی وجہ سے یہ سب مٹ گئے۔ صرف اسلام اپنی اصل شکل میں روح کے ساتھ باقی ہے، عائد سے لے کر فرائض تک، سنن سے لے کر مستجاب تک، اخلاق سے لے کر معاملت اور تہذیب تک سب باقی ہے قرآن باقی ہے اور اس کی زبان باقی ہے۔ اس کے ایک ایک حرف بلکہ حرکات وسکنات تک باقی ہیں، اس کی بنیادی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بقاء کی ذمہ داری لی ہے اور فرمایا کہ اسلام ایک مکمل اور پسندیدہ دین ہے ''ان الدين عند الاسلام'' اور ''اليوم اكملت لكم دينكم و اتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم اسلام دينا'' (دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے (آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مجددین اور مصلحین کا تسلسل ہے جو اس امت کی تاریخ میں کبھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ یہ واحد دین ہے جس میں کوئی صدی اور کوئی ملک خالی نہیں رہا اگرچہ اس کا کا پورا استیعاب نہیں کیا گیا لیکن ہندوستان کی حد تک استیعاب سے کام لیا گیا ہے ہماری کتاب دعوت عزیمت میں دوسرے ملکوں کے مجددین کا بھی زکر ہے۔

اسی مادر علمی سے رشتہ نہ ٹوٹے۔

آخر میں آپ سے کہوں گا کہ اپنے ادارے سے تعلق رکھئے، بہت سے لوگ ہیں جو فارغ ہونے کے بعد یہاں آئے بھی نہیں، اسکا منہ نہیں دیکھا اور نہ معلوم کیا اس پر کیا گزری اور کیا گزر رہی ہے، اس کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ اپنا مطالعہ جاری رکھئے کہ علم کا سفر کبھی ختم نہیں ہوگا علم برابر تازہ ہوتا رہتا ہے، اس میں ترقی بھی ہے، تغیر بھی ہے، پھیلاؤ بھی ہے، یہاں کے ترجمان ''البعث'' ''الرائد'' اور تعمیر حیات کا مطالعہ کیجئے، دارالمصنفین اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام نے ماشاء اللہ اچھا خاصا لٹریچر تیار کردیا ہے، آپ اس کو پڑھیں اور فائدہ

اٹھائیں۔ندوۃ العلماء کے قیام میں وقت اور نبض شناسی اور ملت کی حاجت جیسے محرکات شامل ہیں، یہی محرکات تھے جنہوں نے عالم ربانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کے دل میں تحریک پیدا کی، چونکہ وہ عیسائیت کے رد میں مناظرے بھی کرتے تھے۔اس سے اندازہ ہوا کہ انگریزی زبان سے اور انگریزی مصنفین کے اسالیب سے واقفیت ضروری ہے۔چونکہ مستشرقین ایک خاص مقصد کیلئے کام کرر ہے ہیں اور بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کرر ہے ہیں، اس لئے کہ وہی طبقہ اقتدار میں آتا ہے۔ بلاد عربیہ میں اس وقت وہی طبقہ برسر اقتدار ہے جو یورپ امریکہ کا تعلیم یافتہ ہے اس لئے ایسی صورت میں ہمیں اس کی خاص طور پر تیاری کرنی ہوگی کہ ایسا لٹریچر تیار کریں جو تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں کو متاثر کرے اور اسلام کی ہر دور میں انسانی قیادت کی صلاحیت پر ایمان ان کے دل ودماغ میں راسخ کرے،اس طبقہ کو مطمئن کرنے کی تیاری بھی آپ کے ذمہ ہے حالات اور رجحانات کا برابر محاسبہ کرتے رہنا بھی ندوی فصلاء کی ذمہ داری ہے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ طبقہ کون سی زبان سمجھتا ہے،کون سے دلائل اس کے سامنے پیش کرنے چاہئیں کس اسلوب میں اس سے گفتگو کرنی چاہئے،اس مجلس میں جن عزیزوں نے اپنے تاثرات مقالے عربی اور اردو میں پیش کئے اور تقریریں کی گئیں وہ ہماری توقع سے بڑھ کر تھیں،امید ہے کہ یہ استعداد نہ صرف قائم رہے گی بلکہ مزید ترقی کرے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علمائے حق نے وراثت نبوت کا حق کس طرح ادا کیا؟؟

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نو من به و نتو كل عليه و نعوذ بالله من شرر انفسنا و من سيأت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضل الله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله وحد ه لاشريک له و نشهد ان سيد نا ومولانا محمداً عبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و علىٰ آله واصحابه اجمعين اما بعد .

دین خالص

علمائے حق حضرات انبیاء علیہ الصلاۃ والسلام کے وارث وجانشین ہیں "العلماء ورثة الانبیا" اس کی وارثت اور نیابت اسی وقت صحیح اور مکمل ہوگی جب ان کے زندگی کا مقصد، اور ان کی کوششوں کا مرکز وہی ہوگا جو انبیا کرام کا تھا۔ وہ مقصد زندگی اور وہ مرکز سعی وعمل کیا ہے دو لفظوں میں "دین خالص" یا ایک لفظ میں "توحید" یعنی اللہ کی خالص عبادت اور کامل اطاعت جو تنہا اسی کا حق ہے اس کو اپنی ذات سے عمل میں لانا، اور دوسروں میں اس کیلئے جدوجہد کرنا۔

"الالله الدين الخالص" ويكون الدين لله"

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی اليه انه لااله انا فاعبدون

(انبیاء رکوع ۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ میرے سوا کسی کو بندگی نہیں، پس میری ہی بندگی کرو۔

دین خالص سے نفرت

دین الٰہی سے انحراف کا ایک عام سبب غفلت ہے اللہ سے بے تعلقی اور اس کے احکام وفرائض سے بے توجہی کا سبب ہمیشہ بغاوت وکفری ہی نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات دنیا پرستی اور مادیت ہوتی ہے عزت وجاہ کا سودا، دولت کا عشق اور معاش میں سرتاپا انہماک آدمی کا مادہ سے بالکل غافل کردیتا ہے مادیت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ سرے سے نجات کا خیال، رضائے الٰہی

کے حصول کا شوق اوراس کے عذاب کا خوف دل سے بالکل نکل جاتا ہے، اور کھانے پینے او ر پہننے کے سوا دنیا میں کوئی فکر باقی نہیں رہتی، خدا سے غافل لوگوں کی صحبت اور گناہوں اور عیش میں انہماک دل کو ایسا مردہ کر دیتا ہے کہ دینی اور اخلاقی حس باطل ہو جاتی ہے، نیک وبد اور حلال وحرام کی تمیز جاتی رہتی ہے، ایسے غافل اپنے اخلاق واعمال، سیرت وکردار، معاشرت وآداب، اور وضع صورت میں کافروں اور اللہ کے باغیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہتے۔ شراب کے بے تکلف دور چلتے ہیں، منہیات ومحرمات کا آزادی کے ساتھ ارتکاب کیا جاتا ہے۔ جرائم اور فسق وفجور میں نئی نئی ایجادات کی جاتی ہیں اوران میں ایسی ذہانت اور ہنر مندی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ پرانی امتیں ان کے سامنے مات ہو جاتی ہیں۔ شرع ودین کی کوئی حرمت باقی نہیں رہتی، ایسے خدا فراموشی اور خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے کہ بھول کر بھی خدا یاد نہیں آتا اور اپنا بھی حقیقی ہوش نہیں رہتا۔

ولاتکونو کالذین نسواللہ فأنساھم"

ان لوگوں کی طرح نہ ہو، جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، اللہ نے ان کو خود فراموش بنا دیا

(حشر ع۔۲)

یہی وہ لوگ ہیں جن کا حال اللہ نے اس آیت میں بیان کیا ہے۔

ان الذین لایرجون لقاء انا ورضوابالحیوۃ الدنیا و اطمانوا بھا والذین ھم عن آیاتنا غافلون (یونس ع۔۱)

بے شک جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی میں مگن اور مطمئن ہیں جو لوگ ہمارے نشانیوں سے غافل ہیں۔

نتیجۃً وعملاً ایسے غفلت شعار اور آخرت فراموش، منکرین آخرت اور اللہ ورسول سے بغاوت کرنے والوں سے ممتاز نہیں ہوتے، پیغمبروں کی دعوت کے لئے بھی ان کا وجود بھی اسی قدر بے سود اور بعض اوقات سنگ راہ ہوتا ہے جس طرح مکذبین ومنکرین اور بعض اوقات یہ مدعیان اسلام، اسلام کے خلاف حجت اور تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ پھر اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہوتی ہے کہ یہ غافلین، یا منافقین اپنی کثرت یا دنیاوی لیاقت کو یا کوششوں یا محض وراثت سے مسلمانوں کی سند حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں، اور مسلمانوں کی امامت ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے یا مسلمانوں کی زندگی میں اتنا اثر و

رسوخ پیدا کر لیتے ہیں کہ ان کے اخلاق و اعمال عوام کیلئے نمونہ بن جاتے ہیں، اور ان کی عظمت اور وقعت دل و دماغ میں جا گزیں ہو جاتی ہے اس وقت ان ''اکابرین مجرمین'' کی وجہ سے غفلت و خدا فراموشی اور غیر اسلامی زندگی کا ایسا دور دورہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی عملداری میں جاہلیت کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اس طرز زندگی کو کچھ زیادہ مدت گزر جاتی ہے، تو اسی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن پڑ جاتا ہے، جس کی مخالفت غیر اسلامی تمدن سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

علماء کی اصل ذمہ داریاں

ان تمام حالات میں پیغمبروں کے جانشینوں کو کام کرنا پڑتا ہے، شاید انسانوں کی کوئی جماعت اتنی مشغول، اور فرائض و ذمہ داریوں سے اتنی گراں بار نہیں، جتنی نائبان رسولؐ اور علماء و مصلحین اسلام کی جماعت ہے، جسمانی امراض کی طبیبوں کو بھی آرام اور فرصت کا موقع میسر آ جاتا ہوگا، لیکن ان اطباء روح کے لئے کوئی موسم اعتدال و صحت کا نہیں، بہت سی جماعتیں ایسی ہیں کہ جب ان کی اپنی حکومت قائم ہو جاتی ہیں، تو ان کی جدو جہد ختم ہو جاتی ہے اور ان کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن علماء حق اور ''قوامین لله شهد آء بالقسط'' (اللہ کی طرف سے منظّم اور انصاف کے گواہ) جماعت کا کام بعض مرتبہ مسلمانوں کی حکومت میں ختم ہونے کے بجائے کچھ بڑھ ہی جاتا ہے، کچھ چیزیں ہیں جو حکومت و طاقت اور دولت و فراغت ہی کے زمانہ میں پیدا ہوتی ہیں، اور علماء اسلام ہی کا فرض ہوتا ہے کہ ان کی نگرانی کریں، وہ اپنے فریضہ احتساب، نگرانی، اخلاق اور دینی رہنما کا منصب سے سبکدوش نہیں ہوتے، اس وقت بھی ان کا جہاد اور ان کی جدو جہد جاری رہتی ہے کہیں مسلمانوں کی مسرفانہ زندگی پر روک ٹوک کر رہے ہیں، کہیں سامان عیش و غفلت پر ان کی طرف سے قدغن ہے کہیں چوری کی شراب کو گرفتار کیا ہے، اور اس کو انڈیل رہے ہیں، کہیں باجوں اور موسیقی کے آلات کو توڑ رہے ہیں، کہیں مردوں کیلئے ریشم کے لباس اور سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال پر چیں بجبیں ہیں، کہیں حجابی اور مردوں و عورتوں کے آزادانہ اختلاط پر معترض ہیں، کہیں حماموں کی بے قاعدگیوں اور بد اخلاقیوں کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں کہیں غیر مسلموں اور عجمیوں کے عادات اور خصوصیات اختیار کرنے پر ان کی طرف سے مخالفت ہے، کبھی مسجدوں کے صحن اور مدرسوں کے

ایوانوں میں حدیث کا درس دے رہے ہیں، اور ''قال اللہ اور قال الرسول'' کی صدا بلند کر رہے ہیں، کبھی خانقاہوں میں یا اپنے گھروں یا مسجدوں میں بیٹھے ہوئے دلوں کا زنگ دور کر رہے ہیں، اللہ کی محبت وطاعت کا شوق پیدا کر رہے ہیں، امراض قلب حسد، تکبر، حرص دنیا اور دوسری نفسانی اور روحانی امراض کا علاج کر رہے ہیں، کبھی منبر پر کھڑے ہوئے جہاد کا شوق دلا رہے ہیں، اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت یا اسلامی فتوحات کے لئے آمادہ کر رہے ہیں، پوری اسلامی تاریخ میں آپ کو زندہ اور ربانی علماء، جو حکومت وقت کے دامن سے وابستہ نہیں تھے یا حقیر جھگڑوں میں مشغول نہیں تھے، انھیں مشاغل میں منہمک نظر آئیں گے اور مسلمانوں کا کوئی دور حکومت ان علمائے حق اور ان کی جدوجہد سے خالی نہیں رہا۔

ایک لمحۂ فکریہ

بنی امیہ کا دور مسلمانوں کا شاہانہ عہد ہے، بظاہر مسلمانوں کو تمام کاموں سے فرصت ہوگئی ہے، مگر علماء کو فرصت نہیں، حضرت حسن بصریؒ کی مجلس وعظ گرم ہے، جس میں اپنے زمانہ کے منکرات وبدعات کے خلاف تقریر ہو رہی ہے، اپنے زمانہ کی معاشرت، نظام اور اہل حکومت کی بے دینی پر تنقید ہے، نفاق کی علامات، اور منافقین کے اوصاف وسیع پیرایہ میں بیان ہو رہے ہیں اور موجودہ زندگی پر ان کو منطبق کیا جا رہا ہے، خشیت الٰہی اور آخرت کا بیان ہے، جس سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئی ہیں اور روتے روتے حاضرین کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں، سورۂ فرقان کے آخری رکوع ''وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا'' کی تفسیر ہو رہی ہے اور صحابۂ کرامؓ کے چشم دید حالات اور واقعات اس طرح بیان کئے جا رہے ہیں کہ اس مبارک دور کی تصویر کھنچ گئی ہے اور صحابہؓ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں، لوگ مجلس سے توبہ کر کے اٹھتے ہیں، اور سینکڑوں آدمیوں کی اصلاح حال ہو رہی ہے۔

بنی عباس کا دور ہے اور امام احمد بن حنبلؒ شاہ وقت کے ذوق ورجحان اور مسلک کے خلاف مذہب اعتزال کی صاف صاف تردید کر رہے ہیں اور بدعات کا رد، اور سنت کا اعلان کرتے ہیں، علم کلام اور فلسفہ کے بڑھتے ہوئے رجحان کے مقابلہ میں، خالص سنت اور عقائد سلف کی تبلیغ فرما رہے ہیں اور یہ سب اس جرأت واطمینان کے ساتھ کہ گویا مامون ومعتصم کی

حکومت نہیں ہے بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت ہے۔

بغداد، اپنے اوج پر، اور بغداد کی تہذیب، دولت اور بے فکری اور آزادی عروج پر ہے، ہر طرف عیش و غفلت کا سمندر رواں ہے، کرخ اور رصافہ کے میدانوں اور مسجدوں کے سامنے میلے لگے ہوئے ہیں، بازاروں میں بڑی چہل پہل ہے، لیکن سینکڑوں آدمی، ان تمام دل چسپیوں اور تفریحات سے آنکھ بند کئے ایک طرف چلے آ رہے ہیں، آج جمعہ کا دن ہے، محدث ابن جوزیؒ کا وعظ ہے، وعظ ہو رہا ہے، سینکڑوں آدمی تائب اور بیسیوں غیر مسلم مسلمان ہو رہے ہیں، لوگ خلاف شرع امور سے توبہ کر رہے ہیں۔

ایک طرف اسی پر شور اور ہنگامہ زدہ بغداد میں نہایت سکون واطمینان کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا درس، وعظ اور روحانی فیض جاری ہے، جس سے عرب و عجم کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، بڑے بڑے امراء، اور شہزادے اپنے عیش و دولت کو خیر باد کہہ کر زہد و فقر کی زندگی اختیار کرتے ہیں، بڑے بڑے سرکش اور نشۂ دولت میں مخمور تائب ہوتے ہیں، خلافت عباسی کے عین دارالخلافہ میں، اور خلیفہ بغداد کی حکومت کے بالکل مقابل اس درویش کی روحانی اور دینی حکومت قائم ہے، جس کا سکہ عرب و عجم پر رواں ہے۔

بعد کے تمام عہدوں میں اور حکومت اسلامی کے تمام اطراف واکناف میں، سلاطین و امراء کے بالمقابل اور تمام دوسری دلچسپیوں دعوتوں اور تحریکوں اور مشاغل کے ساتھ علمائے حق کی یہ کوششیں اور ان کے مرکز، مساجد، مدارس، خانقاہیں، مجالس وعظ باضابطہ اور بے ضابطہ احتساب جاری رہا۔

علمائے حق کا یہی بدقسمت یا خوش قسمت گروہ ہے، جس کو مسلمان بادشاہوں اور ان کے کارکنان حکومت کے ہاتھوں (جبکہ دوسروں کو سیم وزر کی تھیلیاں اور عہدوں کے پروانے ملتے تھے) دارورسن اور تازیانے کے انعامات ملے، اسی گروہ کے کتنے افراد کو، ایک مسلم، ان حاکم (حجاج) کے ہاتھوں شہادت کا سرخ، خلعت ملا، پھر اسی گروہ کے ایک مقتدر فرد (حضرت امام ابو حنیفہؒ) کو امیر المومنین منصور عباسی کے ہاتھوں زہر کا جام نوش کرنا پڑا، پھر اسی گروہ کے دوسرے امام (حضرت امام احمد بن حنبلؒ) کو سب سے بڑے روشن خیال مسلمان بادشاہ (مامون) کے زمانہ میں، پابہ جولان اور اسیر زندان ہونا پڑا، اور اس کے جانشین (معتصم) کے ہاتھوں

تازیانے کھانے پڑے۔

آخر زمانہ میں بھی کیسے کیسے عادل وداد گر مسلمان فرمانرواؤں کے ہاتھوں کیسے کیسے جلیل القدر علماء پر بیداد ہوئی، جہانگیر کی زنجیر عدل مشہور ہے، مگر حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے پاؤں میں بھی زنجیر پڑی، اوران کو اپنے اظہار حق کے صلہ میں گوالیار کے قلعہ میں محبوس ہونا پڑا۔

ان کارناموں اور خدمات کے علاوہ (جو حاملین دین اور محافظین شریعت کے فرائض منصبی ہیں) جن کو ہم اس حیثیت سے دفاعی کہہ سکتے ہیں، کہ وہ شرک وکفر، بدعت اور غفلت کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت کی کوششیں ہیں، اور دین کی مسلسل جدوجہد ہے، جو قیامت تک جاری رہے گی۔

لایزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لایضر هم من خذلهم(او کمال قالَ) الجهاد ماض الی یوم القیامة، میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر اعلانیہ قائم رہے گا، کسی کے مدد نہ کرنے سے اس کو کچھ نقصان نہ پہونچے گا، جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔

لیکن ان کے علاوہ دو اور خدمتیں ہیں، جو ہر زمانہ کے علماء کے ذمہ ہیں، اور علماء ربانی ان کو انجام دیتے رہے ہیں۔

ا۔اسلام فتوحات سے کمتر اور مبلغین، صلحاء وصوفیہ اور بعض مسلمانوں کے خلاف اور محبت کے اثر سے بیشتر مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک میں لاکھوں آدمیوں نے اسلام قبول کیا اور پوری پوری برادریاں اور بڑے بڑے خاندان اسلام میں داخل ہو گئے، لیکن ان کی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہ کیا جا سکا، اوران پر اسلام کی تعلیمات کا کوئی اثر نہ پڑ سکا، یا ان پر کوئی اثر پڑا تو ان کے بعد کی نسلوں میں یہ اثر باقی نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ اس کے سوا ان کو کچھ یاد نہ رہا کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے اور انھوں نے کس زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا، اور سوائے اسلامی نام اور کلمہ طیبہ کے الفاظ کے ان کے پاس اسلام کا کوئی نشان باقی نہ رہا، کچھ دنوں کی اور بے توجہی کے بعد اسلامی نام بھی باقی نہ رہا اور کلمہ طیبہ بھی سینکڑوں میں سے چند کے سوا کسی کو یاد نہ رہا، مگر اپنے مسلمانوں ہونے کا اعتراف باقی رہا، پھر وہ بھی مٹنے لگا اور اس وقت با قاعدہ ان کا ارتداد عمل

میں آنے لگا۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں خاص حلقہ کے باہر اسلام کی بنیادی ہمیشہ کمزور رہی اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، تقریباً ہر بڑے شہر سے کچھ فاصلہ پر اور ہندوستان کے تمام اطراف میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی مسلمان قومیں اور برادریاں موجود ہیں، جن کو اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہا، دیہاتوں کی بڑی مسلمان آبادی ایسی ہے، جو نئے سرے سے تبلیغ اسلام کی محتاج ہے، ان میں سے بکثرت ایسے "مسلمان" ہیں، جو ہنوز عہد جاہلیت میں ہیں، اور ان کی بعثت نبویؐ کی خبر بھی نہیں، وہ اسلام سے اتنے بے خبر ہیں، جتنے دیہاتوں کے غیر مسلمان، فرائض واحکام اسلام کا ذکر چھوڑ کر بعض بڑے شہروں کے اطراف وانواح میں ایسے مسلمان ملتے ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے بھی واقف نہیں۔

بعض علمائے ربانی نے اپنے زمانہ میں، ان علاقوں اور دیہاتی رقبوں کی طرف توجہ کی اور بعض مسلمان قوموں اور برادریوں کو از سر نو مسلمان بنایا، ان میں تبلیغی دورے کئے، وعظ ونصیحت، اختلاط، آمد ورفت اور اپنے اخلاق وتالیف قلب سے ان کے دل مٹھی میں لئے، ان کو مرید کر کے ان کی توحید اور اتباع سنت کے راستہ پر لگایا، شرک وبدعت سے تائب کیا، جاہلانہ رسمیں، غیر مسلموں کی وضع وصورت اور کفرو جاہلیت کے شعار چھڑائے، ان میں اخلاق وانسانیت پیدا کی، پابند فرائض اور خوش اوقات بنایا، علم کا شوق دلایا، اور تعلیم کو رائج کیا اور ان میں سے لائق افراد کو چھانٹ کر اور اپنے پاس رکھ کر ان کی تربیت وتعلیم دی، پھر ان سے اپنی قوم اور دوسری جماعتوں کی تبلیغ واصلاح کا کام لیا، یہ تبلیغی کام، جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا طریق کار سے، سب سے زیادہ ظاہری مشابہت رکھتے ہیں، ان کے دوسرے کارناموں کے مقابلہ میں کسی طرح کم اہم نہیں۔

۲۔ قرآن وحدیث اسلام کی طاقت کا اصلی سرچشمہ ہیں، جن سے ہمیشہ طاقت اور روشنی حاصل کی جاسکتی ہے اور جن کے ذریعہ سے ہر زمانہ میں مسلمانوں کے کمزور سے کمزور ڈھانچہ میں روح پھونکی جاسکتی ہے، شرک وکفر بدعت وغفلت کے خلاف سب سے کارگر حربہ، قرآن وحدیث کا علم اور ان کی اشاعت ہے، ان کا صحیح علم اور ان کی روشنی جس قدر پھیلتی جائے گی، کفرو جہالت کی تاریکیاں دور ہوتی جائیں گی، اس لئے ہزار تبلیغوں کی ایک تبلیغ ان کی نشر واشاعت ہے۔

جانشین انبیاء کی خصوصیات

انبیاء کرام کی بڑی خصوصیت ان کی ہم آہنگی اور یک آہنگی ہے، یعنی وہ سب ایک بات کہتے ہیں، اور ایک ہی بات کہتے رہتے ہیں، وہ کیا؟ یا قوم اعبدو اللہ مالکم من الہٍ غیرہ۔

اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو تمہارا معبود، اس کے سوا کوئی نہیں۔

ان کے جانشینوں کی بھی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ ان کی تمام کوششوں اور ان کی زندگی کے متنوع مشاغل کا ہدف بھی ایک ہوتا ہے وہ ''دعوت الی اللہ'' ہے درس وتدریس وعظ وتقریر تبلیغ وتذکیر، تصنیف وتالیف، سلوک وتصوف، بیعت وارشاد، سب سے، غرض خلق خدا کو اللہ کی طرف بلانا، اللہ سے ملانا، اور اللہ ہی کا بنانا ہوتا ہے، ان کے مشاغل متنوع اور مختلف ہو سکتے ہیں، مگر سب کا مرکز اور مقصد ایک ہوتا ہے، وہ سب کچھ کہتے ہیں مگر درحقیقت ایک ہی بات کہتے ہیں، اور بار بار کہتے ہیں۔

فطرت کا سرود ازلی اس کے شب وروز
آہنگ میں یکتا، صفت سورہ رحمان

حضرت نوحؑ کی طرح وہ بھی ان مشاغل، اور مختلف طریق تبلیغ کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں

'' رب انی دعوت قومی لیلاً ونھاراً۔''

اے رب میں بلاتا رہا اپنی قوم کو، رات اور دن

ثم انی دعوتھم جھاراً

پھر میں نے ان کو بلایا برملا۔

ثم انی اعلنت لھم واسررت لھم اسراراً

پھر میں نے ان کو کھول کر اور چھپ کر کہا، چپکے سے۔

یہ وعظ، یہ درس اور انفرادی واجتماعی کوششیں، یہ ظاہر ومخفی تدبیریں، یہ تذکیر وتزکیہ اور یہ توجہالت اور انفاس قدسیہ (سب دین کی دعوت وتبلیغ کے) اعلان واسرار ہی کی شکلیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو اپنے دین سے لگائے رکھے اس پر آپ سے اجازت چاہوں گا!

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

علمائے دین کا منصب
استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تقریری مجلس علمی (حیدرآباد) کی اس نشست میں فرمائی تھی جو ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۲ کو جمیل الدین صاحب ایڈوکیٹ کے دولت خانہ پر شب میں ہوئی تھی، اور جس میں بڑی تعداد میں حیدرآباد کے علمائے کرام، فضلائے مدارس اور دینی اداروں اور تنظیموں کے سربراہ تشریف رکھتے تھے۔

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ سيد المرسلين محمد وعلىٰ اله وصحبه اجمعين اعوذ بالله من الشيطن الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم يآايها الذين امنور كونوا قوآمين لله شهدآء بالقسط
(المائدہ۔۸)

اے ایمان والو! کھڑے ہوجایا کرو، اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔

حضرات! علمائے کرام کی اس موقر مجلس میں کچھ عرض کرنا بڑی ذمہ داری کی بات ہے، پرانا حکیمانہ مقولہ ہے، ''لکل مقام مقال'' میں کوشش کروں گا کہ اس اہم اور باوقار مجلس اور موقع محل کے مطابق اپنے معروضات وخیالات پیش کروں۔

لوگوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں اس میں شیخ سعدیؒ خاص طور پر بڑے ممتاز ہیں اسی طریقہ سے مولانا رومؒ مثالوں کے بادشاہ ہیں، دونوں روزہ مرہ کے واقعات سے بڑی حکیمانہ باتیں اور بڑے عمیق نتائج نکالتے ہیں، میں اپنا بھی اسی قسم کا ایک تاثر اور عبرت کا سبق پیش کرتا ہو، آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک طویل سفر کر رہا ہوں دہلی سے چلا اور حیدرآباد پہونچا، خدا جانے گاڑی نے کیا کیا رخ بدلے، کن کن علاقوں سے گزری لیکن قبلہ نما نے ہمیشہ صحیح قبلہ بتایا، اس نے نہ گاڑی کے پھرنے کی پرواہ کی، نہ سمت کے تبدیل ہونے کی، مجھے بڑا رشک آیا کہ ایک ادنیٰ سا جماداتی چیز جو انسان کی صنعت ہے، وہ اتنی امین، ایسی ثابت قدم، ایسی خوددار، اور ایسی پابند اصول ہے، کہ اس نے نہ یہ دیکھا کہ گاڑی کس طرح رخ بدل رہی ہے، نہ یہ کہ انسان (جو اشرف المخلوقات ہے)

برابر اپنا رخ بدلتا ہے ہر جگہ اس نے صحیح طور پر قبلہ بتایا اور ہم نے اس پر اعتماد کیا اور نماز پڑھی اس سے مجھے غیرت بھی آئی اور عبرت بھی ہوئی کہ قبلہ نما تو کسی کی پروانہ کرے، اور ہمیشہ سمت قبلہ بتائے اس نے اپنا مقصد وجود تبدیل نہیں کیا اور نہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں فرق آنے دیا اس سے مجھے خیال ہوا کہ علمائے دین کو حقیقت میں ''قبلہ نما'' ہونا چاہئے، ان کے اندر قبلہ نما کی سی استقامت ہونی چاہئے کسی طرف کی ہوا چلے اور کہنے والے کتنا ہی کہیں کہ۔

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور سمجھانے والے کتنا ہی سمجھائیں۔

زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بہ ساز

لیکن ان کا عقیدہ اقبال (جو خود اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ اور مفکر و فلسفی اور پھر شاعر تھے) کی اس تعلیم پر ہو۔

حدیث کم نظراں تو باز مانہ بساز
زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں

علماء امت کی شان

گفتند جہان ما آیا بتومی سازد
فتم کی نمی سازد گفتند کی برہم زن

حضرات: علماء کی شان یہی ہونی چاہئے امت مسلمہ، امتوں میں، اور جماعت علماء حاملین علم میں الگ شان رکھتے ہیں، امت مسلمہ کو ایک قبلہ دیا گیا ہے، وہ جہاں کہیں ہو اسی قبلہ کی طرف اپنا رخ کرے، جس امت کو ایک معین قبلہ دیا ہے اس کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ تمہارے دلوں کا قبلہ تمہارا قبلہ حاجات، تمہاری فکر اور سعی و جہد کا محور ایک ہی ہونا چاہئے، نمازوں میں خانہ کعبہ اور اعمال و مساعی و مقاصد میں اللہ تعالیٰ کی (جو معبود و مقصود حقیقی ہے) رضا، آپ حضرات خدا کے فضل سے نہ صرف اہل علم ہیں، بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دینی

قیادت کا مقام عطا فرمایا ہے، خاص طور سے یہ مؤقر مجلس علمی جہاں اس وقت ہم جمع ہیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دو اہم حقیقتوں کے بارے میں اجمالی طور پر کچھ عرض کروں گا۔

ایک تو عقائد اور حدود شرعیہ کا مسئلہ ہے، اس میں جماعت علماء کو بالکل قطب نما کی طرح ہونا چاہئے، کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی اس کو سامنے رکھے گا تو وہ اس کی رعایت نہیں کرے گا وہ صحیح سمت بتائے گا، جہاں تک عقائد اور حدود شریعہ کا تعلق ہے، دین میں کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں، حکمت اور چیز ہے، مداہنت اور چیز، حکمت اور مداہنت میں بڑا فرق ہے، ہاں آدمی سچی اور صاف بات حکمت کے ساتھ کہہ سکتا ہے، اس کا اسلوب حکیمانہ ہو۔ ''ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة'' لیکن، منت نہ ہو، قرآن شریف میں آتا ہے'' ودوا لو تدهن فيدهنون۔

اللہ کے رسول کو صاف حکم ہے'' فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین'' یہ ''اعرض عن المشرکین'' کا تکملہ ''صدع بالامر'' کا محل متعین کردیتا ہے، جہاں پر توحید اور شرک کی سرحدیں آتی ہوں، وہاں ''فاصدع بما تومر پر عمل کا حکم ہے، نرمی اور وسعت، کسی اور چیز میں ہو تو ہو، لیکن توحید وسنت کے بارے میں منصوصات، شریعہ اور قطعیات، دینیہ کے بارے میں ''فاصدع بما تؤمر'' کا حکم ہے، اگر'' فاصدع بما لومر'' مطلق آتا تو اس میں کچھ گنجائش تھی، لیکن ''واعرض عن المشرکین'' نے بالکل تفسیر کردی کہ اس کا موقع ومحل کیا ہے، علماء حقائق کا فرض ہے کہ توحید کے بارے میں بالکل بے لوث اور صاف بات کہیں لیکن حکمت کے ساتھ کہیں،، بقول غالب ایسا نہ ہو۔

کہتے ہیں وہ بھلے کہ ولیکن بری طرح

شروع ہو تو علماء شروع میں اچھی سے اچھی نرم سے نرم زبان استعمال کریں، تدریج وحکمت سے کام لیں لیکن اس طرح کہ تاویل اور غلط فہمی کی گنجائش نہ ہو اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے، کہ آج تک یہ دین قائم ہے، اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہے، جس کی ہلاکت کا شوق ہے وہ شوق سے ہلاکت میں پڑے، لیکن وہ شریعت اور شریعت کے حاملین الزام نہیں دے سکتا، تاریخ کا اگر عمیق ووسیع نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امت کی تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا کہ یہ امت عمومی طور پر کسی ضلالت کا شکار ہوگئی ہو جو مقامی طور پر

ضلالتیں رہی ہیں لیکن پوری امت مسلمہ کسی سازش یا کسی عالمگیر ضلالت میں گرفتار نہیں ہوئی اورخود حدیث میں آیا ہے" لا تجتمع امتی علیٰ ضلالة "اس کے برعکس یہودیت بالکل شروع میں تحریف کا شکار ہوگئی، اورعیسائیت بالکل عہد طفلی اورآغاز کار میں ایک بالکل نئی پٹری پر پڑ گئی جس پر وہ صدیوں سے چلتی آرہی ہے، اسی لئے قرآن مجید نصاریٰ کو"ضآلین" کے لفظ سے یاد کرتا ہے کہ وہ جیسے ہی چلے دوسرے راستہ پر پڑ گئے، لیکن الحمد للہ اسلام اس سے بالکل محفوظ ہے، اس وقت تک توحید وشرک کا فرق سنت وبدعت کا فرق اسلام اور جاہلیت کا فرق، غیر مسلمین کی معاشرت وتمدن اور اسلامی معاشرت وتمدن کا فرق بالکل واضح ہے، کوئی ملک کسی وجہ سے کسی خاص زمانہ میں کسی خارجی یا داخلی سبب کی بناء پر کسی سازش کا شکار نہ ہو جائے یا کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائے یہ الگ بات ہے علماء حق اس صورت حال سے بھی نبرد آزما اور اس کے مقابلہ میں صف آراء رہتے ہیں اور اصلاح حال کی کوشش جاری رہی ہے۔

امت مسلمہ کا فرض

پوری امت مسلمہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔" یآیھا الذین امنو کونوا قومین لله شھدآء بالقسط "(یعنی تم اللہ کے لئے حق کے علمبردار بن جاؤ) ہماری زبان اور محاورے میں "خدائی فوجدار" ایک طنز کا لفظ ہے کہ آپ خدائی فوجدار ہیں؟ لیکن "قوامین للہ" کا مفہوم تقریباً خدائی فوجداری کا ہے، مبالغہ کے اس صیغہ (قوامین) سے "خدائی فوجدار" ہی کی شان ظاہر ہوتی ہے اگر قوامین للہ ہوتا تو شاید یہ بات نہ پیدا ہوتی کوئی پوچھے نہ پوچھے، کوئی بلائے نہ بلائے، کوئی کہے نہ کہے آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، آپ ہر جگہ پہنچ رہے ہیں، اس آیت میں خطاب اگر چہ پوری امت کو ہے، لیکن علماء کی اس بارے میں امتیازی شان ہونی چاہئے، ان کو "شھدآء بالقسط" حق وصداقت کا گواہ وعلم بردار ہونا چاہئے، اگر امت اسلامیہ کا فرض قوام عالم کا احتساب ہے تو علماء اسلام کا فرض مسلم معاشرہ کا احتساب کرتے رہنا چاہئے، کہ کہاں سے یہ معاشرہ صراط مستقیم کو چھوڑا ہے، اس بارے میں ان کا کام بالکل بیرومیٹر کا سا ہے، وہ ہر جگہ، ہر موسم میں ہوا کا دباؤ بتاتا ہے، وہ صحیح شہادت ادا کرتا ہے۔

حضرات! اسی طرح علماء کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو زندگی کے حقائق ملک کے

حالات، ماحول کے تغیرات اور تقاضوں سے باخبر اور روشناس رکھیں، ان کی کوشش رہنی چاہئے کہ مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے، اس لئے کہ اگر دین اور مسلمانوں کا رابطہ زندگی سے کٹ گیا اور وہ خیالی دنیا میں زندگی گزارنے لگے تو پھر دین کی آواز بے اثر ہوگی، اور دعوت واصلاح ہی نہیں ہوگا، بلکہ اس دین کے حاملین کو اس ملک میں رہنا مشکل ہو جائے گا، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں علماء نے سب کچھ کیا، لیکن زندگی کے حقائق سے امت کو روشناس نہیں کیا، اس ماحول میں اپنے فرائض کے انجام دینے کی انھوں نے تلقین نہیں کی، ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اس ملک نے ان کو اس طرح اگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے اور ان کو اگل کر کے باہر پھینک دیا، اس لئے انھوں نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی، آج ہندوستان کے مسلمان ایک دانشمندانہ اور حقیقت پسندانہ دینی قیادت کے محتاج ہیں، آپ مسلمانوں کو سو فیصدی تہجد گزار بنا دیں، سب کو متقی و پرہیزگار بنا دیں لیکن ان کا ماحول سے سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ ملک کدھر جا رہا ہے، ملک ڈوب رہا ہے ملک میں بداخلاقی، طوفان اور وباء کی طرح پھیل رہی ہے، ملک میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہو رہی ہے، تو تاریخ کی شہادت ہے کہ پھر تہجد تو تہجد پانچ وقتوں کی نمازوں کا پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا، اگر آپ نے دین داروں کے لئے اس ماحول میں جگہ نہیں بنائی اور ان کو ملک کا بے لوث مخلص اور شائستہ شہری ثابت نہیں کیا، جو ملک کو بے راہ روی سے بچانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اور ایک بلند کردار پیش کرتا ہے، تو آپ یاد رکھئے کہ عبادات ونوافل اور دین کی علامتیں اور شعائر تو الگ رہے، وہ وقت بھی آ سکتا ہے کہ مسجدوں کا باقی رہنا بھی مشکل ہو جائے گا اگر آپ نے مسلمانوں کو اجنبی بنا کر اور ماحول سے کاٹ کر رکھا، زندگی کے حقائق سے انکی آنکھیں بند رہیں اور ملک میں ہونے والے انقلابات، نئے بننے والے قوانین، علوم کے دل ودماغ پر حکومت کرنے والے رجحانات سے وہ بے خبر رہے تو پھر قیادت تو الگ رہی (جو خیر امت کا فرض منصبی ہے) اپنے وجود کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی، فاتح مصر صحابیؓ رسول حضرت عمرو بن العاصؓ نے جس وقت مصر فتح کیا تو اللہ تعالی نے ان کی بصیرت پر منکشف کیا ہوگا کہ انشاء اللہ مصر سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس اسلام کا حلقہ بگوش رہے گا، مرکز اسلام زمین مقدس حجاز اس کے بالکل قریب ہے، رومی شہنشاہی

وہاں سے بے دخل ہو چکی ہے، قبطی مسیحی سلطنت دم توڑ چکی، لیکن انھوں نے عربوں اور مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا ''انتم فی رباط دائم'' یاد رکھو تم ہمیشہ محاذ جنگ پر ہو، تم ہمیشہ سرحد پر پہرا دے رہے ہو، آنکھ جھپکی اور مارے گئے، ناکے پر کھڑے رہنے والے کو ہر وقت چوکنا اور بیدار رہنا چاہئے، اس کے لئے نہ غفلت کی گنجائش ہے نہ تغافل کی، نہ جہل کی نہ تجاہل عارفانہ کی۔

ملک کو تباہی سے بچانا ہماری ذمہ داری ہے!

حضرات: جس ملک میں اس وقت ہم زندگی گزر رہے ہیں، یہ ملک گردوپیش کے ممالک اور دنیا کی بڑی طاقتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، اس ملک میں بہت سے فلسفے، بہت سی سلبی طاقتیں، بہت سی تخریبی تحریکیں کام کر رہی ہیں اور بہت سرگرم اور فعال ہیں، نظام تعلیم برابر بدلتا رہتا ہے اور کبھی وہ شدت سے عقائد وحقائق دینی پر اثر انداز ہوتا ہے، جبری تعلیم نے اور قومی زبان نے بھی نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، اس حالت میں ہم کو حالات کا برابر جائزہ لیتے رہنا چاہئے، اور اپنے تحفظ کا سامنا کرتا رہنا چاہئے۔

اس کے ساتھ مسلمانوں کو بتانا چاہئے کہ دیکھو اس ملک کو تباہی سے بچانا تمہاری ذمہ داری ہے، تم باایمان، بااصول اور باکردار بن کر یہاں رہو، اگر تم یہاں حضرت یوسفؑ کا نمونہ پیش کرو گے تو پھر وہ وقت آئے گا کہ اہم سے اہم اور نازک سے نازک تر، اور دشوار سے دشوار تر ذمہ داری تمہارے سپرد کی جا سکے گی، حضرت یوسفؑ نے جن کو اللہ تعالیٰ نے حفیظ وعلیم کی صفت عطا فرمائی تھی، دیکھا کہ اس ملک میں اس وقت تک دین کی اشاعت نہ ہو سکے گی اور دین کے لئے مقام پیدا کیا نہ جا سکے گا جب تک وہاں اپنی اہلیت اپنی خیر خواہی انسان دوستی اور عدل کا ثبوت نہ دیں گے، اور اللہ کے بندوں کو اپنا گردیدہ نہ بنالیں گے اس وقت تک اس ملک میں خدائے واحد کا نام لینا بھی مشکل ہوگا، ہم ہندوستانی مسلمانوں کو بھی یہ ثابت کرنا چاہئے کہ ہمارے بغیر یہ ملک چل نہیں سکتا ہم نہ رہے تو یہ ملک تباہ ہو جائے گا۔

میری بھائیوں اور دوستوں! یاد رکھئے، اگر ہم ملک کے حالات سے اپنے کو کاٹ لیں گے اور جو گرم وسرد ہوائیں چل رہی ہیں اس سے بے خبر ہو جائیں گے اور ہم کسی مکیف

(AIRCONDITIONED) مکان میں رہنا شروع کردیں گے، جہاں نہ گرم جھونکا پہنچ سکے نہ سرد، تو ہم اپنے ساتھ بھی بدخواہی کریں گے، اپنے دین کے ساتھ بھی، کوئی فرقہ ملک کی آبادی کا کوئی عنصر باقی عناصر سے کٹ کرنہیں رہ سکتا، ہاں اس کے شرائط اور حدود ہیں آپ ہرگز تحلیل نہ ہوں، آپ اپنے پیغام اور دعوت کے ساتھ رہیں، آپ اپنی تہذیبی ومعاشرتی خصوصیات کے ساتھ رہیں، آپ اپنے ملی تشخص کو پورے طور پر برقرار رکھیں اور اس کے کسی حصہ سے بھی آپ دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوں، لیکن زندگی کے دھارے ے الگ نہ ہوں، میں قومی دھارے کونہیں کہتا (خدانہ کرے کہ اس زندگی میں کبھی میری زبان سے یہ لفظ نکلے کہ قومی قومی دھارے میں جذب ہوجایئے) نہیں زندگی کے دھارے سے آپ الگ نہ ہوں، اس لئے کہ زندگی کے دھارے سے جو الگ ہوا وہ الگ ہی ہوگیا، اس کی جگہ زندہ انسانوں میں نہیں رہتی، میں اسلام کو ایسا محدود اور ناقص نہیں سمجھتا کہ اگر حالات اور زندگی کے مسائل کی طرف توجہ کی جائے تو فرائض چھوٹ جائیں گے، عقائد میں خلل آ جائے گا، ہمارے اسلاف نے شہنشاہی کی اور امپائر بنائے ہیں لیکن ان کی تہجد بھی نہیں چھوٹی، معمولی سنت بھی ترک نہیں ہوئی، حضرت سلمان فارسیؓ کا واقعہ یہ عراق کے گورنر تھے، اور مدائن کے دارالحکومت میں رہتے تھے، ایک مرتبہ کھانے کی کوئی چیز زمین پر گرگئی تو اٹھا کر صاف کر کے کھانے لگے، کسی نے کہا کہ ارے آپ والی ہوکر ایسا کام کرتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ کیا میں اپنے حبیبؐ کی سنت تم جیسے بیوقوف کی خاطر چھوڑ دوں گا،؟ یہ نہیں کہ آگ آئے تو پانی نہیں رہے گا، اور پانی آئے تو آگ بجھ جائے گی، یہ غلط تخیل ہے، آپ پوری عزیمت، شان وتقوی اور کثرت عبادت کے ساتھ اچھے اور کامیاب شہری بن سکتے ہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہی اچھا شہری بن سکتا ہے جو خدا کا صحیح پرستار اور اپنے اصولوں کا پابند ہو آج ہندستان ہی نہیں تقریباً تمام خاص مسلم ممالک اور عرب ممالک کی بھی حالت یہ ہے کہ وہاں بھی یورپ، امریکہ کے گرم جھونکے آرہے ہیں، نئے نئے فتنے پیدا ہورہے ہیں، اسلام اور جاہلیت کی کشمکش برپا ہے، وقت کے نئے نئے تقاضے اور زندگی کے نئے نئے مسائل درپیش ہیں، ان سے آنکھیں بند کرلیں اور یہ کہنا کہ نہیں کچھ نہیں ہورہا ہے، غلط ہے، اس حقیقت پسندی، وسیع النظری اور جامعیت کا ثبوت دینے کا حیدرآباد میں اور بھی اچھا موقع ہے، یہاں تعلیم بھی ہے اور قوت عمل بھی یہاں نئے نئے

ادارے، نئی نئی تنظیمیں اور تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں، لیکن مسلمانوں کو ایک اجتماعی قیادت اور صحیح مشورے کی ضرورت ہے، ایک طرف تو عقائد کے بارے میں، اصول کے بارے میں، شریعت کے منصوصات کے بارے میں پہاڑ کی سی استقامت اور فولاد کی سی صلابت ہو، دوسری طرف پوری دانشمندی، پوری باخبری اور پوری ہمدردی، یہ دونوں چیزیں ہوں گی، تو انشاءاللہ ہم موجودہ حالات سے نہ صرف یہ کہ عہدہ برآ ہو جائیں گے بلکہ مجھے پوری امید ہے کہ قیادت آپ کے پاس خود آئے گی، مسلمانوں میں سیاسی شعور الوعی السیاسی (شہری شعور) الودعی انسانیت دوستی، حقیقت پسندی، ہوش مندی، ملک کے لئے فکرمندی، اس کو بچانے کیلئے خطر پسند اور مہم جوئی کی ضرورت ہے، اس کے لئے آپ خود نمونہ بنیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ نمونہ پیش کریں۔

وصلی اللہ تبارک وتعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

بے مثال استاد...... بے مثال شاگرد

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے شعبہ عربی جامعہ کراچی (پاکستان) کے سیمینار ہال میں اپنے محبوب استاد اور مربی علامہ خلیل عرب بن محمد عرب سے منسوب لائبریری کے قیام کے موقع پر ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو یہ اہم تقریر فرمائی تھی، جس میں انھوں نے اپنے استاد کے احسانات کا تذکرہ بھی کیا تھا، اور ان کے کامیاب طرز تعلیم کا ذکر بھی، اور استاد اور شاگرد کے درمیان کیسا ربط و تعلق ہونا چاہئے، یہ بھی بتایا، اس لئے یہ تقریر اساتذہ اور طلبا دونوں ہی کے لئے بہت مفید ہے لہذا وہ اس تقریر کا ضرور مطالعہ کریں۔

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نو من بہ و نتو کل علیہ و نعوذ باللہ من شرر انفسنا و من سیأت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضل اللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحد ہ لاشریک لہ و نشھد ان سید نا ومولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد .

امابعد، صدر محترم جناب وائس چانسلر جامعہ، سید ہاشم رضا صاحب، خواہر عزیز عطیہ خلیل عرب

استاد اور شاگرد کا تعلق

اساتذہ، طلبہ وطالبات حاضرین کرام، مجھے خوشی ہے اور میں اپنی سعادت اور ایک طرح سے شرافت سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے اس لفظ کی اجازت دی جائے کہ میں ایک ایسی جگہ پر حاضر ہوا ہو، جس کا انتساب میرے محبوب استاد اور مربی علامہ خلیل بن محمد عرب سے ہے۔

یہاں میں مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا، اگرچہ آپ نے مجھے از راہ کرام اپنی میزبانی سے نوازا ہے، لیکن میں اپنے کو مہمان نہیں سمجھتا بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے گھر آیا ہوں اور ایسے خاندان کو سلام کر رہا ہوں اور اس کے ان افراد سے مل رہا ہوں جو میرے جانے پہنچانے ہیں۔

حضرات: اس موقع کا تقاضا ہے اور احسان کے جس بوجھ تلے میں منت و امتنان کے

ساتھ دباہوا ہوں اس کا تقاضا ہے کہ میں کچھ فصل گل کی داستان سناؤں۔

داستان فصل گل خوش می سراید عندلیب
زاغہا آشفتہ تر گفتند این افسانہ را

خوش نصیب طالب علم

وہ بہت خوش نصیب انسان یا طالب علم ہے، جسے ایسا استاد مل جائے جو حقیقی معنوں میں استاد ہو، حقیقی استاد کی بڑی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے طالب علم کو اپنے جیسا بنانے کے لئے حریص اور بے چین ہو اور اس کو خوشی ہو کہ اگر اس کا شاگرد اس کی صرف نیک نامی اور سرخروئی کے باعث نہ ہو بلکہ لوگ اس کا تعارف اس شاگرد کے ذریعہ کرانے لگیں، میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں اس مقام پر فائز ہوں بلکہ میں کہنا چاہتا ہوں کہ جس استاد میں یہ جذبہ نہیں ہے کہ وہ طالب علم کو اپنے جیسا بنادے اور علم کو گھول کر پلادے، جیسے ہم سنا کرتے تھے اپنی مکتبی زندگی میں کہ بھئی،، کیا گھول کر پلا دیا جائے؟ کوئی علم میں گھول کر پلا نہیں سکتا، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سچا استاد، فطری استاد، پیدائشی استاد جسے انگریزی میں BORN TEACHER، یا عربی میں استاد موھوب کہیں گے، وہ ماں کے پیٹ سے استاد ہی پیدا ہوا، اس کا اصل جوہر یہ ہی ہوتا ہے، کہ وہ علم گھول کر پلا دیتا ہے، پھر وہ صرف اپنا علم ہی منتقل نہیں کرتا بلکہ اپنا ذوق بھی منتقل کر دیتا ہے، یہی ایک استاد کی اصل تعریف ہے، ہم علامہ اقبال کے تذکرے میں کبھی اس بات کو نہیں بھول سکتے اور سوانح نگاروں نے کبھی اس کو نظر انداز نہیں کیا کہ اقبال نے جو بھی علمی ترقی کی اور دین سے جو ان کی رغبت یا مناسبت پیدا ہوئی اس میں ان کے استاد میر سید حسن سیالکوٹی کا بڑا حصہ ہے، میں بتانا یہ چاہتا ہوں، کہ وہ عرب صاحب کی طرح ان اساتذہ میں تھے جو گھول کر پلا دیا کرتے تھے، اور علم کو لباس مستعار کی طرح نہیں دے دیا کرتے تھے بلکہ علم کا گوشت پوست اور خون میں جاری کر دیا کرتے تھے، ہاں میں یہ ثابت کر سکتا ہوں، افسوس کہ اس وقت یہاں کوئی اس کا گواہ نہیں، ہماری فاضل بہن اپنی عربی دانی میں خواہ کتنی ہی آگے بڑھ جائیں، انھوں نے اپنے والد ماجد کا وہ زمانہ نہیں دیکھا، جب ان کا ذوق تدریس اپنے عروج شباب پر تھا، غالباً یہ اس وقت پیدا نہیں ہوئی ہوں گی، ہاں ان کے عم محترم حسین بن محمد عرب نے دیکھا ہے،

افسوس ہے کہ اپنی بعض معذوریوں کی بناء پر وہ یہاں موجود نہیں ہیں، مجھے خوشی ہوتی ہے کہ اگر حسین عربی بھی یہاں موجود ہوتے، کل ہی میں ان سے مل کر آیا ہوں، تو عرب صاحب کی تعریف یہی ہے، آپ حضرات کو علم ہے، اور مجھے بھی کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ میری آزمائش کہیئے یا میری خوش قسمتی کہ مجھے ہندوستان سے باہر جانے کا موقع ملا اور ممالک عربیہ تو کف دست کی طرح میرے سامنے رہے، کوئی ادارہ ایسا نہیں جس میں نہ گیا ہوں، مجھے یاد ہے کہ میں نے جب شیخ الازہر مرشد عبدالمجید حلیم جن سے بڑا قابل شخص ابھی تک شیخ الازہر کی مسند پر نہیں آیا، میں قاہرہ میں چند دن رہنے کے بعد ان سے ملا، اور میں نے جامعہ ازہر کے بارے میں کچھ طالب علمانہ تاثرات پیش کئے چونکہ میں بھی مدرسے سے تعلق رکھتا ہوں اور اسی دنیا کا آدمی ہوں تو میں نے ان کے سامنے بلاتکلف اپنے کچھ تاثرات رکھے تو انھوں نے کہا یوں کام نہیں چلے گا، بلکہ آپ قلمبند کر کے دیجئے، تاکہ ہماری مجلس شوری ہے اس میں یہ رکھا جائے، شیخ محمود شلتوت جو بعد میں جامعہ الزہر کے نامور شیخ ہوئے ان سے شیخ الازہر نے کہا کہ شیخ ابوالحسن آپ کو لکھ کر دیں گے، (میرا نام ممالک عربیہ میں شیخ ابوالحسن ندوی ہے) معاف کیجئے میں ہندوستان میں علی میاں کہلاتا ہوں مگر ممالک عربیہ میں اگر آپ کسی سے بات کریں اور میرا کسی سے ذکر کریں تو کبھی نہیں پہچان سکے گا، انھوں نے کہا کہ استاد ابوالحسن آپ کو یادداشت لکھ کر دیں گے، آپ مجلس میں پیش کر دیجئے گا۔

یہ ۱۹۱۵ء کا تذکرہ ہے میں نے اپنے تاثرات قلمبند کئے، اور ان کے سامنے پیش کر دیئے، چند ہی سطریں پڑھیں تھیں کہ ورق پلٹ دیا، اور کہا خیر یہ تو میں بعد میں پڑھ لوں گا، آپ مجھے پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے عربی کہاں پڑھی اور کس سے پڑھی، مجھے بتانا یہ تھا کہ شیخ محمود شلتوت جن کے علم کا شہرہ دنیا بھر میں تھا اور وہ اپنی ذہانت اور وسعت نظر میں ممتاز تھے، میری عربی میں لکھی ہوئی چند سطروں کے بعد وہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور ان کے ذہن پر اتنا بوجھ پڑا گویا وہ بالکل توقع نہیں رکھتے تھے کہ کوئی ہندوستانی اس طرح اپنے خیالات کا اظہار عربی میں کر سکتا ہے، جب ہی انھوں نے کہا کہ یہ میں پڑھ لوں گا پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے عربی کہاں پڑھی اور کس سے پڑھی تو میں نے استاد اور مربی علامہ خلیل عرب کا ذکر کیا اور ان کے طریقہ تعلیم کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے مجھے اس طرح عربی پڑھائی ہے، شیخ شلتوت نے میز پر ہاتھ

مار کر تین بار کہا، ''یہی صحیح ترین طریقہ ہے'' وہ خود بہت بڑے ماہر تعلیم بھی تھے۔

ہر چیز تقدیر الٰہی کے مطابق ہوتی ہے

حضرات: میں اتفاقات کی منطق کا قائل نہیں، نہ ہی یہ کوئی اتفاقی واقعہ تھا، میں سمجھتا ہوں کہ قضاء وقدر کا ایک نظام ہے، اور وہ مربوط ہے، علت ومعلول کا سلسلہ بالکل مربوط ہے، کوئی چیز اس کائنات میں اتفاقی طور پر پیش نہیں آتی '' وکل شیئ خلقناه بقدر وما امرنا الا واحدة کلمح بالبصر '' تو ہر ہر چیز تقدیر الٰہی کے مطابق ہوتی ہے، کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں خواہ وہ خودستائی پر محمول کیا جائے یا اظہار واقعہ پر کسی کو خبر نہ تھی کہ عربی زبان سیکھنے اور پڑھانے کا میرے شفیق بھائی جو والد کے قائم مقام تھے ان کو بھی یہ خبر نہیں تھی کہ اتنا مہتمم بالشان انتظام عربی کے لئے کیوں کیا جارہا ہے، اور اس کی ضرورت کہاں ہے۔

مجھے ہندوستان میں رہنا ہے ہندوستان میں ہی پڑھنا ہے، اور اردو میں کام کرنا ہے، خدا کا شکر ہے کہ میں لکھنو میں ہی رہتا تھا، اور لکھنو گویا میرا گھر ہے تو مجھے اردو میں مہارت حاصل کرنا چاہئے تھی یا انگریزی میں کمال پیدا کرنا چاہئے تھا تاکہ میں یورپ اور امریکہ تک اسلام کی دعوت پہنچا سکوں، یا پھر ہندوستان میں کوئی بڑا مقام حاصل کرسکوں، بس یہ تقدیر کی بات تھی اور یہ ایسا نوشتہ تھا جسے آنکھوں سے پڑھا نہیں جاسکتا، اور ایسے بہت سے نوشتے، نوشتہ تقدیر ہوتے ہیں، جو آنکھوں سے پڑھے نہیں جاتے، میرے بھائی (ڈاکٹر عبدالعلی) کے دل میں اللہ نے یہ بات ڈال دی کہ ہندوستان میں رہ کر عربی کا جو بہتر سے بہتر انتظام ہوسکتا ہو اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے جو بہترین اسباب ہوسکتے ہوں، وہ مہیا کئے جائیں، قدرت نے گویا پہلے ہی سے اس کا فیصلہ کرلیا تھا۔

شیخ خلیل عرب سے ہمارا تعلق

یہ دولت میرے گھر کی تھی اس معنیٰ میں کہ خلیل عرب صاحب ہمارے محلے میں رہتے تھے، اور ان کے والد (شیخ محمد بن حسین) میرے والد (شیخ عبدالحیؒ) کے ادب عربی میں استاد تھے، جبکہ ان کے دادا (شیخ حسین بن محسن الانصاری) میرے والد کے حدیث میں استاد تھے،

شیخ خلیل کے والد شیخ محمد بن حسین کا تعارف کم ہوا ہے جو عربی کے قادر الکلام شاعر تھے اور فن عروض کے تو وہ امام تھے، عربی نثر بھی بے تکلف لکھتے تھے، ان کی نشو ونما اور ان کی جوانی سب بلاد یمن میں گذری تھی، تو وہ اہل زبان تھے، اور صاحب دیوان شاعر بھی، میرے والد نے عربی زبان اور ادب میں ان سے کسب فیض کیا، استفادہ کیا، اور حدیث میں میرے والد نے ان کے دادا شیخ حسین بن محسن انصاری الیمانی سے جن کو سہیل یمانی کہنا چاہئے جو سارے ہندوستان کے بلند پایہ محدثین کے استاد ہیں، نواب صدیق حسن خان کے استاد ہیں، اور ان کے علاوہ جو علماء بھی فن حدیث کے استاد ہے، اور ان کے علاوہ جو علماء بھی فن حدیث میں چوٹی کے علماء اور فن حدیث میں اپنی اپنی جگہ ایک ستون سمجھے جاتے تھے، اور انھیں کے شاگرد ہیں، تو میرے والد حدیث میں نہ صرف ان کے شاگرد بلکہ ممتاز ومحبوب شاگرد سمجھتے جاتے تھے، یہ ہمارے گھر کی دولت تھی میرے بھائی صاحب نے مجھے عرب کے حوالے کر دیا اور عرب صاحب نے ان شرطوں کے ساتھ لیا، جن شرطوں پر استاد اس زمانے میں لیا کرتے تھے، یعنی مجھے اس کے جسم پر اختیار ہوگا، دماغ پر بھی اختیار ہوگا، کوئی حدود نہیں ہوں گی، کہ آج کیوں مارا اور طمانچہ کہاں لگا، چوٹ آئی نہیں آئی، عرب صاحب اس زمانہ کی پیداوار تھے، جب شاگرد کو استاد اپنی محبت سے نوازتے تھے اور تنبیہ وتادیب کا بھی مستحق سمجھتے تھے تو اس طرح سے انھوں نے گویا میرا چارج لیا، میرے بھائی صاحب کا اور ان کا گھر قریب قریب تھا، تو عربی کا الف ب جس کو فعل فعلا فعلوا کہتے ہیں، اور جس سے آج کل آپ میں سے بہت سے لوگ گھبراتے ہوں گے، وہ پہلی مرتبہ میری کاپی پر انھوں نے ماضی کے گردان لکھی اور مجھ سے کہا کہ اسے یاد کرلو۔

ایسا تو بہت ہوتا ہے کہ مختلف اساتذہ سے انتساب ہوتا ہے اور فخر بھی ہوتا، استادوں کو اور طالب علموں کو بھی لیکن میں بڑا خوش نصیب ہوں اور میرے ساتھ یہ استثنائی معاملہ پیش آیا کہ وہ استاد میری عربی کی ابجد سے لے کر الف با کہنا چاہئے یا عربی کی الف ب سے لے کر تائے تمت، تک وہی میرے استاد ہیں، ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ آدمی ایک خاص مرحلے تک کسی ایک کا شاگرد ہوتا ہے پھر آگے بڑھ کر کالج یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، یا باہر کسی دانشگاہ میں چلا جاتا ہے، داخلہ لے کر مختلف پروفیسروں سے پڑھتا ہے۔

لیکن میرا معاملہ یہ ہے کہ میں عربی کی الف ب (المطالعة العربية) (یہ کتاب ہمارے

لئے عرب صاحب نے اپنے خاص اسلوب میں تیار کی تھی، جو طالب علم میں عربی بولنے اور لکھنے کی استعداد پیدا کر دیا کرتی تھی) چنانچہ المطالعۃ العربیۃ سے لے کر قرآن کریم میں ان کی منتخب سورتیں پھر صحیح بخاری بھی مکمل انھیں سے پڑھی، وہ توحید کا کھرا عقیدہ رکھتے تھے، اور قرآن کریم کے جلال و جمال سے خوب واقف تھے اور اس طرح انھوں نے ہمیں بھی اس کا ذوق وشوق ایسا عطا کیا، تھا کہ قرآن کی تلاوت اور ایمان کی حلاوت کا صحیح لطف ملا اور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے عشق ہوگیا تو میں بتا رہا تھا کہ ابتدائی کتاب المطالعۃ العربیہ سے جس کا میں بارہا تقریر و تحریر میں ذکر کر چکا ہوں وہ ان کے خود ساختہ نصاب کی مبادیات میں تھی، عربی ادب کی آخری کتابوں، نہج البلاغہ، دلائل الاعجاز، اور حماسہ ابی تمام، لامیۃ العرب اور رسائل ابی بکر، خوارزمی، تک میں انھیں کا شاگرد ہوں، پھر میری ایک اور خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ مجھے ان کی شفقت وتوجہ کا کوٹہ پچاس فیصد ملا، میں تو یہ انکسار سے کام لے رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ ۸۰ فیصد سے زیادہ ملا، اس لئے کہ میرے شریک درس صرف ایک تھے میں یہ بات بڑی دانشگاہ (جامعہ کراچی) میں عرض کر رہا ہوں، اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس سے مفر نہیں اور میں کوئی تعلیمی مشورہ نہیں دے رہا ہوں۔

حضرات! جامعات وکالج کی سب سے بڑی کوتاہی

لیکن آج حالت یہ ہے کہ ہر یونیورسٹی اور کالج کی کامیابی سمجھی جاتی ہے کہ کلاس میں کتنے طلبا ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ گر ۱۰۰ طالب علم ہیں تو ان کا استاد کی توجہ کا ایک فیصد حصہ ملتا ہے، ہم صرف دو شاگرد تھے اور ایک استاد، ایک میں اور دوسرے عرب صاحب کے چھوٹے بھائی حسین بن عرب تو ہمارا کوٹہ محبت میں بہت بڑھا ہوا تھا، تو یہ ایک بات تھی، یہاں سے پڑھ کر جب میرے قدم ہندوستان سے باہر نکلے تو رباط سے لے کر جامعہ قروین سے مصر اور حجاز تک کوئی بڑی جامعہ تیونس کے سوا جہاں اتفاق سے میں جامعہ زیتونہ کو نہیں دیکھ سکا۔

دنیا کی تین بڑی جامعات

تین جامعات عالمی اسلامی میں بڑی اور قدیم کہی جاتی ہیں، جامع کہی جاتی ہیں، جامعہ قروین، جامعہ زیتونہ اور جامعہ الازہر، جامعہ زیتونیہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن جامعہ کے شیخ یا

وائس چانسلر ڈاکٹر الحبیب بن خوجہ کمیٹیوں میں میرے شریک کار رہے، جامعہ زیتونہ میں نے دیکھی نہیں وہاں کے حالات سے واقف ہوں، ڈاکٹر خوجہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور بہت سی کمیٹیوں میں ہم دونوں ساتھ تھے، اور اس کے علاوہ بھی محفلوں میں ملاقات رہتی، اسی طرح مصر کی مختلف انواع درسگاہوں کو دیکھا، دار العلوم کو دیکھا اور جامعہ فواد الاول جو جامعہ القاہرہ کہلاتی ہے، وہاں گیا اور جامعہ ازہر کو تو بہت خوب دیکھا اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں، اس لئے کہ اس کی عظمت وافتخار میں شاگرد کی حیثیت سے حصہ مجھے بھی ملتا کہ میں نے عربی ادب کا ایسا صحیح ذوق رکھنے والا استاد بلکہ جامعہ میں ایک علمی شہادت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ عربی ادب کا ایسا صحیح ذوق رکھنے والا استاد جس کے اندر ادبی ذوق رچ بس گیا ہو، ایک تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت کام لے لے، ہم لوگ سب ہی یہ کرتے ہیں، میں بھی یہ کرتا ہوں اس لئے کہ استاد رہا ہوں، مثلاً ایک مضمون پڑھانا ہے تو میں نے تیاری کی بلکہ چلتے چلتے بھی ایک نظر دیکھ لیا کہ فلاں چیز ذہن سے نکل تو نہیں جائے گی مجھے یاد ہے کہ جب بخاری تر جمے پڑھانے کے لئے ملی تو میں اس کا مطالعہ کرتا تھا اور پھر چلتے چلتے جب تیار ہو کر جاتا تب بھی ایک نظر ڈال لیا کرتا تھا کہ کہیں راویوں کے نام ذہن سے نہ نکل جائیں، ابواب وتراجم کی باریکیاں نہ بھول جاؤں تو میں طالب علم کو مطمئن کر دیتا تھا، عرب صاحب کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن ایک چیز ہوتی ہے کہ وہ کس طرح انسان کی گھٹی میں پڑی ہو اور اس کے اندر رچ بس جاتی ہے اور خون کے اندر جاری وساری ہو جاتی ہے تو اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے، پھر وہ ابلتی ہے، چشمہ رواں کی طرح روئیں روئیں سے ابلتی ہے، عرب صاحب کا حال یہی تھا، کہ جب وہ پڑھانے بیٹھتے تو ان پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ لکھنؤ کا یہ بازار جھاؤلال جو محمد علی لین کہلاتی ہے وہ گلی، اور امین آباد کا ایک حصہ جہاں ایک معمولی سا مکان تھا کسی کو خبر نہیں تھی کہ یہاں پر کون سا مدرسہ لگا ہے، اور اس مدرسہ سے عربی زبان وادب کی کون سی خدمت ہونے والی ہے، چٹائی پر صحیح معنی میں میں کوئی استعارہ نہیں بول رہا ہوں، وہ فرش ایسا تھا کہ اس موٹے موٹے بال تھے (نمدہ) کے ہم لوگوں کے نشان پڑ جاتے تھے، اگر نثر کی کوئی کتاب ہے تو عرب صاحب اس کے کسی جملے کا بڑا لطف لیتے، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کاش عربی تعلیم کی کلاس ہوتی تو وہاں عرض کرتا کہ اچھا جملہ وہ پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں

نے کوئی لذیذ چیز کھائی ہو اور وہ اس کا مزہ لے رہے ہوں اور ان کے منھ میں پانی بھر آیا ہے۔

استاد اور طالب علم کے درمیان ربط

حضرات: یہ ایک حسی کیفیت ہوتی ہے، اسے صرف ذہنی کیفیت نہیں حالانکہ یہ ایک علمی اور ذہنی کیفیت بھی ضروری ہے اور مفید بھی ہے لیکن جب حسی طور پر یہ بات پیدا ہو جائے کہ معلوم ہوا کہ گم ہو گئے اور بس عرب صاحب بار بار فرماتے کہ ارے ظالم نے یہ کیا جملہ کیا کہہ دیا اور اتنی بار دہراتے کو معلوم ہوتا تھا کہ ان کو انتظار ہے کہ ہم اس خوبصورت جملے کو اپنے اندر اخذ کر لیں تاکہ وہ کرنٹ ہماری طرف منتقل نہیں ہوگا، تو طالب علم استاد کا ثنی نہیں بن سکتا، اگر عربی کا شعر ہے تو ان کی حالت ایسی ہوتی تھی اور اس قدر جوش وخروش کے ساتھ پڑھتے کہ پورا کمرہ گونج اٹھتا تھا بعض مرتبہ آدمی اچھل جاتے، مجھے آج تک یاد ہے اور میں یہ بات بتا سکتا ہوں کہ ان کو کون کون سے شعر پسند تھے، اور یہی تعریف ہے، ایک کامیاب استاد کی، آج کتنے طالب علم ہیں جو یہ بات بتا سکتے ہوں، خواہ اردو زبان کا معاملہ ہو یا عربی کا ان سے پوچھئے کہ آپ کے استاد کو کون کون شعر پسند ہیں، ہاں میں بتا سکتا ہوں یا لکھوا سکتا ہوں، جو میرے استاد کو پسند تھے، اور وہ مزے لے لے کر پڑھتے تھے اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ عرب ہونے کے باوجود انھیں اردو شاعری کا بھی بڑا اچھا ذوق ملا تھا، ان کی زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گذرا تھا جہاں انھوں نے بڑے بڑے اساتذہ سے پڑھا تھا اور ادب کا بھی ایک حاسہ یعنی ایک SCENCE ہوتا ہے، جس طرح آپ حواس خمسہ سے واقف ہیں، ایک حاسہ اور ہوتا ہے، اسے آپ حاسہ سادسہ (چھٹی حس) کہئے اور وہ ہے حاسۂ ادبیہ جس کو حاسہ نہیں ملتا وہ جتنی ہی کوشش کرے کامیاب شاعر یا ادیب نہیں بن سکتا، ہاں ناقد یا مؤرخ ہو سکتا ہے، عروض داں ہو سکتا ہے، خامیاں نکال سکتا ہے، لیکن وہ صحیح معنوں میں ادیب نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ حاسۂ ادبیہ سے محروم ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ابھی کئی حاسے اور ہوں گے جن کا ابھی انکشاف نہیں ہوا، ان میں سے ایک دینی حاسہ بھی ہوتا ہے بعض لوگوں میں دینی حاسہ نہیں ہوتا، ان کو مصیبت یہ ہوتی ہے کہ ہزار دلیلیں دیں مگر وہ دینی حاسہ ان کے اندر موجود نہیں ہوتا، جو وہ اس سے کام لیں، جیسے بعض لوگوں کے اندر موسیقی (SCENCE) نہیں ہوتا ان کا حال یہ ہوتا

ہے کہ اچھے شعر پڑھیئے، وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے، میں ایک لطیفہ سناؤں، مجھے دو سال ہوئے میں رباط گیا تھا، وہاں مسلم یونیورسٹیز کا فیڈریشن کا مرکز ہے، وہ ندوۃ العلماء کے ناظم کی حیثیت سے اس کا رکن ہوں وہاں ایک بڑے علامہ اور دارالحدیث کے شیخ عمید (DEAN) تھے ان میں ساری خوبیاں تھیں لیکن یہ حاسہ کم ملتا تھا یا بالکل نہیں ملتا تھا، ایک شخص نے ان کی تعریف کی بڑے اچھے آدمی ہیں، لیکن صبح گدا گدا یئے تو شام کو ہنسی آتی، ہنسی کے اس محرک کو اتنا لمبا سفر کرنا پڑتا ہے، پورا دن گزر جائے، (**اد غدغه صباحا، فیضک مساء**) یعنی بڑے اچھے، بڑے سنجیدہ، صاحب علم لیکن ان میں لطف اندوز ہونے یا انجوائے (ENJOY) کرنے کا حاسہ نہیں ہے، تو صبح کو گدگدایئے اور شام کو ہنسی آئے تو شام تک کھڑا رہے گا کہ ہنسی آئی کہ نہیں غرض یہ حاسہ عرب صاحب کو خوب ملا تھا، مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک بار وحشت کلکتوی کا شعر انھوں نے اس طرح سنایا کہ بس تصویر بن گئے شعر یہ تھا۔

نشان منزل جاناں ملے ملے نہ ملے
مزے کی بات ہے یہ شوق جستجو میرا

ایک عرب کو دیکھئے وہ کس طرح اس کا لطف لیتا ہے، اس شعر پر انھوں نے اس طرح پہلو بدل بدل کر داد دی، ایسے ہی ان کو عربی کے شعر بہت یاد تھے، بحتری ان کا پسندہ شاعر تھا، کہتے تھے، ان کے ایک شعر پر پورا دیوان قربان کیا جا سکتا ہے۔

و کالسیف ان جئته مستغیثا و کالجر ان جئته مستقیا ان لم یکن قصدی زنبا فقد کفی ان لااراک عقابا

کہ اگر میرا آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہونا جرم تھا تو اس سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں ہو سکتی کہ میں آپ کے دیدار سے محروم رہا، اس پر انھوں نے کہا تھا کہ دیوان قربان کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ انتظام کیوں کیا جا رہا ہے، ایک متوسط درجے کا ایک لڑکا جس کے بھائی بے شک عربی کے عالم تھے، لیکن انھوں نے ڈاکٹری کا کورس (MBBS) بھی کیا تھا، اور مطب کر رہے ہیں، اس کے خاندان کے کئی افراد ہندوستان سے باہر گئے آئی سی ایس میں شریک ہوئے ان میں سے ایک صاحب یہاں بھی ہیں، حافظ محمد اسحاق آئی سی ایس وہ

میرے خاندان کے ہیں، وہ جس وقت وہاں گئے تو ایک دھوم مچی تھی، ہمارا ضلع رائے بریلی ہے، ہم لوگ نصیر آباد کے رہنے والے ہیں، دھوم یہ تھی کہ ولایت گئے ولایت گئے وہ آئے، جب بھی بڑی دھوم ہوئی، میرے حقیقی خالہ زاد بھائی اس سے پہلے بیرسٹری کرنے انگلینڈ گئے تھے اور ایک تیسرے بھائی بھی امریکا گئے تھے، حقیقی ماموں کے بیٹے تھے کہ ایک چھوٹا سا خاندان جس کے تین تین افراد باہر گئے ان کے ایک لڑکے لئے یہی سوچا جا سکتا تھا کہ اس کو انگریزی میں کمال پیدا کر لینا چاہئے یہی منصوبہ بنایا جا سکتا تھا لیکن کیا بات تھی کہ میرے بھائی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ مجھے عربی پڑھائی جائے اور عربی پڑھنے کے لئے اس وقت بھی دیوبند تھا، ندوۃ العلماء تھا، مظاہر العلوم سہارنپور تھا، لیکن قبل اس کے کہ ندوۃ العلماء سے فیض حاصل کرتا مجھے ایک عرب استاد کے سپرد کر دیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان سے میرے لئے غیریت نہیں رہی مجھے یاد ہے کہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تو حفیظ جالندھری سے میری ملاقات کرائی گئی اور تعارف مین کہا گیا کہ یہ لڑکا لکھنو سے آیا ہے، جو آب حیات اور'' گل رعنا'' کا حافظ ہے، گل رعنا میرے والدہ کی تھی، یعنی اپنے گھر کی دولت اور'' آب حیات'' میں نے اتنی پڑھی تھی کہ آپ ایک مصرعہ پڑھئے میں دوسرا پڑھ دوں گا، حفیظ جالندھری نے مجھ سے کہا کہ میاں ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم پنجابی میں سوچتے اور اردو میں شعر کہتے ہیں، اس طرح انھوں نے یہ پوچھا کہ عربی میں سوچتے ہو اور عربی میں بولتے ہو، عرب صاحب کے پڑھانے میں یہی سب سے بڑی خوبی تھی کہ وہ طالب علموں میں یہ احساس پیدا کر دیتے تھے کہ عربی گویا تمہاری زبان ہے، اور جو اچھی الفاظ، محاورے ہیں، یہ کسی کی ملکیت نہیں تمہارے لئے بھی اسی طرح ہیں جیسے ان کے لئے جنھوں نے لکھے ہیں، البتہ صحیح جگہ استعمال کرنے کا سلیقہ چاہئے تم صحیح جگہ استعمال کرو تمہاری بن جائے گی یہ سمجھو یہ تصرف ہے، ایک بات مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک جملہ لکھا۔

فلما سل سیف الصبح من سیف الظلام۔

ان کو معلوم تھا کہ یہ جملہ میں نے کہاں سے لیا ہے ابھی چند دن ہوئے تھے مجھے ان سے پڑھتے ہوئے لیکن اس قدر خوش ہوئے اتنا لپٹایا، اتنا چمٹایا اور اسی وقت مجھے ایک روپیہ انعام دیا، پھر ملائی کی برف بھی جو لکھنو میں بہت پسند کی جاتی ہے وہ بھی کھلائی یعنی وہ یہ احساس پیدا کر دیا کرتا تھے کہ یہ جو ورثہ یا ذخیرہ ہے وہ سر بہ مہر نہیں ہے اور ایسا نہیں ہے کہ ختم ہو جائے یا بند کر کے

رکھ دیا گیا ہے بلکہ یہ ایک ایسی دولت مشترکہ ہے جس سے سب کو فائدہ چاہئے، البتہ اس شخص کا حق اس پر قائم ہوتا ہے جو اس کو صحیح جگہ پر اعتدال کے ساتھ استعمال کرے، اگر بے جا اور بے موقع محاورات استعمال کئے جائیں تو ان میں کوئی نہ کوئی طنز نکلتا ہے، اور ہمارے لکھنوں میں اس کا بہت لحاظ رکھتے ہیں، کہ یہ محاورہ یہاں نہیں بولنا چاہئے، یا ایسا نہ ہو کہ امتذال کی حد تک پہنچ جائے، دوسری صفت ان کے پڑھانے کی یہ تھی کہ وہ احساس پیدا کر دیا کرتے تھے کہ سب کچھ تمہارے لئے ہے تم اس کی عبارتوں میں، تقریروں اور دلیلوں میں استعمال کرو، سچ تو یہ ہے اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا، یہی نہیں بلکہ اہل زبان تھے، قرآن مجید کی تلاوت اس قدر خوش الحانی سے کرتے اور ان پر گریہ وزاری کے ساتھ ایسی وقت رقت طاری ہوتی تھی کہ محلّہ کی مسجد سے باہر غیر مسلم تک سن کر رک جایا کرتے تھے۔

استاد ایسا ہو جو اپنا ذوق طالب علم میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو

بہر حال وہ ان گنے چنے اساتذہ میں سے تھے جو اپنا ذوق منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اس لئے کہ ان کا یہ ذوق ان میں خود ایک چشمے کی طرح ابلتا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ اس چھلکتے ہوئے جام کو ٹپکنے کا موقع ملے ورنہ اگر کوئی جام لبریز ہو اور ٹپکنے کی اجازت نہ دی جائے تو پھر یہ ہوگا:

سقونی وقالو الاتغن وان سقواء
جبال سلیمی ماسقیت ، لغنت

شاعر کہتا ہے کہ انہوں نے مجھے شراب پلائی تو بہت، لیکن کہتے ہیں کہ گنگناؤ نہیں، حالانکہ اگر یہی جام سلیمی کے پہاڑوں کو پلا دیئے جائیں تو وہ بھی گنگنانے لگیں یا نغمہ سرا ہو جائیں اس کے صرف ایک آنچ کی ضرورت ہوتی ہے، عرب صاحب کے اندر ذوق وشاعری کی آگ بھری ہوئی تھی زبان کی بھی ایک آگ ہوتی ہے، اس کی چنگاریوں کو نکلنا چاہئے، اس موقع پر بغیر کسی ترتیب کے علامہ خلیل عرب اور ان کے کامیاب طریق تعلیم عربی کے بعض پہلو آپ کے سامنے رکھے ہیں اس کے لئے میری کتاب ''پرانے چراغ'' میں ان پر مستقل مضمون ہے

میں عربی میں کئی جگہ ان کا تذکرہ اور ان کی خصوصیات کا ذکر کر چکا ہوں، خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پہلی مرتبہ یہاں آیا جہاں عرب صاحب کے نام کی لائبریری قائم کی گئی ہے، یہ ۲۲ سال بعد میرا پاکستان کا دورہ ہے۔

اب جب آیا ہوں تو اب یہ لائبریری قائم ہوگئی ہے، انشاءاللہ پھر آیا تو ان کے نام سے کوئی عربی ادارہ بھی قائم کر دیا گیا ہوگا، تاکہ عرب صاحب کے کامیاب طریق تعلیم کے مطابق پاکستان میں عربی کا ذوق پیدا کیا جائے، **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔**

میں جناب احسان رشید وائس چانسلر جامعہ کراچی کو مبارکباد دیتا ہوں اور مبارکباد سے زیادہ داد دیتا ہوں کہ آپ کی جامعہ پہلی جامعہ ہے جس کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس میں ایک عربی النسل خاندان کا ایک فرد نہیں بلکہ میری استاد زادی میری بہن پروفیسر عطیہ خلیل عرب اس کی سربراہ اور استاذ ہیں، میں ان الفاظ کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں، دوسرا پروگرام بھی ہے اگرچہ۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
وما علینا الا البلاغ المبین۔
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ

قرآنی مطالعہ اور اس کے آداب

یہ تقریر ۲۶ جولائی ۸۷ء کو قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور کے ایک منتخب جلسے میں کی گئی۔ اس جلسہ میں حلقہ تدبر قرآن سے تعلق رکھنے والے حضرات دور دراز کا سفر کر کے آئے تھے۔ مقرر خصوصی اور قرآن اکیڈمی کا تعارف اس کے مؤسس وصدر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کرایا۔

الحمد لله نحمده و نستعينه و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادي له و نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له و نشهد ان محمداً عبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و على آله و اصحابه و سلم تسليما كثيراً كثيراً. اعوذ بالله من الشيطن الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم. الله يجتبى اليه من يشاء و يهدى اليه من ينيب O

قرآن مجید ہر موقع پر مشکل کشائی اور دستگیری کرتا ہے:

برادرانِ عزیز! قرآن مجید کے معجزات میں سے جن کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا یہ بھی ہے کہ وہ ہر موقع پر مشکل کشائی اور دستگیری کرتا ہے، مجھے بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ میں کسی تقریر کے موقع پر یہ طے نہ کر سکا کہ اپنی بات کہاں سے شروع کروں گا اور مجھے آج کیا کہنا ہے اور قاری نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے لوگوں کے سننے سے پہلے وہ آیتیں مجھے سنائی جارہی ہیں اور ان آیتوں کا انتخاب میرے لئے کیا گیا ہے، مجھے اپنے غیر ملکی دوروں میں بھی اس کا تجربہ ہوا کہ دن بھر کی مصروفیتوں اور نقل و حرکت میں اس پر غور کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کہ کس موضوع پر تقریر ہوگی، کہیں تو موضوع کا تعین ہو جاتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا تو میں نے اس کو خدا پر چھوڑ دیا کہ وہ وقت پر رہنمائی فرمائے گا، چونکہ جو چیز اس کی طرف سے آتی ہے، اس کو عارفین "وارد" کہتے ہیں، یعنی ایک عزیز مہمان جس کا ورود ہوا ہے، اس میں اپنے ارادہ اور انتخاب کو کوئی دخل نہیں، اس موقع پر بھی یہی پیش آیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیز قاری کو جو انہوں نے آیتیں پڑھیں اس میں ہماری رہنمائی ہوئی۔ قبل

اس کے کہ میں آیت کی تشریح میں کچھ عرض کروں اور قرآن مجید کے طالب علموں کے سامنے اپنے کچھ تجربے، کچھ مشورے پیش کروں کہ حقیقت میں وہی میرے مخاطب ہیں، کچھ اپنی حقیر ذات اور علمی سفر کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید کی حکمت دعوت:

ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبی سے میرا تعارف بھی کرایا لیکن میں کس قدر تعارف ضروری سمجھتا ہوں اور سنت یوسفی کے مطابق یہ فرض بھی خود ہی انجام دیتا ہوں۔ جب حضرت یوسف کے پاس تعبیر پوچھنے والے گئے تو انہوں نے فرمایا: **ذلکما مما علمنی ربی** سب سے پہلے سامعین کو یا جو کوئی استفسار لے کر جائے اس کو اس اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جس کے پاس گئے ہیں اس سے کچھ مدد بھی مل سکتی ہے یا نہیں، انتخاب میں انہوں نے کچھ غلطی تو نہیں کی تو انہوں نے ضروری سمجھا کہ کہہ دیں **ذلکما مما علمنی ربی انی ترکت ملة قومه لا یؤمنون باللہ وھم بالاخرۃ ھم کفرون**O

یہ نبی کا کلام تھا اور اس میں ایک طرح کی خودستائی کی بوتھی، اس میں اپنی تعریف کی بو نکلتی تھی اور یہ وہم ہوسکتا تھا، اس لئے انہوں نے فوراً فرمادیا کہ "**ذلکمامما علمنی ربی**" میں تمہاری اس موقع پر مدد تو کرسکتا ہوں، مجھے اللہ نے یہ علم عطا فرمایا ہے، لیکن یہ علم کیوں عطا کیا ہے؟ "**انی ترکت ملة قوم لا یومنون باللہ**" یہ میری ذہانت کا نتیجہ نہیں ہے، میری نجابت کا بھی یہ نتیجہ نہیں حالانکہ یہ دونوں چیزیں موجود تھیں اور بدرجہ کمال و جمال، لیکن انہوں نے فرمایا "**انی ترکت ملة قوم لایؤمنون باللہ وھم بالاخرۃ ھم کفرون**" اس علم کا افاضہ اس لئے ہوا کہ میں نے اس قوم کی ملت چھوڑ دی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی اور آخرت کی منکر تھی۔ "**واتبعت ملة ابائی ابراھیم واسحاق ویعقوب**" اور اس کے بعد انہوں نے وہیں سے توحید کے وعظ کا مدخل پیدا کرلیا۔ عزیزو! تم جس کو بڑا مسئلہ سمجھ رہے ہو اور جو مشکل تم کو یہاں لے کر آئی ہے، اس سے بڑی مشکل درپیش ہے، وہ ہے عقیدہ، یہ خواب جو تم نے دیکھا، خواب تو خواب ہی ہوتا ہے، لیکن معاملہ بیداری کا ہے، معاملہ زندگی کے مستقبل کا ہے، معاملہ ابدی اور دائمی زندگی کا ہے، مان لو تم کو خواب کی تعبیر دینے والا دنیا میں کوئی بھی نہ ملے تب بھی کوئی بڑا نقصان نہیں، لیکن اس خواب ہستی کی تعبیر دینے والا اگر کوئی نہ ملا کہ دنیا میں آنے کا مقصد کیا

ہے؟ کائنات کا فاطر و خالق کون ہے؟ اگر اس کی صحیح معرفت نہ ملی تو اصل خطرہ یہ ہے، پھر انہوں نے اتنا ہی Dose یا جتنا Dose دینا چاہئے تھا، وہ جانتے تھے کہ یہ غرض لے کر آئے ہیں، ان کو ایک ذہنی پریشانی ہے، یہ اتنا صبر نہیں کر سکتے کہ ان کو ایک یا دو گھنٹے تبلیغ کروں، اس لئے انہوں نے بالکل صحیح احساس تناسب کے ساتھ جو ایک حاذق طبیب رکھتا ہے اور ایک داعی حکیم رکھتا ہے ایک ملہم رکھتا ہے، اتنا ہی ڈوز دیا جتنے ڈوز کے وہ متحمل تھے۔

دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے:

آپ اس تناسب کو دیکھئے، اس میں جمال یوسفی پورے طور پر عیاں ہے، اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی، ناپ تول کر جہاں رک جانا چاہئے وہاں رک گئے، یعنی توحید کی پوری بات کہی، لیکن اس کو اتنا دراز نہیں کیا کہ وہ لوگ یہ کہنے لگتے کہ آپ اگر خواب کی تعبیر دے سکتے ہیں تو دیجئے، ورنہ ہم فرصت سے آئیں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے دل و دماغ کا دروازہ کھلا ہے اور دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے۔ قسمت سے کھلتا ہے، کبھی کسی غرض سے کھلتا ہے، کبھی کسی پریشانی سے کھلتا ہے، اس دروازہ سے جو اصل پیغام ہے وہ داخل کر دینا چاہئے، لیکن وہ پیغام اس میں سبک روی کے ساتھ داخل ہو کر وہ دروازے بند نہ ہو جائیں اور احتجاجاً بند نہ ہو جائیں، میں تو حیران رہ جاتا ہوں اور افسوس ہے کہ یہ پورا حصہ بائبل سے حذف ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کس کی تصنیف ہے اور قرآن کس کا نازل کیا ہوا ہے، ان کو خوب اندازہ تھا کہ یہ کتنی بات کے متحمل ہو سکتے ہیں، اتنی ہی بات انہوں نے کہی۔ مریض چاہتا ہے کہ اس کو اس کے درد کا مداوا جلد مل جائے تو انہوں نے کہا قبل ان یأتیکما طعام ترزقانه تمہارا راشن جو مقرر ہے اس کے آنے سے پہلے تعبیر دے دوں گا۔ مخاطب کو یہی دو اطمینان چاہئیں، اس کی دوا مل سکتی ہے یا نہیں؟ اور جلد ملتی ہے یا نہیں؟ اس درمیان میں توحید کا وعظ کہہ دیا۔

مطالعہ قرآن مجید سے علمی زندگی کا آغاز:

میں اپنا تھوڑا سا تعارف کرانا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں قرآن شریف کا ایک حقیر اور ادنیٰ طالب علم ہوں، میری علمی زندگی قرآن مجید ہی مطالعہ سے شروع ہوئی، میں نے کئی جگہ لکھا ہے

کہ مجھے اللہ نے ایک ایسا استاد عطا کیا جس کو ذوق ایمانی اور ذوق قرانی ملا تھا۔(۱) وہ قرآن پڑھتے تھے اور روتے تھے، پہلا نقشہ جو مجھ پر پڑا وہ ان کی آواز کا، جو درد میں ڈوبی ہوتی، یہ میری خوش نصیبی تھی، اور قرآن مجید کا اصل مزاج بھی یہی ہے۔

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے:

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا گیا کہ نماز پڑھاؤ اور حضور ﷺ کے مصلی پر کھڑے ہو جاؤ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ابوبکرؓ کو اس سے معاف رکھا جائے کہ وہ ''رجل بکا'' ہیں جب وہ قرآن شریف پڑھنے لگتے ہیں تو پڑھ نہیں سکتے، ان پر گریہ غالب ہو جاتا ہے اور لوگ سن نہیں سکتے ہیں اور یہی شکایت کی تھی مشرکین قریش نے جب حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کی اجازت دی گئی اور انہوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنائی، جب تک وہ سری نماز پڑھتے رہے تو لوگ وہاں جمع نہیں ہوتے، لیکن جب وہ قرائت کرنے لگے تو مرد و عورتیں اور بچے وہاں جمع ہونے لگے۔ پھر وہ رقت کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے لگے تو پتھر بھی موم ہونے لگے اور دلوں پر اثر ہونے لگا کہ قریش کو یہ فکر پڑ گئی کہ کہیں مکہ معظمہ کی زندگی میں تہلکہ نہ مچ جائے اور زمام کار ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ اصل میں قرآن کا مزاج ہی یہی ہے کہ درد کے ساتھ ایمانی حلاوت کے ساتھ پڑھا جائے۔ حدیث میں آتا ہے ''**الایمان یمان والفقه یمان والحکمة یمانیه**'' یہ میری خوش نصیبی کہ پہلا معلم جو مجھے عطا کیا گیا وہ رقیق القلب تھا، دل دردمند رکھتا تھا اور ہم لوگوں کو حسرت رہتی تھی کہ وہ دیر تک قرآن شریف پڑھیں اور ہم سنیں، وہ ہمارے محلّہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھاتے تھے۔ شاذ و نادر کبھی ایسی نوبت آئی تھی کہ وہ پوری سورہ پڑھ سکیں، پڑھنا شروع کیا کہ گریہ طاری ہوا، آواز بھرا گئی، ان کا روزانہ کا یہ معمول تھا۔ انہوں نے مجھے قرآن مجید کی کچھ سورتیں پڑھائیں، توحید کی سورتیں خاص طور پر انہوں نے مجھے پڑھانی شروع کیں۔ سورہ زمر سے شروع کیا، پھر وہ وقت آیا کہ زبان وادب کی تعلیم غالب آ گئی اور اسی میں مشغول ہو گیا، لیکن قرآن مجید کا جو ذوق تھا وہ وقتاً فوقتاً سامنے آتا تھا اور اثر کرتا تھا۔ اس کے بعد جب میری

(۱) شیخ خلیل بن محمد یمانی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''پرانے چراغ''، مستقل مضمون)

تعلیم ختم ہوئی تو قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ مدارس کے نصاب میں جو کتابیں پڑھی جاتی ہیں، ان سے زیادہ پڑھیں پھر یہاں لاہور آ کر مولانا احمد علیؒ سے قرآن مجید پورا پڑھا، یہاں بھی جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کی قرآنی زندگی تھی جس کو قرآن ناطق کہا گیا ہے، اس سے قلب میں جلا محسوس ہوتی تھی، مولانا کی زاہدانہ زندگی، درویشانہ معاشرت اور عمل بالسنّت کا مجھ پر وہ اثر پڑا جس کو ''برکت'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں بھی رہا۔ میں نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے وقت مانگا کہ خاص خاص آیات جن میں مجھے اشکال محسوس ہوتا ہے جو عام تفسیروں سے حل نہیں ہوتیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ مولانا مدنیؒ اپنے زمانہ کے بلند ترین علماء میں تھے اور علوم وفنون اور حدیث کے علاوہ (جس کے وہ مانے ہوئے استاد اور شیخ تھے) ان کو قرآن مجید کا خاص ذوق تھا۔ اس کا رنگ ان کی زندگی اور مزاج پر چھا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے جمعہ کا دن دیا، مجھے یاد ہے کہ ان آیات کو منتخب کر لیتا تھا جو حل نہیں ہوتی تھیں۔ مولانا کثرت سے سفر کرتے تھے اور وہ تحریک کا زمانہ تھا لیکن مجھے پھر بھی استفادہ کا کچھ موقع ملا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور علوم قرآن:

اس کے علاوہ مجھے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر اور بعض آیتوں پر ان کی تقریر سننے کا موقع ملا اور میرا تاثر یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے بارے میں کسی کا فہم اتنا عمیق نہیں پایا جتنا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا۔ یہ ایک تاریخی انکشاف ہے، لوگ سید صاحب کو مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں، متکلم کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن میرے نزدیک فہم قرآن میں ان کا پلہ اتنا بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تحتی براعظم میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کا مطالعہ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو اور اس غائر مطالعہ کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان وادب اور بلاغت اور اعجاز قرآنی کا مطالعہ ان کا بہت وسیع وعمیق تھا، پھر مولانا حمید الدین فراہیؒ (جو اس فن کے گویا امام تھے) کی صحبت میں رہ کر انہوں نے ان کی گفتگو، ان کی تحقیقات اور ان کے مطالعہ قرآن سے پورا استفادہ کیا، مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم لوگ دارالمصنفین گئے ہوئے تھے تو انہوں نے سورۂ جمعہ پر تقریر کی، میں نے ایسی عالمانہ، ایسی محققانہ اور ایسی نکات سے بھری ہوئی تقریر ابھی تک نہیں سنی تھی، کاش کہ وہ محفوظ ہو جاتی۔ تو مجھے

سید صاحب سے مختصر استفادہ کا موقع ملا، پھر جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد میرا انتخاب ہوا تو خاص طور سے قرآن مجید کا درس میرے سپرد ہوا، وہاں قرآن کے درس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو متن قرآن پڑھا جاتا ہے اور یہ سلسلہ غالباً دار العلوم ندوۃ العلماء ہی سے شروع ہوا، پھر اور مدارس میں اس کی تقلید کی جانے لگی اور یہی صحیح طریقہ ہے کہ ابتداء میں متن کو سامنے رکھ کر پڑھا جائے بغیر کسی تفسیر کی مداخلت کے استاد تیار ہوکر آئے اور وہ اپنا مطالعہ قرآن پیش کرے، تو مجھے کئی سال تک قرآن مجید کی خدمت کا موقع ملا، تفسیر بھی پڑھائی لیکن زیادہ متن قرآن پڑھایا، جو مضامین میرے سپرد ہوئے تھے ان میں سب سے زیادہ اہم تفسیر والا مضمون تھا، میں نے اپنا تعارف اس لئے کرادیا کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں، اس کے بعد جو کچھ بھی اللہ نے توفیق دی اس میں قران مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے:

"آنچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم"

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے۔ میں نے سب سے زیادہ قرآن سے مدد لی ہے اور پھر تاریخ سے اور میں تاریخ کو قرآن مجید کی ہی تفسیر سمجھتا ہوں۔

اجتباءِ خاص، ہدایت عام:

اس وقت جو آیت پڑھی گئی، اس آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں، ایک مقام اجتباء اور دوسرے ہدایت، اجتباء کے لئے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہہ دیا "اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء" سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے وہ اجتباء سے سرفراز کرے اور اس کو قبولیت و اجتباء کا درجہ عطا کرے، لیکن ہدایت کی سب انسانوں کو ضرورت ہے۔ "یھدی الیہ من ینیب" وہ ان کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہدایت کے طالب ہوتے ہیں، اور جن میں انابت کی، تواضع کی اور بندگی کی اور اپنے کو کچھ نہ کچھ سمجھنے کی کیفیت پیدا ہوجائے تو اللہ تعالیٰ ان کو راستہ پر لگا دیتا ہے اور آخر تک پہنچا دیتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ان میں انابت کی صفت پائی جائے۔ "یھدی الیہ من ینیب" میں اسی ٹکڑے پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید کے دو پہلو ہیں، ایک اس کا تعلیمی اور تبلیغی پہلو ہے، یعنی وہ عقائد جن پر ہر

شخص کو ایمان لانا چاہئے اور سمجھنا چاہئے اور قرآن سے اخذ کرنا چاہئے، اس کے متعلق تو قرآن مجید کا اعلان ہے کہ "**بلسانٍ عربی مبین**" روشن اور واضح عربی میں ہے۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتادیا "**ولقد یسرنا القران للذکر فھل من مدکر**" ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کردیا ہے۔ کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

قرآن مجید پڑھ کر انسان مشرک نہیں ہوسکتا:

کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ خدا اس سے کیا چاہتا ہے اور اس کی ہدایت کے لئے کیا شرائط ہیں اور توحید و رسالت اور معاد کا قرآنی تصور کیا ہے؟ قرآنی عقیدہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور آخرت میں نجات مل سکے؟ اس کے لئے قران مجید آسان ہے اور کسی کو یہ کہنے کا یہ عذر نہیں کہ ہم قرآن مجید سے ان باتوں کو سمجھ نہیں سکے، اور قرآن ہمارے لئے حجت نہیں، توحید کے بارے میں واضح سے واضح، صریح سے صریح، طاقتور سے طاقتور، دوٹوک بات جو کہی جاسکتی ہے قرآن مجید میں موجود ہے، قرآن مجید پڑھ کر آدمی سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن مشرک نہیں ہوسکتا۔ میں یہ علی الاعلان کہتا ہوں کہ وہ ٹھوکریں کھا سکتا ہے، بے عمل ہوسکتا ہے، وہ فسق کی راہ اختیار کرسکتا ہے، لیکن جہاں تک توحید و شرک کا تعلق ہے تو قرآن مجید بالکل سورج کی طرح روشن اور سورج کیا ہے اس میں کسی قسم کے اشتباہ کی گنجائش نہیں، اور جہاں تک رسالت کے عقیدہ کا تعلق ہے کہ نبوت کیا چیز ہے؟ انبیاء کیا ہیں؟ ان کے ذمہ کونسی چیز سپرد کی گئی ہے؟ ان کو کیا حکم ہوتا ہے؟ وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ ان کی سیرت کیسی ہوتی ہے؟ ان کی زندگی کیسی پاکبازانہ اور بلند ہوتی ہے؟ یہ قران مجید میں صاف طور سے بیان کردیا گیا ہے، وہ اپنا تعارف بھی کراتے ہیں، وہ شبہوں کو بھی دور کرتے ہیں۔ آپ سورۂ اعراف پڑھئے، سورۂ ہود پڑھئے، سورۂ شعراء پڑھئے، اس میں ایک ایک نبی کا نام لے کر تعارف کرایا گیا اور ثبوت دیا گیا ہے۔

عقل جج نہیں بلکہ وکیل ہے:

جہاں تک رسالت و انبیاء کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی قرآن مجید میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی آدمی گمراہی کا ارادہ ہی کرلے تو گنجائش تو ہر چیز کی ہے، آپ

ہی میں سے کوئی صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت عطا کی ہو کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ میں ثابت کرسکتا ہوں کہ اس وقت دن ہے، سورج روشن ہے اور ہمیں دھوپ کی تمازت محسوس ہو رہی ہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ہم سب کو لا جواب کردیں۔ اس کا تو زبان اور ذہانت سے تعلق ہے، مقدموں میں عدالتوں میں کیا ہوتا ہے؟ دن کو رات اور رات کو دن ثابت کردیا جاتا ہے۔ ہمارے استاد مولانا عبد الباری صاحب ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ عقل جج نہیں بلکہ وکیل ہے۔ اس کو فیس ملنی چاہئے تو پھر یہ ہر مقدمہ کو ثابت کرسکتی ہے۔ جب کوئی فلسفہ آیا، عقل نے اس کی صداقت کو اس طرح ثابت کیا کہ وہ بالکل بدیہی حقیقت معلوم ہونے لگی۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی آدمی طے کرلے کہ قران مجید سے کوئی بات نکالنا ہے اور اس کی مثال میں آپ کے سامنے دیتا ہے، میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے ایک جلسہ میں شریک تھا، وہاں ایک صاحب نے مقالہ پڑھا، میں ان کا نام اور جگہ کا نام نہیں لوں گا۔ انہوں نے اپنے مقالہ میں یہ ثابت کیا کہ قرآن مجید میں جہاں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے اس سے مراد علاقائی حکومت ہے اور جہاں الصلوٰۃ الوسطیٰ آیا ہے اس سے مراد مرکزی حکومت ہے اور ثابت کیا کہ سارے قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مجھے اس وقت بڑی سختی سے اس کی تردید کرنی پڑی۔

ہدایت کے لئے قرآن آسان ہے:

ہدایت کے لئے قرآں مجید آسان ہے، اس میں کہیں کوئی شبہ نہیں، لیکن جہاں تک اس کے علوم کا تعلق ہے، اس کے رفیع ودقیق مضامین کا تعلق ہے، اس میں کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ سب غلط ہے، قرآن کے بارے میں سب سے الگ، منفرد وشاذ رائے قائم کرنا بڑی خطرہ کی بات ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول ہے "**ای سماء تظلنی وای ارض تعلنی اذا قلت فی کتاب اللہ مالا اعلم**" اے اللہ! کس آسمان کے نیچے پناہ لوں گا اور کس زمین پر چلوں گا اگر میں کتاب اللہ کی آیت کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دوں جس کی کوئی بنیاد، کوئی تحقیق نہیں۔ اور قرآن کے بارے میں صحابہ کرام کا یہ عام رویہ تھا۔ حضرت عمرؓ خود کسی کے لفظ کے بارے میں فرماتے کہ اس کے کیا معنی؟ اور پھر خود ہی کہہ دیتے کہ **ثکلتک امک یاعمر** عمر تیری ماں تجھ پر روئے، اگر تجھے اس ایک لفظ کے معنی نہیں معلوم تو کیا غضب ہوا۔ صحابہ کرامؓ کا انداز فکر بتاتا ہے کہ

پورے قرآن پر حاوی ہونے کو وہ نہ تو ممکن سمجھتے تھے اور نہ ضروری۔ میری یہ جرأت معاف کی جائے اور وہ یہ کہ قرآن کی جو اصل روح، اصل مدعا اور اصل مقصد ہے وہ حاصل ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ معاملہ ہونا چاہئے۔ ادب وخشوع کا، ہمیں بہت سی چیزوں کی حقیقتیں معلوم نہ ہونے کے باوجود ان سے پورا پورا فائدہ پہنچا ہے۔ اگر کسی شخص کو قرآن مجید کے حقائق و مطالب معلوم نہیں، یہاں تک کہ پورے الفاظ کے معنی بھی معلوم نہیں، لیکن اس کے دل میں خدا کا خوف ہے، خشیت ہے، جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ حالت ہوتی ہے جو اللہ نے فرمائی "لو انزلنا هذا القرآن على جبل لرأيته خاشعاً متصدعاً من خشية الله" اس کا حال یہ ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ لرز جاتا ہے اور اس کا رواں رواں لرز جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ میرے رب کا کلام ہے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہدایت کے آخری مدارج تک پہنچ جائے اور اس کو قرب بالقرآن حاصل ہو، حدیث میں آتا ہے، کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے کہ قرآن مجید پڑھیں گے اور بہت تکلف سے پڑھیں گے، مگر ان کے حلق سے نہیں اترے گا۔ تو جہاں تک مضامین کا تعلق ہے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور بڑے سے بڑا آدمی اس کی وسعت کے سامنے لرزہ براندام رہتا ہے اور سمجھتا تھا کہ اللہ کی ہدایت اور توفیق کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔

افادہ اللہ کی طرف سے:

پہلی بات تو یہ سمجھئے کہ افادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ افادہ ہوتا ہے ان قلوب پر جو اللہ کی خشیت اور کلام ربانی کی ہیبت سے اور اس کے جلال سے معمور ہوتے ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے علوم کا ورود ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ قرآن مجید کو نوافل میں پڑھے اور یہ تصور کرے کہ جیسے قلب پر اس وقت نزول ہو رہا ہے اور اس کا لطف لے اور اس میں گم ہو جانے کی کوشش کرے۔ قرآن مجید دماغی زور آزمائی کی چیز نہیں کہ اپنا پسندیدہ مطلب قرآن مجید سے [illegible] کر کے نکالا جائے۔

تیسری بات یہ کہ دوران مطالعہ جو مطلب و معانی سمجھ میں آئیں تو یہ کہے کہ میری ناقص [illegible] میں یہ بات آئی [illegible] آتا ہے اور یہ دعویٰ ہرگز نہ کرے کہ آج تک قرآن کو کسی نے سمجھا نہیں، میں نے اس کو سمجھا ہے۔ یہ بالکل صحیح نہیں ہے اور میں نے بارہا کہا اور لکھا بھی

ہے کہ اگر قرآن مجید اپنے کو تیرہ سو برس میں نہیں سمجھا۔ کا تو یہ قرآن مجید پر بہت بڑا الزام ہے۔ وہ تو کہتا ہے "لسان عربی مبین ان انزلناہ قرانا عربیا لعلکم تعقلون" اور آپ کہتے ہیں کہ ایک ہزار برس تک، بارہ سو برس تک قرآن مجید کے فلاں لفظ کی حقیقت آج تک کسی نے سمجھی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا افادہ اتنے دنوں تک بند رہا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں اس کی اختتامی تقریر میں، میں نے کہا تھا کہ اہل علم اپنی کسی تحقیق کو یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں مطالعہ کا جتنا موقع ملا، اس کے نتیجہ میں ہمارا خیال یہ ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں لیکن یہ طریقہ کہ کوئی شخص اپنے نتائج فکر کو سو فیصد صحیح ثابت کرنے پر اصرار کرے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب کو غلط قرار دے صحیح نہیں۔ قرآن مجید کے سلسلہ میں آتا ہے کہ اس کا نیا پن، تازگی پرانی نہیں ہوگی اور اس کے عجائب کی کوئی انتہاء نہیں، تو اگر آپ کو عمر نوح بھی ملے اور وہ قرآن مجید کے تدبر میں صرف ہو تو ہر روز نئے نئے معانی کھلنے لگیں۔ ہماری عمر کا یہ محدود وقت، محدود قوت اور صلاحیت اور اس کے بعد ہمارا یہ دعویٰ کہ قرآن مجید اب تک سمجھا ہی نہیں گیا، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

میری ذاتی کتاب:

آخری بات یہ ہے کہ قرآن مجید سمجھا جائے، یہ کتاب ابدی ہے، کتاب آسمانی ہے، لیکن میری ذاتی کتاب بھی ہے، میری ذاتی ہدایت نامہ بھی ہے، اس میں میری ذاتی کمزوریاں بیان کی گئی ہیں، میرے ذاتی امراض کی نشاندہی کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ہر آدمی اپنے کو تلاش کرسکتا ہے۔ یہ جب ہوگا جبکہ آپ اس کو زندہ کتاب سمجھیں یا اپنی کتاب سمجھیں، اور آپ میں اپنی اصلاح کا جذبہ ہو، لوگوں کی اصلاح تو بعد میں ہوگی، پہلے اپنی اصلاح ہو جائے۔

انبیاء کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے میری ہدایت ہو جائے پھر میں دوسروں سے کچھ کہوں، ہم میں سے بہت سے لوگ قرآن مجید کو اس لئے پڑھتے ہیں کہ یہ حجت ہے، دوسروں کو شرمندہ کیا جائے، دوسروں پر حجت قائم کی جائے۔ حالانکہ صحابہ کرامؓ قرآن مجید پڑھتے تھے اپنی اصلاح کے لئے، ایک آیت پڑھی اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ سورۂ بقرہ بعض اوقات مہینوں میں ختم ہوئی۔

یہ چند باتیں ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے ذہن میں تھیں، وہ سب میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ "یهدی الیه من ینیب" کے میدان میں جہاں تک ہم کوشش کر سکتے ہیں کریں، اللہ جس کو چاہے مقام اجتباء تک پہنچائے۔ ہم اس کے مکلّف نہیں ہیں، ہم سیکھنا چاہیں، ہم ہدایت حاصل کرنا چاہیں، ہم بننا چاہیں اور اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہیں تو قرآن مجید موجود ہے جو ہماری رہنمائی بھی کرے گا اور منزل مقصود پر بھی پہنچائے گا۔ ہم میں ہدایت کی طلب، اپنی احتیاج کا احساس اور اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہونا چاہئے۔ اسی کے مجموعہ کا نام انابت ہے۔ میں دعا کرتا ہوں، آپ بھی دعا کریں۔

اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم و لا الضالين O

عالم اسلام میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد و منہج

یہ تقریر ۱۲ جولائی ۷۸ء کو کراچی یونیورسٹی میں ہوئی، جلسہ میں یونیورسٹی کے اسٹاف اور طلبہ کے علاوہ ممتاز دینی، علمی، ادبی شخصیتیں، سیاسی رہنما، دینی اداروں کے ذمہ دار علماء، اور ادب و صحافت سے تعلق رکھنے والے معروف اصحاب شریک تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے آرٹس آڈیٹوریم کی وسعت کو سامعین کی کثرت نے ناکافی ثابت کر دیا تھا۔ بڑی تعداد کو گیلری میں کھڑے ہو کر تقریر سننی پڑی۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر احسان رشید صاحب وائس چانسلر اور اختتامی کلمات تشکر اسماعیل سعد صاحب رجسٹرار کراچی یونیورسٹی نے ادا کئے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین

علم ایک صداقت ہے:

جناب وائس چانسلر، اساتذۂ جامعہ، طلبہ وطالبات اور برادران عزیز! اگرچہ میں علم میں تقسیم کا قائل نہیں ہوں...... اور میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم وجدید، مشرقی ومغربی، نظری اور عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ:

حدیث کم نظراں قصۂ قدیم و جدید

میں علم کی دینی و دنیوی تقسیم کا بھی قائل نہیں ہوں۔ میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں یا ایک انسانی تجربہ جو کسی ملک وقوم کی ملک نہیں اور نہ ہونی چاہئے، میں زندگی کے دوسرے سرچشموں کی بھی جغرافیائی، نسلی، تاریخی یا سیاسی حد بندیوں کا قائل نہیں، میں علم کو ایک ''وحدت'' مانتا ہوں اور جس کو کثرت کہا جاتا ہے اس کثرت میں بھی مجھے وحدت نظر آتی ہے، علم کی وہ وحدت سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے اور اس کو پانے کی خوشی ہے، اس کے باوجود میں جناب وائس چانسلر صاحب کا اور اس جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے آج ان عزیز طالب علموں اور چمن اسلام کے ان شگوفوں کو خطاب کرنے کے لئے ایک

ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جس کا (صحیح یا غلط طریقہ پر حقیقتاً یا شہرت کی بناء پر) انتساب اور تعلق قدیم طرز تعلیم سے ہے، اس لئے میں وائس چانسلر صاحب کی وسیع النظری اور آپ کی جامعہ کی اس فراخ دامانی کا معترف ہوں کہ اسنے اس میں کوئی تفریق نہیں کی۔ میں علم، ادب، شاعری، فلسفہ، حکومت، کسی بھی اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی ''وردی'' پہن آئے وہی ''عالم'' اور ''دانشور'' ہے، اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر وردی نہ ہو وہ نہ مستحق خطاب ہے نہ لائق سماعت۔ بدقسمتی سے ادب و شاعری میں بھی یہی حال ہے کہ جو ادب کی دکان نہ لگائے اور اس پر ادب کا سائن بورڈ آویزاں نہ کرے اور ادب کی وردی پہن کر کے مشاعرے میں یا کسی ادبی محفل میں نہ آئے وہ ''بے ادبی'' کا مرتکب ہے۔ لوگوں نے ان پیدائشی ادیبوں اور شاعروں کا قصور بھی معاف نہیں کیا ہے جن کے جسم پر وہ وردی دکھائی نہیں دیتی ہو یا جن کو بدقسمتی سے ان وردیوں کے گودام سے کوئی وردی نہ مل سکی ہو، اگرچہ میں علم کی آفاقیت اور علم کی تازگی کا قائل ہوں، جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے، اگر خلوص ہے اور سچی طلب ہے تو خدا کی طرف سے فیضان میں کمی نہیں، بہرحال یہ ایک جرأت مندانہ قدم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی تقلید کی جائے۔ ہماری قدیم درسگاہوں میں جدید ماہرین کو دعوت دی جائے اور ہماری ان جامعات اور دانشگاہوں میں ان لوگوں کو یاد کیا جائے جنہوں نے خلوص کے ساتھ پڑھا ہے اور انسانوں کے پیدا کئے ہوئے علمی اور ادبی ذخیرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔

تعلیم کا اصل مقصد:

حضرات میں شکر گذار ہوں کہ مجھے اس باوقار دانشگاہ میں ایک ایسے مجمعے کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جا رہا ہے جو کل اسی ملک کی نہیں بلکہ شاید دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی کوئی اہم کردار ادا کرسکیں یا جن کے ہاتھ میں زمام کار آئے، کم از کم تعلیم و تربیت کی رہنمائی اور سربراہی کا ان کو موقع ملے۔

میں نے تعلیم کی غرض و غایت اور اس کی فائدے و نتیجہ کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے، لیکن میں یہاں صرف ایک حوالہ دوں گا۔

مشہور برطانوی ماہر تعلیم Sir Percy Neinn نے تعلیم کی بڑی جامع و بلیغ تعریف کی

ہے وہ کہتے ہیں کہ:

''تعلیم کا بنیادی خیال جو پورے نظام تعلیم پر حاوی ہونا چاہئے یہ ہے کہ تعلیم اس کوشش کا نام ہے جو بچوں کے والدین اور سرپرست اور نظریہ حیات پر (جس پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں) اپنی نئی نسل کو تیار کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ ''مدرسہ'' کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی طاقتوں کو جو اس نظریہ حیات سے وابستہ ہیں طالب علم پر اثر ڈالنے کا موقع دے اور وہ طالب علم کو ایسی تربیت دے جو اس قوم کی زندگی کی تسلسل و ترقی میں طالب علم کی دستگیری کرے اور اس کے ذریعہ وہ مستقبل کی طرف اپنا سفر جاری رکھ سکے۔

میں نے تعلیم کی تعریف کے سلسلہ میں جو کوششیں دیکھی ہیں اور جو عبادتیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ جامع اور عملی تعریف ہے۔ تعلیم کیوں دی جاتی ہے؟ اور تعلیم پر اعلیٰ صلاحیتیں اور قوم کی توانائیاں فیاضی کے ساتھ اور ایسے منظم طریقے پر کیوں صرف کی جاتی ہیں؟ کیا اس لئے کہ وہ تعلیم ایک خلیج پیدا کردے اس قوم کے معتقدات، مقاصد اور علمی و تہذیبی سرمایہ اور ان چیزوں کے درمیان جو اس کو عزیز ہیں، جو خیالات اس کو عزیز ہیں، اور عزیز ہونے کے لئے شرط نہیں ہے، جو چیز جس کو عزیز ہو، یہاں یہ بحث نہیں اٹھائی جاسکتی کہ وہ چیزیں عزیز بنانے کے قابل ہیں یا نہیں، لیکن جو چیزیں اس کو عزیز ہیں، جو عقائد ان کو عزیز ہیں، جو خیالات اس کو عزیز ہیں، جو اقدار جو ویلیوز اور جو تصورات و معتقدات اور جو افکار اس کو عزیز ہیں، جو ذخیرہ اس کو اپنے اسلاف سے ملا ہے، تعلیم کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ پیدا کرے اور قوم کی نئی نسل کی طرف اس ذخیرہ کو منتقل کرے جو اس قوم کو عزیز ہے اور جس پر اس کے اسلاف کی بہترین طاقتیں اور طویل ترین مدت صرف ہوئی ہے اور جن کے لئے بعض اوقات وہ قوم نبرد آزما ہوئی اور اس نے اپنی جان کی، اپنی عزت کی، آبرو کی بازی لگادی ہے، یہاں یہ بحث بڑی بے موقع اور بڑی غیر ہمدردانہ بحث ہے کہ ان قوموں نے ان اقدار کے لئے کیوں جنگ کی، تعلیم یہ سرمایہ نہ صرف منتقل کرے اور طوطے کی طرح اس کو رٹا دے بلکہ اس کو اس کے قلب و دماغ میں جاگزیں کردے، اس کا ذہن، اس کا ذوق اس کو قبول کرلے اور جذب کرلے، وہ اس کے لئے خارجی اور اجنبی چیز نہ ہو بلکہ وہ اس کے لئے ایک داخلی چیز بن جائے اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مزاج بن جائے۔

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی:

میں سمجھتا ہوں کہ یہ تعریف بہت جامع ہے۔لیکن جب ایسی ملت کا معاملہ ہو کہ وہ عقائد اور وہ اقدار اس کے اپنے بنائے ہوئے اور پیدا کئے ہوئے نہ ہوں، بلکہ ان کا سرچشمہ وحی الٰہی ہو، ان کا سرچشمہ کلام الٰہی ہو، ان کا سرچشمہ نبوت ہو، ان کا سرچشمہ وہ علم غیب ہو اور وہ علم ازلی ہو جس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا، تب ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔اب اگر کوئی نظام تعلیم یہ خدمت انجام دیتا ہے، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، ارادی طریقے پر یا غیر ارادی طریقے پر، غفلت کی بناء پر یا کسی بڑی سازش کے ماتحت، وہ سازش اس ملک کے اندر ہوئی ہو یا اس ملک کے باہر ہوئی ہو کہ اس نظام تعلم کے ساختہ پرداختہ حضرات کا عقیدہ ان تمام عقائد اور اقدار سے اٹھ جائے یا متزلزل ہو جائے، اس کی چولیں ہل جائیں اور وہ دائمی شک میں، تردد میں مبتلا ہو جائیں، وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں اور انفرادی زندگی کی حد تک نہیں بلکہ یہ کشمکش افرادی حدود سے تجاوز کر کے اسی ملت کے میدان زندگی میں کارفرما ہو، وہ اس کو متاثر کر رہی ہو اور ایک بڑی خونریز کشمکش، ایک بڑی خونریز جنگ برپا ہو جائے۔اس تعلیم یافتہ نسل کے درمیان اور ان اقدار کے مرمیان، ان مفاہیم کے درمیان اور ان عقائد کے اور خیالات کے درمیان، میں اسلام کو ایک ترکے (LEGACY) حیثیت سے نہیں مانتا اور اس کو اسلام کی بڑی تعریف نہیں سمجھتا۔اس لئے Hertiage ɔf Isam اور Legacy of Islam پر جو کتابیں پڑھی گئی ہیں ان کا زیادہ قائل نہیں ہوں، میں اسلام کو ایک پیغام حیات سمجھتا ہوں، میں اسلام کو زمانہ کے ساتھ چلنے والا نہیں بلکہ زمانہ سے آگے چلنے والا، زمانہ کا رہبر، زمان کا رفیق اور شریک کارواں ہی نہیں بلکہ اس کا محتسب اور اتالیق (GAURDIAN) سمجھتا ہوں، اس لئے جب غیر ارادی طریقے پر یا اتفاقاً یا کسی سازش کے ماتحت کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ یہ نتیجہ پیدا کرے کہ اس کی نسل ان تمام اقدار کے بارے میں، ان تمام عقائد و خیالات کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جائے، اس کا یقین اس سے اٹھ جائے اور وہ اس کو ایک طفل تسلی یا ڈھکوسلا سمجھنے لگے یا کم سے کم اس کو ان اقدار پر اس طرح یقین نہ ہو کہ وہ ان کی حمایت کرے، سینہ سپر ہو، ان کے لئے کبھی نبرد آزما ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ تعلیم صرف انتشار کا باعث ہے۔

اسلامی ملک کا معاملہ زیادہ اہم ہے:

جب میں یہاں آپ کے سامنے خطاب کر رہا ہوں تو میرے سامنے تمام اسلامی ممالک ہیں، میرے سامنے ترکی ہے، میرے سامنے مصر و شام و عراق ہیں اور میرے سامنے مملکت سعودیہ عربیہ بھی ہے جہاں ابھی چند ماہ پہلے ایک آل ورلڈ اسلامک ایجوکیشن کانفرنس (ALLWORLD ISLAMIC EDUCATION CONFERENCE) ہوئی تھی۔ جس میں یہاں سے احسان رشید صاحب اور اے کے بروہی صاحب بھی گئے تھے۔ میں ہندوستان کی طرف سے آیا تھا۔ وہاں میں نے جو پیپر (PAPER) پڑھا تھا، اس میں، میں نے اس چیز کا اظہار کیا تھا کہ معاملہ کہیں زیادہ سنگین اور نازک ہو جاتا ہے جب کسی اسلامی ملک کا معاملہ ہو۔ اسلامی ملک میں وہ مسلمان آبادی ہے جو اپنی ایک شخصیت رکھتی ہے، ایک (Personality) رکھتی ہے، اس کی ایک ملی شخصیت ہوتی ہے، اس کے پاس ایک پیغام ہے، اس کو دنیا میں ایک فرض انجام دینا ہے، اگر تعلیم وہاں اس نسل میں انتشار پیدا کر دیتی ہے اور صرف یہ خدمت انجام دیتی ہے کہ وہ نسل جب کسی جدید دانشگاہ سے پڑھ کر نکلتی ہے تو وہ اپنے معتقدات سے بیگانہ بن جاتی ہے، وہ ایک نئی قوم بن جاتی ہے جو کسی طریقے سے اس ملک میں فٹ نہیں ہو سکتی اور وہاں کے لئے وہ ایک اجنبی عنصر بن جاتی ہے۔ اس سے ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے، وہاں کی زندگی میں ایک نیا مسئلہ وجود میں آ جاتا ہے، ایک نئی گرہ وہاں کے رشتہ حیات میں پڑ جاتی ہے، وہ ملک یا وہ ملت جس کے معتقدات اور جس کے اقدار حیات اور نقطہ فکر کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے، اگر وہاں کی تعلیم کا ثمرہ اور نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ایک ذہنی انتشار، ایک خونریز جنگ اور ایک زبردست کشمکش اس نئی نسل کے درمیان اور اس کے خاندانوں کے درمیان، اس معاشرہ کے درمیان جس کا اس سے تعلق ہے، ان نونہالوں اور نوجوانوں کے درمیان، اس کی پوری تاریخ اور پورے کارنامہ، اس کے منصب و مقام کے درمیان جو خدا نے اس کو عطا کیا ہے اور مسلمان کا پیغام اور اس کے انجام دینے کا جو کام ہے، اس کے درمیان ایک کشمکش پیدا ہو جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی خدمت نہیں ہے، Service نہیں ہے...... بلکہ بدخدمتی (Disservice) ہے۔

کسی اسلامی ملک کی جامعہ کا اولین فریضہ:

آپ مجھے معاف کریں۔ میرا اشارہ کسی خاص جامعہ کی طرف اور کسی خاص جامعہ کے ذمہ داروں کی طرف نہیں ہے۔ میں بالکل اصولی حیثیت سے گفتگو کررہا ہوں کہ ایک جامعہ جو کسی اسلامی ملک میں قائم ہو، اس کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ان اقدار اور عقائد و خیالات پر، اس تہذیب پر، اس پیغام پر، ان امتیازات و تشخصات پر یقین پیدا کرے جس کی وہ قوم حامل ہے اور وہ یقین محض عامیانہ یقین نہ ہو، ایک ایسے لے مین (LAYMAN) یقین نہ ہو، ایک راستہ چلنے والے آدمی کا یقین نہ ہو، بلکہ ایک پڑھے لکھے انسان کا، ایک اسکالر کا یقین ہو، جس کا دل جتنا مطمئن ہو، اسی درجہ اس کا دماغ بھی مطمئن ہو، یہ نہیں کہ:۔ ع

"قلب او مومن دماغش کافر است"

جیسا کہ اقبال نے ایک مغربی فلسفی کے متعلق کہا، جس طرح فرد اور جماعت کے درمیان کشمکش جائز نہیں، اسی طرح فرد کی زندگی میں فرد کے قلب و دماغ کے درمیان بھی کشمکش درست نہیں، اور نہ اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہ کشمکش اگر کوئی جامعہ یا جامعہ کا نصاب یا جامعہ کا کوئی طریقہ کار اور نظام پیدا کرتا ہے تو یہ کشمکش اس ملک کے لئے خوش قسمتی نہیں بلکہ بدقسمتی ہے۔

قلب اور دماغ دونوں کا اطمینان ضروری ہے:

آپ نے مجھے موضوع دیا ہے کہ اسلامی جامعات کا مقصد و منہاج کیا ہونا چاہئے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا سب سے بڑا مقصد و منہاج یہ ہے کہ وہ ان چیزوں پر یقین پیدا کرے، وہ یقین جو علم اور مطالعہ کے راستہ سے ہوتا ہے، وجدان کے راستہ سے ہوتا ہے، دماغ کے سکون کے راستہ سے ہوتا ہے، تقابلی مطالعہ کے راستہ سے ہوتا ہے۔ اگر یہ یقین کسی شخص کو قلبی طور پر حاصل ہوجاتا ہے، لیکن اس کا دماغ اس سے مطمئن نہیں ہوتا، وہ اپنے دماغ کو بہلاتا رہتا ہے، پھسلاتا رہتا ہے، وہ اپنے دماغ کو بیدار نہیں ہونے دیتا، جس طرح بعض غیر مسلم ملتوں کا حال ہے کہ وہ اپنے مذہب کی بقاء اور اپنے مذہب کی ترقی اس میں سمجھتی ہیں کہ علم کا شعور جاگنے نہ پائے، اس مذہب کے حاملین یا اس مذہب کے حلقہ بگوشوں کا شعور جاگنے نہ پائے، وہ اپنے

شعور کی زندگی و بیداری میں اپنے مذہب کی موت سمجھتے ہیں، اس لئے کلیسا اور علم میں وہ کشمکش پیش آئی جس کی خونریز کہانی اور دلدوز کہانی ڈریپر کی مشہور کتاب میں آپ پڑھتے ہیں۔ یہ کشمکش اس لئے پیدا ہوئی کہ کلیسا کی بنیاد اس پر تھی کہ انسانی شعور جتنا سوتا رہے اچھا ہے۔ اسے لوریاں دے کر اور سلانا چاہئے، اور انسان کا علم جتنا محدود ہے اچھا ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ علم سے بالکل عاری اور محروم ہو۔ اس وقت تک مسیحیت کی زندگی ہے، اسی وقت تک بائیبل پر ایمان راسخ ہوگا۔ عہد عتیق کی کتابیں بعض ایسی باتیں پیش کرتی ہیں کہ جن کی علم جدید تصدیق نہیں کرتا بلکہ اس کی نفی کرتا ہے، اس لئے کلیسا اپنی خیریت اسی میں سمجھتا تھا کہ مسیحی کا شعور بیدار نہ ہونے پائے اور علوم ترقی نہ کریں، اس لئے وہ علم کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا، علم کے لئے وہ سنگ راہ ثابت ہوا بلکہ اہل کلیسا نے علم کو اپنے مد مقابل اور حریف سمجھ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ علم تو انسان کی فطرت کا ایک تقاضا تھا، علم تو انسان کے اندر ایک جذبہ تھا، علم تو خدا کی ایک نعمت تھی، علم تو دنیا کی ایک ضرورت تھی، علم تو خدا نے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ مٹنے اور مرجھانے کے لئے نہیں پیدا کیا تھا۔ صداقتیں مٹ نہیں سکتیں، نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کو علوم کے مقابلہ میں اور لوگوں کے طلب علم اور شوق جستجو کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ یہ وہ منحوس واقعہ تھا جو اگرچہ مسیحی یورپ میں پیش آیا لیکن اس کا اثر تقریباً تمام دنیا اور تمام مذاہب پر پڑا اور بہت سے لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ علم و عقل اور علم و مذہب کی ترقی ساتھ نہیں چل سکتی، تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ تھوڑے وقفے کے لئے بعض اسلامی ملکوں میں بھی یہ غلط خیال پیدا ہوا، لیکن اسلام چونکہ اس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، اسلام کی روح اس کی منکر اور اس سے باغی ہے، اس لئے یہ چیز زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکی۔ اور یہ مصنوعی کشمکش عالم اسلام میں قائم نہ رہ سکی۔ مسیحی یورپ کے اثر سے پیدا تو ہوئی لیکن بہت جلد مغربی ممالک کا یہ سایہ دور ہو گیا۔

علم کی قسمت قلم سے وابستہ:

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی یونیورسٹیوں اور ان اسلامی جامعات کا ایک فرض تو یہ ہے کہ علم و دین میں یہ خلیج پیدا نہ ہونے پائے جو مسیحی یورپ میں یا ان مذاہب میں جن کا علم و عقل کے

ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا بلکہ وہ علم وعقل سے بچ کر اور کترا کر اور بلکہ اس کی آنکھوں میں دھول ڈال کر پیدا ہوئے اور اسی حالت میں وہ پھلے پھولے، وہاں تو اس بات کی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن جس نے سب سے پہلے اپنے دین کا اور اپنی دعوت کا اور اپنے علم کا اعلان اس طرح کیا:

اقرأ باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم

(اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

جس نے اپنی وحی کی پہلی قسط میں اور اس باران رحمت کے پہلے چھینٹے میں بھی اس قلم کو، اس حقیر قلم کو فراموش نہیں کیا جس نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ علم کی قسمت قلم سے وابستہ ہے۔ غار حرا کی اس تنہائی میں جہاں ایک نبی امی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود نہیں سیکھا، جو قلم کے فن سے واقف نہیں تھا، آپ خیال کیجئے کہ دنیا میں، دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے اور اس بلندی کا تصور ہوسکتا ہے کہ نبی امی پر، ایک امت امی کے درمیان ایک ایسے ملک کے درمیان کہ جہاں علم کا ہنر عام نہیں تھا، جامعات اور دانش گاہیں درسگاہیں تو بڑی چیز ہیں، جہاں حرف شناسی بھی نہیں تھی، وہاں اس نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اور پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے اور آسمان وزمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوتا ہے، اس کی ابتدا ''اعبد'' سے نہیں، اس کی ابتدا ''صل'' سے نہیں بلکہ اس کی ابتدا ہوتی ہے ''اقرا'' سے جو خود پڑھا ہوا نہ تھا اس پر جو وحی نازل ہوتی ہے اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ ''اقراء'' اس لئے کہ تمہیں جو امت دی جانے والی ہے وہ امت صرف علم کی سچی طالب نہ ہوگی بلکہ وہ علم آموز ہوگی، وہ علم کی اس دنیا میں اشاعت کرنے والی ہوگی، جو دور تمہیں دیا جاتا ہے اصلاح اور ہدایت کا، جو دور تمہارے حصے میں آیا ہے وہ دور امیت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور وحشت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور جہالت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دور تخریب کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا، حکمت کا دور ہوگا، تعمیر کا دور ہوگا، انسان دوستی کا دور ہوگا، وہ دور ترقی کا دور ہوگا، اس لئے پہلی بار

دنیا میں، مذاہب کی تاریخ میں پہلا تجربہ تھا (اگر اس کو تجربہ کہنا صحیح ہو) کہ اس نبی امی پر ایک امی قوم کے درمیان جو وحی نازل ہو رہی ہے اس کی ابتدا ہوتی ہے "اقرا" (پڑھو) سے **بسم ربک الذی خلق**۔ بڑی غلطی یہ تھی کہ علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ گیا تھا، اس لئے علم سیدھے راستے سے ہٹ گیا تھا، اس لئے اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جہاں جوڑا گیا، جب علم کو یاد کیا گیا، علم کو یہ عزت بخشی گئی تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی متنبہ کیا گیا کہ اس علم کی ابتدا اسم رب سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ یہ علم اس کا دیا ہوا ہے، اس کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کرسکتا ہے۔ یہ جو جملے میں سنا رہا ہوں یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آفریں، انقلاب انگیز اور صاعقہ آسا آواز ہے، جو ہماری دنیا کے کانوں نے سنی تھی جس کا کوئی تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اگر دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو یہ دعوت دی جاتی کہ آپ لوگ قیاس کیجئے اور یہ بتائیے کہ جو وحی نازل ہونے والی ہے، اس کی ابتدا کس چیز سے ہوگی؟ اس میں کس چیز کو اولیت دی جائے گی؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایک آدمی بھی جو اس امی قوم اور اس کے مزاج اور دماغ سے واقف تھا وہ سب کچھ کرسکتا تھا، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو پہلی وحی نازل ہوگی وہ "اقراء" کے لفظ سے شروع ہوگی۔ پڑھو "اقراء" قرأت کا لفظ ہے، یہاں خالص علم کا بھی لفظ نہیں ہے، یعنی اس کا تعلق کاغذ سے بھی ہے، اس کا تعلق نقوش سے بھی ہے اور اس کا تعلق قلم سے بھی ہے، وہ علم نہیں جو لدنی طریقہ پر آتا ہے بلکہ وہ علم جو قلم کے ساتھ ہے، کاغذ کے ساتھ ہے، صحیفوں کے ساتھ ہے، کتب خانوں کے ساتھ ہے، تجربوں کے ساتھ ہے، ذہانتوں کے ساتھ ہے۔ "اقراء بسم ربک الذی خلق۔"

یہ دین علم سے الگ نہیں ہوسکتا:

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دین کا مزاج بتادیا گیا کہ یہ دین کبھی علم سے الگ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ سب سے پہلے جو پیغام دیا گیا اس میں زور دیا گیا کہ "پڑھو" تو مسلمان بے پڑھے کیسے رہ سکتا ہے۔ وہ مسلمان حقیقی مسلمان نہیں جو علم سے اپنا رشتہ توڑ لے [illegible] اسلام کی [illegible] ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ پہلی بات تو یہ انقلاب [illegible] الذی خلق اپنے رب کے نام سے پڑھو [illegible]

بہت طویل ہے، بہت پر پیچ ہے، پرخطر ہے، قدم قدم پر قافلے لوٹنے والے ہیں، قدم قدم پر بڑی بڑی کھائیاں ہیں۔ قدم قدم پر گہرے دریا ہیں، قدم قدم پر سمندر ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں، اس لئے اس میں ایک رہبر کامل کی رفاقت ہونی چاہئے اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات ہے، اس لئے **اقراء بسم ربک الذی خلق** پڑھو، لیکن وہ مجرد علم نہیں، وہ علم نہیں جو بیل بوٹے بنانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض کھلونوں کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض دل بہلانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو ایک کو دوسرے سے لڑانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو اپنے معدہ کے رقبہ کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھاتا ہے بلکہ **اقراء بسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقراء وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم** پڑھو تمہارا رب بڑا کریم ہے، وہ تمہاری ضرورتوں سے، تمہاری کمزوریوں سے کیسے ناآشنا ہوسکتا ہے؟ **اقراء وربک الاکرم الذی علم بالقلم**، آپ خیال کیجئے کہ قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ اس غار حرا کی پہلی وحی نے بھی وہ قلم جو شاید ڈھونڈنے سے بھی مکہ میں کسی گھر میں نہ ملتا، مجھے اس میں شک ہے کہ وہ قلم اگر آپ اسے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو معلوم نہیں کسی ورقہ بن نوفل کے گھر میں ملتا یا فلاں کاتب کے یہاں جو عجم سے کوئی چیز سیکھ کر آیا ہو، اس کے گھر میں ملتا اور وہ قلم جس کا استعمال عربی شاعری میں بھی بہت کم ہے، آپ اگر عرب شعراء کے دیوان پڑھیں، پڑھتے ہی چلے جائیں تو اس میں قلم کا نام آپ بہت کم پائیں گے۔

سب کا خلاصہ، علم الانسان مالم یعلم:

اور پھر ایک بہت بڑی انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بیان کی کہ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ ''**علم الانسان مالم یعلم**'' سائنس کیا ہے؟ ''**علم الانسان مالم یعلم**'' ٹیکنالوجی کیا ہے؟ ''**علم الانسان مالم یعلم**'' انسان چاند پر جارہا ہے یہ کیوں ہے؟ ''**علم الانسان مالم یعلم**'' یہ خلا کو ہم نے طے کرلیا ہے اور ہم نے دنیا کی وسعتیں سمیٹ لی ہیں اور دنیا کی طنابیں کھینچ لی ہیں اور سورج کی شعاعوں کو بقول اقبال گرفتار کرلیا ہے اور ستاروں کے درمیان

اپنی رہگذر پیدا کی ہے، یہ کیا ہے؟ "**علم الانسان مالم یعلم**" علم اشیاء کی جہانگیری۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جس امت کی اور جس پیغام کی بنیاد قرأت سے پڑی، فن قرأت سے پڑی اور قلم کے ذکر سے پڑی، اس ملت کا، اس قوم کا، اس امت کا ساتھ کبھی قلم سے نہیں چھوٹ سکتا، اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اب اس امت کے لئے جو دانش گاہ تعمیر کی جائے، جو نظام تعلیم مرتب کیا جائے اس میں جو بنیادی چیز ہو، جو اصل کارفرما اور رہنما اصول ہے، وہ یہ ہے کہ یہ علم، یہ نظام تعلیم ان اقدار پر، ان حقائق پر اور ان عقائد پر ایمان کو راسخ کرے اور یہ پختگی صرف دل کی راہ سے نہیں بلکہ دماغ کی راہ سے بھی ہو، یعنی دل و دماغ دونوں مطمئن ہونے چاہئیں، اگر دل و دماغ دونوں مطمئن نہیں ہیں تو فرد کی زندگی میں کشمکش پیدا ہوگی اور یہ کشمکش پھر وسیع ہوتی جائے گی۔ پہلے وہ اپنے اندر ایک دوسرے سے دست بگریباں پھر جماعت سے دست بگریباں ہوگا، نئی نسل اپنے معاشرہ سے دست بگریباں ہوگی، اپنے دین سے دست بگریباں ہوگی اور بہترین توانائیاں اس نسل کو اس ملبے کو مٹانے میں، اس کھنڈر کو دور کرنے میں صرف ہوں گی، پہلے اس ملبے کو ہٹاؤ پھر اس کے بعد تعمیر کرو اور تمام توانائیاں اس پر صرف ہو جائیں گی۔ ہماری بعض مسلم قوموں کے رہنماؤں نے اس طریقہ پر کام کرنا شروع کیا کہ پہلے ماضی کا ملبہ ہٹائیں، پہلے حقائق وعقائد کا ملبہ ہٹائیں پھر اپنی دعوت پیش کریں، اس میں ان کی عمر بیت گئی اور ان کو جو وقت دیا گیا تھا کام کرنے کا وہ ختم ہو گیا اور وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے، تو جامعات کا اصل مقصد یہ ہے کہ ان عقائد اور حقائق پر یقین کو استوار کریں اور صرف قلب کی راہ سے نہیں بلکہ دماغ کی راہ سے بھی کہ ایک طرف دل ان کا حلقہ بگوش ہو اور ان کو اپنی تہہ میں، اپنی گہرائی میں جگہ دے تو دوسری طرف دماغ کا کام یہ ہو کہ وہ ان کے لئے دلائل فراہم کرے اور وہ بھی اس طرح سے مطمئن ہو جس طرح سے دل مطمئن ہو، اس لئے اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی کامیابی یہ سمجھتا ہوں، خاص طور سے مسلمانوں کے سلسلہ میں کہ وہ ان حقائق پر، ان اقدار پر، اس نسل کا، اس تعلیم یافتہ نسل کا، ان اسکالرز کا، ان یونیورسٹی گریجویٹس کا، فلاسفرس کا، مفکرین کا یقین مضبوط کر دے اور ان کو اس قابل بنا دے کہ وہ دماغ سے ان کے لئے دلائل فراہم کریں، دنیا میں جو علمی ذخیرہ پرانا یا نیا پھیلا ہوا ہے، وہ اس کو اپنے اس دعوے کے ثبوت

میں یا اپنے اس مقصد کی تکمیل میں استعمال کر سکے اور استعمال کرنے کا سلیقہ رکھے، میرے نزدیک ایک جامعہ کی بہترین تعریف یہ ہے۔

سیرت سازی:

جامعات کا دوسرا کام سیرت سازی ہے، یونیورسٹی ایک کیریکٹر بنائے جو اپنے ضمیر کو بقول اقبال ایک کف جو کے بدلے میں بیچنے کے لئے تیار نہ ہو، آج کل کے خلافِ اسلام فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے، وہ اگر کم قیمت پر نہیں خریدا جاسکتا تو زیادہ قیمت پر خریدلیا جائے گا، ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے، وہ کیریکٹر بنائے، وہ ایسے طالب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کرسکیں، جس کو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تخریبی فلسفہ، کوئی غلط دعوت، کوئی حکومت ان کو کسی دام خرید نہ سکے اور جو یہ کہہ سکیں کہ:

> برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
> کہ عنقارا بلند است آشیانہ

اور اقبال نے کہا ہے:

> دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
> فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم
> اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
> جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دوسرا فرض یہ ہے کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں وقف کردیں، جو قربانی [illegible]

[illegible]

ملک، باعزت ملت، صاحب پیغام ملت بنانے میں صرف کرے، یہ دو چیزیں ہیں، ایک تو یہ کہ دل و دماغ کو وہ غذا دی جائے، وہ روشنی دی جائے کہ جس سے دل و دماغ دونوں مل کر باہمی تعاون کے ساتھ، ایک دوسرے کی رفاقت کے ساتھ ان حقائق اور عقائد پر ایمان کو پختہ کریں اور دوسروں کو سمجھنے، قائل ہونے کا موقع دیں اور انہیں مطمئن کریں۔

آپ یہ دیکھیں کہ آپ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کتنی تعداد میں پیدا کر رہے ہیں، میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں کتنی یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہوگئی ہے بلکہ قابل قدر بات یہ ہے کہ علم کے شوق میں، ریسرچ کی راہ میں اور علم کو پھیلانے کے جذبہ سے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں۔ اپنی قوم کو صاحب شعور، مہذب اور باضمیر قوم بنانے کے لئے کتنی تعداد میں وہ نوجوان موجود ہیں جو اپنی ذاتی سربلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کرکے اس مقصد کے لئے اپنے کو وقف کرتے ہیں، اصل معیار یہ ہے اور یہی معیار ہونا چاہئے، کتنے نوجوان ایسے ہیں کہ جو دنیا کی تمام آسائشوں اور ترقیوں سے آنکھیں بند کرکے کسی گوشہ میں ٹھوس علمی کام کر رہے ہیں، ملت کی سربلندی کے لئے یا کسی نظریہ کی دریافت کے لئے یا کسی علمی تحقیق کے لئے اور اپنے ملک کو طاقتور بنانے کے لئے۔

یہی دو حقیقی مقصد ہیں، باقی صرف پڑھا لکھا دینا اور ملازمت کے قابل بنا دینا میں سمجھتا ہوں اب کسی جامعہ کے لئے قابل تعریف نہیں اور میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے وائس چانسلر اور جو اس جامعہ کی رہنمائی کرنے والے ہیں وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے کہ ہماری جامعہ کا مقصد صرف یہ رہ جائے کہ پڑھے لکھے نوجوان ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہو جائیں اور محکموں، کارخانوں اور دکانوں میں فٹ ہو جائیں اور پتہ نہ چلے کہ وہ کہاں گئے۔

مقصود ہنر سوزِ حیات ابدی ہے:

اس جامعہ کا مقصد جو ایک ایسے نازک ملک میں، ایسے نازک دور میں قائم ہوا ہے یہی ہونا چاہئے کہ وہ اس انتشار کو رفع کرے جو تمام ممالک اسلامیہ میں تقریباً سو برس سے نمایاں

ہے۔ جب مغربی تہذیب اور مغرب کی سیاسی یلغار شروع ہوئی تو اس وقت ہمارے عقائد اور حقائق کی بنیادیں ہل گئیں اور ایک ایسی ذہنی کشمکش پیدا ہوئی کہ اس پر بہترین توانائیاں داعیان مذہب کی صرف ہو رہی ہیں اور یہ ایک ایسی غیر فطری صورت حال ہے کہ جس کو جلد ختم ہونا چاہئے۔ اب توانائیاں خالص تعمیری مقاصد اور ملک کی حفاظت و ترقی پر صرف ہونی چاہئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب، شاعری، فنون لطیفہ، حکمت، فلسفہ، تصنیف و تالیف سب کا مقصد یہ ہے کہ آپ میں زندگی، نیا یقین پیدا ہو اور آپ کے ذریعہ سے ملت میں ایک نئی زندگی پیدا ہو۔

میں اس وقت شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبال کے شعر پڑھوں گا جو انہوں نے اگرچہ کسی ادیب یا شاعر سے مخاطب ہو کر کہے لیکن یہ ہم پر پوری طرح صادق آتے ہیں:

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
مقصود ہنر سوزِ حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

آج ملت اسلامیہ پاکستان کو ایک ضرب کی ضرورت ہے اس لئے کہ قوموں کی کشتی اس کے بغیر ساحل تک نہیں پہنچ سکتی، جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں وہ ایک معجزہ کے طالب ہیں، یہ معجزہ اسلام کے ابدی پیغام میں مضمر ہے:

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

اس وقت پاکستان کو ایک ضرب کلیمی کی ضرورت ہے بلکہ تمام عرب اور اسلامی ملکوں میں بھی زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر ہے۔ اسلام کے عقائد و حقائق پر ایک نیا یقین، ایک نیا اعتماد، ایک نیا سرور، ایک نیا نشہ، ایک نیا ولولہ عمل، نئی جرأت اندیشہ، ایک نئی لذت، کردار، ایک نیا جذب دروں پیدا کرے، جس سے ان اونگھتی سوتی قوموں، آمادۂ زوال

قوموں، ان مرتعش قوموں کو جن کے قدم بھی ڈگمگا رہے ہیں، دل بھی ڈگمگا رہے ہیں، ان کو نئی زندگی، نئے جوش سے آشنا کریں۔ آپ کی ذمہ داری صرف آپ تک محدود نہیں ہے، برصغیر کے مسلمان تعداد کے لحاظ سے تمام عالم اسلام پر فائق ہیں، آپ فکری طور پر عالم اسلام کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھیں اور اسلام پر اعتماد پیدا کریں اور یہ ثابت کریں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں اسلام چل سکتا ہے، پاکستان ایک معمل ایک تجربہ گاہ ہے جو یہ ثابت کرے گا کہ اسلامی نظریات اس دور میں چل سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔

آخر میں، میں وائس چانسلر صاحب اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پوری سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ میری باتیں سنیں۔

زرخیز زمین مردم خیز خطہ

۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء کو زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں یہ تقریر کی گئی۔ جلسہ میں یونیورسٹی کے اعلیٰ عہدہ دار، اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ معززین شہر، علماء اور دانشوروں کی خاصی تعداد شریک تھی۔ اس یونیورسٹی میں زیرتعلیم عرب ممالک کے طلبہ کی فرمائش پر مقرر نے اس موضوع پر عربی میں بھی خطاب فرمایا۔

نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم امابعد

ملک کی عظمت کا حقیقی معیار:

اساتذۂ جامعہ، بزرگان محترم اور طلبائے محترم!

مجھے بڑی مسرت اور خوشی حاصل ہو رہی ہے کہ میں آپ کی اس یونیورسٹی میں جو اپنا ایک خاص کام اور مقام رکھتی ہے، اپنے رفقاء کے ساتھ حاضر ہوا ہوں، میں اس عزت افزائی کے لئے یونیورسٹی کے ذمہ داروں کا شکر گذار ہوں۔

کسی ملک کی ترقی اور اس کی بڑائی کا معیار صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں یونیورسٹیوں کی کتنی تعداد ہے، اس کی زمین میں زراعتی صلاحیت کتنی ہے، اس کے محاصل کتنے ہیں، اس میں کتنے سرمایہ دار پائے جاتے ہیں، اس کا معیار زندگی کتنا بلند ہے؟ بلکہ ملک کی عظمت کا حقیقی معیار یہ ہے کہ اس کے اہل علم میں بحث و تحقیق کرنے کا کتنا ذوق پایا جاتا ہے اور خالص فنی اور تحقیقی دانش گاہیں اور جامعات کتنی ہیں؟ اگر کوئی ملک سب کچھ رکھتا ہے، اس کے اندر قدرتی دولتوں کے بڑے بڑے ذخائر ہیں، فطری اور قدرتی وسائل بھی ہیں، لیکن اس میں ذوق تجسس نہیں ہے، تحقیق کا خالص علمی اور سنجیدہ ذوق نہیں پایا جاتا، ایسے لوگ کافی تعداد میں نہیں ہیں، جو اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہوں، تعریف و تحسین سے بے نیاز ہو کر تحقیقی کام کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کے لئے جو اصل مقصود ہے اور اس کی ترقی اور بہبودی کے لئے وہ دن

رات کام میں لگے رہتے ہیں۔ ان کو حکومت یا کسی ادارے سے انعام کا کوئی لالچ نہیں ہے، وہ تھکتے ہوں اور تھکنے ہی سے ان کو راحت ملتی ہو، تعطل اور بیکاری اور آرام ان کے لئے سزا ہو، ان کے لئے اس سے بڑھ کر سزا نہ ہو کہ ان کو تحقیقی کام کرنے سے روک دیا جائے، کام ہی ان کی غذا ہو، دوا ہو، ان کا انعام ہو۔

یہاں آ کر خوشی حاصل ہوئی:

یہاں یہ دیکھ کر اس ملک میں ایک ترقی یافتہ زرعی یونیورسٹی پائی جاتی ہے اور یہاں بیرونی ممالک خاص طور سے عرب ممالک کے نوجوان اپنے ملکوں سے پڑھنے اور تحقیقات کرنے کے لئے آتے ہیں، بڑی مسرت ہوئی۔ اس سے ایک مسلمان اور ایک طالب علم کا دل ضرور خوش ہونا چاہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمان بھی ہوں، طالب علم بھی ہوں، اس لئے مجھے یہاں آنے سے قدرتاً خوشی حاصل ہوئی۔

اگر میں کوئی بڑا میوزیم دیکھتا یا کسی بڑے سے بڑے ایوان میں میری ضیافت وعزت افزائی کی جاتی تو مجھے وہ خوشی نہ ہوتی جو آپ کے اس دانش گاہ میں آ کر ہوئی۔

اپنی بہترین صلاحیت اس ملک پر صرف کریں:

مجھے امید ہے کہ جو نوجوان یہاں تعلیم پارہے ہیں وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اس ملک کے مفاد پر صرف کریں گے، بجائے اس کے کہ وہ اونچی تنخواہوں کی خواہش میں امریکہ اور یورپ جائیں، جن کا عام طور پر رواج ہوگیا ہے۔ میں پورے امریکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں کہ ہمارے مشرقی ممالک کے بہترین نوجوان، بڑے باصلاحیت افراد جو اپنے ملکوں کو بہت کچھ دے سکتے ہیں، اور یہ ملک ان کی ذرا سی کوشش سے اپنی زمین سے خزانے اگل سکتے تھے، انہوں نے اپنے اپنے ملکوں سے باہر میدان کا انتخاب کیا۔ اس سے ان افراد کا خواہ کتنا ہی بڑا فائدہ ہو، لیکن ان ملکوں کا بڑا نقصان ہوا کہ پڑھ لکھ کر جب کام کے آدمی بنے تو اغیار کی سرزمین میں پہنچ گئے، تاکہ اپنی جھولی بھریں، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اپنے ملکوں کی جھولی اپنی محنتوں سے، ان کے نتائج سے بھرتے، لیکن افسوس ہے کہ ہماری دولت اغیار کے کام آرہی ہے، اس

لئے میں اس ملک کے نوجوانوں سے اور عرب نوجوانوں سے بھی (مجھے امید ہے کہ وہ یہاں رہ کر اتنی اردو سمجھنے لگے ہوں گے کہ میری بات سمجھ لیں) یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی ذہانتیں، اپنی صلاحیتیں، اپنے مطالعے، اپنی تحقیقات کا اصل مستحق اپنے ملکوں کو سمجھیں، یہ بڑے افسوس کی بات ہے اور حب الوطنی اور غیرت اسلامی کے خلاف ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں سے ان ملکوں کو فائدہ پہنچائیں جنھوں نے تمام اسلامی ملکوں کو غلام بنا رکھا ہے، آج بالواسطہ یا بلاواسطہ سیاسی طور پر، اقتصادی طور پر، علمی اور فنی طور پر سب امریکہ اور روس کے دست نگر ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے دست نگر ہیں، اگر ہمارے نوجوان اپنی صلاحیتیں اپنی سرزمین پر صرف کریں تو وہ بہت کچھ عطا کر سکتے ہیں اور اس راستہ سے خدا سے، اپنے خالق سے بھی بہت کچھ لے سکتے ہیں۔

نظریات، فلسفوں اور علمی تحقیقات ومسلمات کا غلبہ جاری ہے:

مجھے امید ہے کہ نوجوان ان ملکوں کا مقابلہ کریں گے جو علمی تحقیقات کے ذریعہ اسلام کے قلب ودماغ پر حملہ آور ہیں، وہ زمانہ گیا کہ کوئی ملک کسی ملک کو غلام بنائے اور اگر اب بھی کہیں کسی کو اس کا شوق ہے تو وہ ایک قصہ پارینہ کی تقلید ہے، لیکن علمی نظریات، علمی تحقیقات اور علمی مسلمات کے نام پر جو باتیں پیش کی جاتی ہیں ان کا حملہ اسلام پر ہمیشہ جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ ایک زمانہ میں فلسفہ یونان کا حملہ تھا، اس زمانہ میں اسلام نے غزالی، باقلانی، شیخ الاسلام تیمیہ اور امام رازی پیدا کئے۔ اس کے بعد پھر مغربی استعمار نے تاریخ کی راہ سے مسلمانوں پر حملے شروع کئے۔ مثلاً یہ کہا جانے لگا کہ کتب خانہ اسکندریہ مسلمانوں نے جلایا ہے اور اس کو یورپ نے ایسی مسلمہ حقیقت کے طور پر پیش کیا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی سن کر گردن جھکا لیتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر میں نے اس کو ماننے سے ذرا بھی پس وپیش کیا یا انکار کیا تو میں ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ سمجھا جاؤں گا۔ پورے عالم اسلام پر اس کا جادو چل گیا تھا کہ مسلمان علم کی کیا سرپرستی کریں گے، علم کے سلسلے کو آگے بڑھائیں گے، وہ تو ایسے غیر روادار، ایسے علم دشمن ہیں کہ اپنے خلیفہ عمر فاروقؓ کے حکم سے کتب خانہ اسکندریہ کو آگ لگادی اور کہا کہ اگر یہ قرآن وحدیث کے مطابق ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہے اور اگر مطابق نہیں ہے تو اس کا جل جانا ہی بہتر ہے۔ یورپ کے عیسائی مصنفین نے یہ بات کہی اور ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے تسلیم

کرلیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ برصغیر میں مولانا شبلی نعمانیؒ پہلے مورخ و ناقد تھے جنہوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا اور مستقل رسالہ لکھا اور ثابت کردیا کہ یہ محض افسانہ اور مسیحی تعصب و جہالت کا کرشمہ ہے جس طرح ریاضی کی حقیقت ہوتی ہے۔ دو دو چار، اسی طرح انہوں نے تاریخی دلائل سے ثابت کردیا کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت اور مسلمانوں کے داخلہ مصر سے پہلے جل چکا تھا اور یہ متعصب عیسائیوں کا کارنامہ تھا۔ اسی طریقہ سے تاریخ کے راستے سے جو خیالات پیدا ہوئے اور جنہوں نے مسلمانوں کے ایمان و عقیدہ کو متزلزل کرنا شروع کردیا جیسے اورنگزیب عالمگیرؒ کے متعلق مشہور کیا گیا کہ وہ ستم گر تھا، ہندو کش تھا، ظالم تھا، جزیہ ظالمانہ ٹیکس ہے۔ اس کا جواب بھی مولانا شبلیؒ نے دیا اور معترضین کا منہ بند کردیا۔

علم کسی منزل پر رکتا نہیں:

جب اسلام پر حملے سیاسیات کی راہ سے، اقتصادیات کی راہ سے شروع ہوئے تو اسی تحت بر اعظم کے مسلمان فضلاء کے قلم چلے اور انہوں نے ان فلسفوں کا، ان نظریات کا علمی محاسبہ کیا، علم کی تعریف یہ ہے کہ وہ کبھی کسی منزل پر جا کر رکتا نہیں اور اس میں برابر ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے، اس لئے یہ کہنا کہ یہ حرف آخر ہے، یہ علم کی حیثیت و منصب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

اب آپ حضرات کا فرض ہے کہ علم نباتات کے ذریعہ جو غلط نظریات آرہے ہیں اور جو اسلام کے اور قرآن مجید کے عقائد، ان کی تعلیمات سے متصادم ہیں، آپ ان کا بطلان ثابت کریں یا قرآن شریف نے جن چیزوں کی نقاب کشائی کی ہے، مثلاً قرآن کہتا ہے کہ "ومن کل شیءٍ خلقنا زوجین" اور کہتا ہے کہ نباتات میں بھی ازدواج ہے، اس میں بھی جوڑا ہے، نر اور مادہ نباتات میں بھی ہوتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ قرآن سے پہلے بھی کسی نے اس کا دعویٰ کیا ہو اور یہ بات پیش کی ہو، اب آپ اس کی صداقت ثابت کریں اور بتائیں کہ اس کتاب کا، اور اس نبی امّی کا بڑا معجزہ ہے کہ فن نباتات سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ ہر چیز میں نر و مادہ ہوتے ہیں اور خاص طور سے نباتات کے متعلق تو سورۂ رعد کی ابتداء میں ایسی حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے، یہ حقیقتیں تو ایسی ہیں کہ ان پر مستقل ریسرچ کی جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی یہ جامعہ اس بات کی پورے طور پر مستحق ہے کہ اس پر کام کرے اور وہ کام لوگوں

کے سامنے اور پوری دنیا کے سامنے آئے۔

کاش یہ کام اسلامی ملکوں میں ہوتا:

ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے جس طرح سے لوگوں کے دماغوں کو ماؤف کیا، نہ صرف یہ کہ علمی دنیا میں ہلچل پیدا کی بلکہ مذہبی دنیا کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ جن حضرات کا یہ موضوع ہے وہ بہتر جانتے ہیں۔ اس کی ضرورت تھی کہ عالم اسلام میں اس کے محاسبہ کا کام کیا جائے۔ اتفاق سے یورپ میں خود اس سلسلہ میں بڑا کام ہوا اور اس نظریہ کا انیسویں صدی کے آخر یا بیسویں صدی کے شروع میں جو دبدبہ قائم تھا، جو طمطراق تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ڈارون کے نظریہ کی تنقید میں زبان کھولنا اپنی جہالت کا ثبوت دینا ہے، بہت سے لوگوں نے اس کے سامنے سپر ڈال دی تھی، اور کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کے بیان اور اس نظریہ میں کوئی منافات نہیں۔ لوگوں نے دونوں میں تطبیق دینی شروع کر دی تھی، بلکہ نظریہ ارتقاء کو اصل مان کر منصوصات قرآنی کی تاویل کرنے لگے تھے، لیکن اب علمی طور پر اس نظریہ کی وہ حیثیت نہیں رہی جو انیسویں صدی کے اوائل میں تھی لیکن یہ کام یورپ میں ہوا۔ کاش کہ یہ کام اسلامی ملکوں میں ہوتا، مصر میں ہوتا، عراق میں ہوتا، ہندوستان میں ہوتا۔ مگر افسوس ہمارے ممالک عربیہ کے فضلاء کی کوشش کا میدان ادب تھا یا تاریخ، انہوں نے تطبیقی علوم یعنی سائنس، کیمسٹری، فزکس یا اس طرح کے میدان کی طرف کم توجہ دی، اسلامی ممالک کا ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جو کسی نظریہ کا اضافہ کرتا، یا علمی دنیا سے اپنی تحقیق کا لوہا منوالیتا، اور بین الاقوامی اعزاز کا مستحق قرار پاتا۔

آپ نوبل پرائز حاصل کریں:

عزیز طلبہ اور مسلم نوجوانو! آپ ایگریکلچر ہی کی فیلڈ میں کوئی ایسا نظریہ پیش کریں کہ آپ نوبل پرائز کے مستحق قرار پائیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ جب کسی مسلمان کو کسی تحقیقی یا علمی کام میں نوبل پرائز ملے گا تو مسلمان نوجوانوں کا حوصلہ کتنا بلند ہوگا، وہ کتنا افتخار محسوس کریں گے، میں طبقہ علماء سے تعلق رکھنے کے باوجود اس روز سعید کا منتظر ہوں جب میں سنوں کہ کسی اسلامی ملک میں سے کسی نے نباتات یا زراعت کے میدان میں ایسا کام کیا ہے کہ وہ نوبل پرائز کا

مستحق ٹھہرا، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس سے مسلمان نوجوان کتنا خوش ہوں گے اور یہ وہ خوشی ہے جس پر کسی کو ملامت نہیں کی جاسکتی اور جس کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں، کوئی حکومت اس پر تنقید نہیں کر سکتی۔ میں نوجوانوں کو اور عرب ممالک کے نوجوانوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ ایسا اوریجنل تحقیقاتی بلکہ انقلابی کام کریں جس کی طرف ساری دنیا کی نگاہیں اٹھ جائیں اور وہ مان جائے کہ ہاں مسلمانوں میں بھی ایسی غیر معمولی دماغی صلاحیت اور عبقریت پائی جاتی ہے اور ان میں ایسے جینیئس (GENIUS) پائے جاتے ہیں۔

مسلم اقوام کے دل کی زرخیز زمین:

آپ مسلم قوم کے نونہال ہیں، آپ اس زمین کی تحقیق کرتے ہیں کہ اس میں کیا کیا صلاحیتیں ہیں، اس میں کیا چیزیں پیدا کی جاسکتی ہیں اور اس کی پیداوار کس طرح بڑھائی جاسکتی ہے، میں آپ کو ایک اور زمین کی طرف توجہ دلاتا ہوں، جس کی طرف ہمارے مسلم ممالک کی بہت تھوڑی توجہ ہوئی ہے، وہ ہے ہمارے مسلم اقوام کے دل کی زمین، ہمارے مسلم اقوام کے دل میں کیسے کیسے خزانے دفن ہیں، دل کی یہ زمین کن دولتوں، کن خزانوں اور کن طاقتوں سے مالا مال ہے، ان کو ابھارنا، ان کو پہچاننا، ان سے کام لینا چاہئے، ہمارے سیاسی قائدین اور قومی رہنماؤں نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے کہ جو قومیں ہمارے حصہ میں آئی ہیں وہ قومیں کیسی ایمانی طاقت، کیسی قربانی کی طاقت، کیسا جذبہ، کیسی گرم جوشی، کیسی سادگی، کیسی محبت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ کیا اس کے لئے ضرورت نہیں کہ ایک یونیورسٹی قائم کی جائے جو دلوں کی اس سرزمین، ان مسلم اقوام کی ان صلاحیتوں کے متعلق تحقیقات کرے، اور ان کے ابھارنے کے ذرائع معلوم کرے اور پھر ان کو کلٹی ویٹ (CULTIYATE) کرے، ان کی پرورش کرے، ان کی نشوونما کرے، اگر یہ کام ہوگیا تو دنیا میں انقلاب عظیم برپا ہو جائے گا، آپ کی تحقیق کے ذریعہ دنیا کے حالات واخلاق میں انقلاب عظیم برپا نہیں کر سکتے، دنیا کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، لیکن اس کام سے دنیا کے حالات واخلاق میں انقلاب عظیم برپا کر سکتے ہیں، میں اقبال ہی کے الفاظ میں شکوہ سنج ہوں، نہ صرف ایران سے بلکہ اس تحتی براعظم بلکہ عالم اسلام سے کہنا

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اور پھر اپنے دل کو تسلی دوں گا اور آپ کو مژدہ سناؤں گا کہ:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

زرخیز زمین میں مردم خیز خطہ:

خدا نے آپ کو پاکستان کی سرزمین دی، اس کی مٹی بھی زرخیز، اس کی قوم بھی زرخیز، اس کا دماغ بھی زرخیز، اس کا دل بھی زرخیز۔

اسی طرح ایشیاء کے سارے ممالک جہاں سے یہ طالب علم آئے ہیں، زرخیز ہیں، یہی عراق کا حال ہے جو دجلہ وفرات کی وادی ہے، یہی سوڈان کا حال ہے جو نیل کا منبع ہے، وہاں کی زمین کیسی زرخیز ہے، لیکن مردم خیز بھی ہے۔ آپ نے یہ تو سمجھا کہ زرخیز ہے، لیکن آپ نے یہ نہیں سمجھا کہ مردم خیز بھی ہے، زرخیزی کا کام تو ہو رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ مردم خیزی کا کام ابھی شروع نہیں ہوا، ممکن ہے کہ کل ہم سنیں کہ آپ وزیر زراعت بن گئے، یہ عرب نوجوان ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان میں کوئی وزیر زراعت ہو جائے، یہ زمانہ انقلاب کا زمانہ ہے، جمہوریت کا دور ہے، اس لئے اس کا پورا امکان ہے کہ آج آپ یہاں فیصل آباد یونیورسٹی کے طالب علم ہیں، لیکن کل آپ اپنے یہاں منسٹر ہوں یا لیڈر ہوں، کسی سیاسی پارٹی کے رہنما بن جائیں یا صدر جمہوریہ ہو جائیں تو میں آپ کو یہ پیغام دیتا ہوں کہ آپ زمینوں کی زرخیزی اور مردم خیزی دونوں کی طرف توجہ دیں اور اپنے ہم وطنوں کو بتائیں کہ اللہ نے ان مسلم وعرب اقوام کو جو باطنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، یورپ و امریکہ کی قومیں ان سے محروم ہیں، مسلمانوں کے اندر جو سادگی ہے، جو اخلاص ہے، اس کا ہزارواں حصہ بھی ان امریکن، یورپین اور ان غیر مسلم قوموں کو حاصل نہیں۔ آپ اس خلوص کا فائدہ اٹھائیں، مسلمان مسلمان سے کس خلوص سے ملتا ہے، ایمان کی کتنی بڑی طاقت اس کی اندر ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے نام پر وہ کیا کرسکتا ہے، اس طاقت کو بھی نشو ونما دیں، اس کو بھی بڑھائیں، آپ کا ملک لالہ زار نہیں، بلکہ ایسا مردم خیز،

زرخیز، انقلاب خیز اور ایسی بہاروں کا پیغام دینے والا بن جائے گا کہ دنیا محوحیرت رہ جائے گی۔

ان الفاظ کے ساتھ اپنے ان داعیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے یہ مسرت و عزت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس جامعہ کو نیک نام بلکہ ناموراور باعث عزت وافتخار بنائے۔ نہ صرف اس ملک کے لئے بلکہ عالم اسلام کے لئے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

یہ تقریر مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اسلامی جمعیۃ الطلبہ کے کیمپ میں کی گئی۔ اس تربیتی کیمپ میں صوبہ پنجاب کے مختلف مقامات کے طلبہ اور طلبہ کی اس تنظیم کے عہدہ دار، ذمہ دار اور نمائندے موجود تھے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے:

میرے عزیز بھائیو! مجھے آپ کی اس مجلس میں آ کر وہ مسرت ہوئی جس کو کسی ایسی دعوت کے خادم سے یا مدرسہ کے ایسے استاد سے پوچھنا چاہئے جس کو نوجوانوں پر اور ملت کے نوبہاروں پر اپنا خونِ جگر صرف کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہو، اور جو ایسے نوجوانوں کو دیکھنے کی تمنا کرتا ہو جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

خدا کے گھر میں ایک جگہ پر اتنے نوجوان، جنہوں نے اپنے مالک کے ساتھ عہد کیا ہو اور جنہوں نے ارادہ کیا ہو کہ وہ اسلام کی سربلندی کے لئے کام کریں گے اور صراط مستقیم پر چلتے رہیں گے۔

صراط مستقیم پل صراط ہے:

صراط مستقیم اصلاً تو صراط مستقیم ہے، لیکن کبھی پل صراط کی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز، خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ خدا نے ہم کو اس پل صراط کے لئے انتخاب کیا ہے اور اس راستہ سے وہ ہم کو انعام دینا چاہتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب مصائب پر انعامات ملنے لگیں گے قیامت میں تو وہ جنہوں نے اسلام کی راہ میں مصیبتیں اٹھائی

ہیں، اور بڑی بڑی مشکلات سے گزرے ہیں وہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کی کھالیں قینچیوں سے کتری گئی ہوتیں۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہمیں اس قابل سمجھا۔ اگر کوئی طالب علم محنتی ہے، اس نے واقعی پورے سال محنت کی ہے اور اپنا پورا کام کیا ہے، اگر امتحان میں پرچہ آسان آ جائے تو اپنا سر پیٹ لیتا ہے کہ میں نے کس دن کے لئے محنت کی تھی، اور راتوں کی نیند حرام کی تھی۔ اگر یہی پرچہ آنا تھا تو پہلے سے بتا دیا گیا ہوتا، اور اگر پرچہ مشکل آتا ہے تو محنتی طالب علم سمجھتا ہے کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی۔

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے:

یہ شکوہ کرنا کہ ہمیں بہت نازک زمانہ ملا ہے اور ہماری راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے، کم ہمتی کی بات ہے، بلند ہمتی کی بات یہ ہے کہ اگر راستہ آسان ہو تو آدمی کو شبہ ہونے لگے اپنے بارے میں کہ مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ میں کسی مشکل پر چلوں، اگر زندگی ساری کی ساری سہولتوں سے لبریز ہوتی تو زندگی میں لطف نہ رہتا۔ شاعر نے خوب کہا ہے:

چلا جاتا ہے ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

میں نے آپ کے سامنے سورہ کہف کی آیت پڑھی ہے جو مجھے بے اختیار یاد آئی۔

آپ کا رب آپ سے مخاطب ہے:

"انھم فتیة آمنوا بربھم" وہ ایسے نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے، یہاں فتیة کا لفظ آیا ہے۔ فتیة عربی میں فتیٰ کی جمع ہے (جمع قلت) اور فتی نوجوان کو کہتے ہیں، یہاں بہت سے الفاظ ہو سکتے تھے لیکن فتیة کا لفظ اختیار کیا گیا۔ انھم فتیة آمنوا بربھم۔ وہ چند جو اپنے رب پر ایمان لائے، اپنے رب پر ان کا عقیدہ مستحکم ہوا، زدناھم ھدی، اور جب انہوں نے پہلی منزل طے کر لی تو دوسری منزل ہم نے طے کی کہ زدناھم ھدیٰ آپ کے کرنے کا اور ہمارے کرنے کا جو کام ہے وہ کریں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے، آپ قرآن شریف میں دیکھتے ہیں "ویزدکم قوۃ الیٰ قوتکم" وہ تمہاری قوت میں اپنی قوت کا اضافہ کرے گا،

تمہارے پاس جو ہے لاکر رکھ دو، ہم اس میں اضافہ کریں گے "ان تنصروا الله ینصر کم" تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل سے خطاب کیا گیا "یابنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم واوفوا بعهدی اوف بعهدکم" اے یعقوب کی اولاد میری نعمت کو یاد کرو، اور میرے عہد کو تم وفا کرو، تمہارے عہد کو میں وفا کروں گا۔

آنحضرت ﷺ سے ایک مرتبہ شکایت کی گئی کہ پانی نہیں ہے، آپ اللہ سے دعا کر سکتے تھے اور پانی آسمان سے برس سکتا تھا، لیکن آپ فرماتے ہیں کہ جو پانی باقی ہے لے آؤ۔ پانی جب آتا ہے تو اس میں انگشت مبارک ڈال دیتے ہیں تو وہ ابلنے لگتا ہے، آپ سے عرض کیا گیا کہ کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ہے لے آؤ، سوکھی کھجوریں، خشک روٹیاں اور جو وغیرہ لوگ لائے، تھوڑا سا ذخیرہ تھا۔ آپ (ﷺ) نے دعا کی، ہاتھ لگایا اور وہ بڑھ گیا اور سارے لشکر کے لئے کافی ہو گیا۔ اللہ کا رسول حضرت عیسیٰ کی طرح یہ دعا بھی کر سکتا تھا کہ "ربنا انزل علینا مائدة من السماء" مگر چونکہ آنحضرت ﷺ کی اس امت کو مختلف ادوار سے گزرنا تھا، اس امت کو اندرونی طاقت اور عزم وارادہ سے کام لینا تھا، اس لئے اس کی تعلیم دی گئی۔ یہ عہد ہاتھ میں ہاتھ رکھنے کا نہیں ہے، یہ عہد عمل کا ہے، جدوجہد اور کوشش کا ہے، اس لئے امت سے کہا گیا کہ تمہارے پاس جو ہے اس کو پیش کرو، پھر ہم اس میں اضافہ کریں گے۔ آنحضرت ﷺ کے معجزات کو بھی اسی طرح پیش کیا گیا ہے، آپ نے تین سو تیرہ آدمیوں کو لے کر میدان بدر میں کھڑا کر دیا، آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ پھونک مار دیتے، کنکر پھینک دیتے، لیکن آپ ﷺ مدینہ سے چل کر آئے، مدینہ سے بدر کا فاصلہ ستر اسی میل کے قریب ہے، اس کو طے فرمایا، اس زمانہ کے طریقہ جنگ کے مطابق صفوں کی ترتیب کی، جیسے ایک فوجی قائد کرتا ہے، یہ ہے صحیح طریقہ سنت نبوی ﷺ۔

مسئلہ ربوبیت کا تھا:

میں نے آپ کے سامنے آیت پڑھی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "انھم فتیة" وہ گنتی کے چند نوجوان تھے، حکومت وقت نے غذائی سامان اور معاشی وسائل پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ غلہ دے تو لوگوں کو غلہ ملے، وہ لوگوں کو ملازمتیں دے تو لوگوں کو ملازمتیں ملیں، تو وہ حکومت گویا ایک طرح

سے ''مصنوعی رب'' بن گئی تھی۔ ''امنوا بربھم'' لیکن وہ اپنے حقیقی رب پر ایمان لائے کہ ہمارا پالنے والا، ہمیں غذا دینے والا، ہماری زندگی کی ضروریات پوری کرنے والا، ہمیں عزت دینے والا وہ کوئی اور ہے، وہ مالک الملک ہے، وہ رب حقیقی ہے۔ جب انہوں نے یہ منزل طے کر لی تو ''زدناھم ھدیٰ''۔ ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی معرفت ہے، ہدایت وہاں سے ملتی ہے۔ اپنی دماغی صلاحیت، اپنی ذہانت سے، تحریروں سے، محض مطالعہ سے، کتب خانہ کے علمی ذخیرہ سے نہیں ملا کرتی، ہدایت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، اور بادشاہوں کے اندازِ خطاب کی طرح جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ ''زدناھم ھدیٰ'' ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے، اللہ کے سامنے سر جھکایا، اس سے مانگنا شروع کیا، اس کی معرفت پر محنت کی، اس کی صفاتِ عالیہ اور اسمائے حسنیٰ کی معرفت و فہم حاصل کرنے میں انہوں نے غور وفکر سے کام لیا تھا تو ہم نے ان کی ہدایت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

نوجوانوں کا جذبۂ عمل:

اب مشکلات کا سامنا پڑا، یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب عیسائیت نئی نئی جزیرہ نمائے سینا اور اپنے اصل مرز بوم سے نکل کر روما پہنچی تو وہاں کٹر قسم کی بت پرست حکومت تھی، جب یہ داعی وہاں پہنچے تو ان کی تبلیغ سے نوجوان بھی متاثر ہوئے، تاریخ کے بہت سے ادوار میں ایسا نظر آتا ہے کہ نوجوان پہلے متاثر ہوئے ہیں، اس لئے کہ زیادہ عمر رکھنے والے معمر لوگوں کے ساتھ بہت سے وزن بندھے ہوتے ہیں، جیسے تیرنے کے لئے آپ دریا میں جاتے ہیں، جتنے ہلکے ہوں گے، اتنی ہی آسانی سے تیر سکیں گے، لیکن اگر کسی کے ساتھ بوجھل پتھر بندھے ہوں، کچھ سامان بھی اس کے ساتھ ہو تو اس کے لئے دریا کو پار کرنا مشکل ہوگا، جو جتنا ہلاک ہوتا ہے وہ اتنی ہی جلدی منزل طے کرتا ہے:

سبک　سار　مردم　سبک　تر　روند

خاندان، روایات، بادشاہ اور حکمرانوں سے تعلقات اور رسم ورواج کے پتھر معمر لوگوں کی راہ میں جیسے حائل ہوتے ہیں، نوجوانوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتے، رکاوٹ نہیں بنتے،

نیا خون، نئی عمر، نیا جوش، نئی امنگیں، نئے حوصلے تھے، ایک آواز ان کے کان میں پڑی، جیسے قرآن مجید میں سورہ آل عمران میں آیا ہے "ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فآمنا" ۔ پروردگار! ہمارے! قبول حق کی تاریخ بس اتنی ہے کہ ہمارے کان میں ایک آواز پڑی، ایک منادیٔ حق نے کہا اپنے رب پر ایمان لاؤ ہم ایمان لے آئے، تو یہ نوجوان جو تھے، ان کے پاؤں میں وہ بیڑیاں نہیں پڑی تھیں، جو اکثر پرانی نسل کے لوگوں کے پاؤں میں پڑی رہتی ہیں، اس لئے فخر کے ساتھ کہا گیا "فآمنا" کہ ان کو کوئی دیر نہیں لگی ایمان لائے ہیں۔

ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا:

"وربطنا علی قلوبهم" "ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا، ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا، باندھ لیا، اس لئے کہ جب کوئی چیز کھلی ہوتی ہے تو ہوا کے جھونکے سے اڑ جاتی ہے، کسی چیز سے بندھی ہو تو پھر وہ قائم رہتی ہے، تو ہم نے ان کے دلوں کو باندھ رکھا، وہ ادھر ادھر ہلنے جلنے نہ پائیں۔ "اذ قاموا فقالوا ربنا رب السموت والارض" "وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ کھڑے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیٹھے تھے، کھڑے ہو گئے، بلکہ ان کے اندر ایک عزم پیدا ہو گیا، انہوں نے اعلان کیا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے۔

"لن ندعوا من دونه الها لقد قلنا اذا شططا" "ہم اس کے سوا کسی الٰہ، کسی معبود کی پرستش نہیں کریں گے، اگر ہم نے اپنی زبان سے یہ بات نکالی تو بڑی بے جا بات ہوگی، بڑی خلاف واقعہ بات ہوگی" هؤلاء قومنا اتخذوا من دونه آلهة" یہ ہماری قوم کے لوگ بڑے اچھے، سنجیدہ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے باوقار لوگ ہیں، تجربہ کار ہیں، اس کے باوجود انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ لولا یاتون علیهم بسلطان بین اس پر کوئی دلیل کیوں نہیں لاتے اور کون ہے اس شخص سے بڑا ظالم کہ جس نے اللہ پر جھوٹ گڑھا۔

وادیٔ گلزار، وادیٔ پرخار:

اب وہ وادیاں آئیں جو دعوت کے میدان میں آتی ہیں اور وہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔

ایک وادی پرخار اور ایک وادی گلزار۔ وادی پرخار تو یہ ہے کہ راستے میں کانٹے بچھے ہوں، مصائب و آلام کے انگارے بچھے ہوں اور وادی گلزار یہ ہے کہ ترغیبات، ترقی کرنے کے مواقع، انعامات، بڑی بڑی آسامیاں، بڑے بڑے عہدے، یہ وادی گلزار ہے۔ کبھی وادی پرخار مشکل ہوتی ہے اور کبھی وادی گلزار، لیکن بہت سے تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ وادی گلزار، وادی پرخار سے زیادہ دشوار گذار ہے۔ ترغیبات، ترہیبات اور تعزیرات کے مقابلہ میں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ امام احمد بن حنبلؒ کو ایک منزل وہ پیش آئی کہ معتصم نے ان کو ڈرایا، دھمکایا، وہ نہیں مانے تو ان کو دربار میں بلایا اور کہا کہ احمد تم اگر میری بات مان لو گے تو میرے ولی عہد کی طرح محبوب و مقرب بن جاؤ گے اور اس جگہ پر بیٹھو گے۔ انہوں نے کہا، امیر المومنین! کتاب و سنت سے کوئی دلیل لایئے تو میں اس کو مان لوں۔ وہ جھنجھلایا اور اس نے جلاد کو حکم دیا اور اس نے ایک کوڑا پوری طاقت سے ساتھ مارا۔ جلاد کہتا ہے واللہ وہ کوڑا اگر ہاتھی پر پڑتا تو وہ چنگھاڑ مار کر بھاگ جاتا، لیکن وہ برابر کوڑے کھاتے رہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا آیا جب معتصم کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا متوکل تخت پر بیٹھا، اس نے امام احمد کو سر من رائی میں طلب کیا اور بڑی خاطر مدارات کی۔ یہ اپنے ساتھ کچھ زاد راہ لے گئے تھے، ستو یا اسی طرح کی کوئی اور چیز۔ جب کھانے کا وقت آتا وہی کھاتے تھے اور شاہی کھانوں کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، بعد میں متوکل نے اشرفیوں کے توڑے بھیجنے شروع کئے، تو ان کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ والد صاحب فرماتے کہ معتصم کے کوڑوں سے زیادہ متوکل کے توڑے میرے لئے امتحان کا سبب ہیں۔

یہ حکومتیں کبھی یہ کرتی ہیں، کبھی وہ کرتی ہیں، کبھی سمجھتی ہیں کہ کوڑے سے اس کو ڈرائیں، توڑے دکھاتی ہیں اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوڑے سے نہیں دبے گا، تو توڑے سے دبے گا تو توڑے پیش کرتی ہیں، یہ منزل بڑی سخت ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ آدمی اس طرح نہیں جھکتا، لیکن ماں باپ کے اصرار پر جھک جاتا ہے۔ ان کے والدین سے جو دربار سے متعلق تھے، مختلف عہدوں پر فائز تھے کہا گیا کہ اپنے لڑکے کو سمجھاؤ، وہ کس چکر میں آگئے ہیں۔ ان کو سمجھاؤ، ہماری بات مانیں، اپنا مستقبل بنائیں، تمہارے بعد آخر کون ہوگا؟ تمہارے بیٹے ہوں گے۔ لیکن جب اس سے کام نہیں چلا تو ان کو دھمکانا شروع کیا، ان کو پٹوایا۔ ران کا پیچھا کیا تو اس

وقت اللہ کی مدد کی ضرورت تھی۔

تین باتیں:

میرے عزیز بھائیو! یہ میں نے آپ کے سامنے سورہ کہف کی آیتیں پڑھی ہیں، اس کی تشریح کی ہے، اس میں ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ پہلے ایمان مستحکم ہونا چاہیے، بہت بصیرت کے ساتھ، قوت کے ساتھ ہمارا ایمان اللہ پر، اس کی صفات پر مستحکم ہونا چاہئے، اگر ہم طالب علم ہیں تو علمی انداز کے ساتھ، اور اگر ہم عوامی مسلمان ہیں تو بھی پوری صداقت کے ساتھ ہمارا ایمان خدا پر قائم ہونا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "زدناھم ھدی" اس سرچشمہ ہدایت سے ہمارا تعلق ہونا چاہئے جہاں سے ہدایت کا فیضان ہوتا ہے۔ کتاب وسنت کے مطالعہ، اسوۂ رسول اور صحابہ اور مجاہدین اسلام کے حالات سے ہمیں طاقت حاصل کرنا چاہئے، جس طرح کہ بیٹری چارج کی جاتی ہے۔ سیل جب ختم ہوجاتے ہیں تو بدلے جاتے ہیں، ہم اور آپ اس مادی دنیا میں چلتے پھرتے ہیں، ایسے اساتذہ سے بھی پڑھتے ہیں جن کو خود بھی پورے طور پر ان دینی وغیبی حقائق پر یقین حاصل نہیں ہوتا، ہمارا دور ایسی چیزوں سے بھرا ہوا ہے کہ قدم قدم پر ہم کو خدا سے غافل کرنے والی چیزیں ملتی ہیں اور ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر چیز خود فراموشی اور خدا فراموشی پیدا کرنے والی ہے، ٹیلی ویژن کو دیکھئے، ریڈیو سنئے، اخبارات پڑھئے، حتیٰ کہ خالص ادب، جس کو پاک، معصوم اور غیر جانبدار ہونا چاہئے، وہ بھی غیر جانبدار نہیں رہا، وہ فسق کا ایجنٹ بنا ہوا ہے اور بہت ہی سستا ایجنٹ باطل اقدار کا، ہمارا ادب اس وقت مشاطہ بنا ہوا ہے معصیت اور سفلی جذبات اور فحش اخلاق کا، یہ ساری چیزیں جو ہمارے چاروں طرف دریا کی طرح موجزن ہیں اور دریا میں ہم کو ڈال دیا گیا ہے، ہمارے حالات نے، ہمارے نظام تعلیم نے، ہم کو اس دریا کے حوالے کردیا ہے، پھر اس کا کہنا یہ ہے کہ:

"دامن تر مکن ہشیار باش"

خبردار بیٹا، دامن تر نہ ہونے پائے، تو دامن بچانے کے لئے ضرورت ہے کہ "زدناھم ھدی" پر غور کریں، ایمان کا چراغ روشن کریں اور جرات ومحبت پیدا کریں۔ جس کے بغیر ہم ان

نفسانی خواہشات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم ان چیزوں کا مقابلہ خالی نظام جماعت اور ضابطہ اخلاق سے نہیں کر سکتے، تجربہ کی بات بتاتا ہوں کہ زمانہ اتنا جابر واقع ہوا ہے، اس کے تقاضے اتنے قاہر ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ میں ایمان کی طاقت نہ ہو اور وہ نمونے آپ کے سامنے نہ ہوں جو سیرت کے اندر ہم کو ملتے ہیں تو ہم زمانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مسلح مادیت کا مقابلہ:

ہماری نمازیں درست ہوں، یہ طاقت نمازوں سے پیدا ہوتی ہے، دعا سے پیدا ہوتی ہے، تلاوت سے پیدا ہوتی ہے، سجدوں سے مانوس ہونے سے پیدا ہوتی ہے، بندگان خدا کے پاس بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس مسلح مادیت کا مقابلہ کریں جس کو یورپ اور امریکہ نے اپنے بہترین اسلحہ سے مسلح کر رکھا ہے، اس کی ہر چیز اتنی بھانے والی ہے کہ بڑے بڑے شیروں کے پاؤں اکھڑ جائیں تو اس کا مقابلہ ہم محض تنظیم سے، محض اپنے ضابطہ اخلاق سے نہیں کر سکتے، اس کے لئے ہمارے اندر ایمانی طاقت ہونی چاہئے، تعلق مع اللہ ہونا چاہئے، اللہ کے ساتھ ایسا تعلق ہونا چاہئے، ہم کو ایک سجدہ نصیب ہو جائے جس کی زمین بھی تاب نہ لا سکتی:

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

روحِ زمین کانپے نہ کانپے، اپنا کلیجہ تو کانپ جائے، اپنا دل تو کانپ جائے، آنکھیں تو اشکبار ہو جائیں، یہ سجدہ جب آپ کو نصیب ہوگا تو آپ کو مادیت پر قابو ہوگا، اب جو دور ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کے اندر کی طاقت کی ضرورت ہے، آپ کے اندر وہ طاقت ہو، خدا کے نام سے محبت ہو، اس کے رسول ﷺ سے محبت ہو، سنتوں کا اہتمام اور اس کی عظمت آپ کے دل میں بیٹھی ہوئی ہو، سب کوتاہیاں ہوتی ہیں، لیکن اپنی کوتاہیوں کو آپ سمجھیں، ان پر اصرار کریں، ان کے لئے دلیلیں نہ دیں، بلکہ یہ آئیڈیل تو وہی ہے، اسوہ تو وہی ہے، کرنا تو ہم کو وہی ہے، خدا آپ کو توفیق دے گا اور یہ کوتاہیاں بھی معاف کر دے گا، بہت سی پیچیدہ اور نازک دور ہمارے اور آپ کے حصہ میں آیا ہے، اس میں اگر دین کے تقاضے پورے کئے اور

اسلام کے جھنڈے کو ہم نے سرنگوں ہونے نہیں دیا تو آپ کو جو بھی دنیا میں ملے گا وہ تو خیر ملے گا، لیکن آخرت میں جو کچھ ملے گا، اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اسلام کے ہاتھ میں رہنمائی:

یہ بڑی قابل قدر بات ہے کہ نوجوانوں میں ایک **نئی تحریک** پیدا ہو رہی ہے، اور یہ بات محض اتفاق نہیں ہے، اس وقت لاہور میں آپ کو **دیکھ رہا ہوں کراچی** میں، میں نے دیکھا مصر وشام میں دیکھا کہ نوجوانوں میں خاص طور سے یونیورسٹی کے طلبہ اور انجینئرنگ اور میڈیکل کالج وغیرہ کے طلبہ میں جو اسلامی جذبہ موجزن ہے، وہ افسوس کی بات ہے کہ بہت سی خالص دینی درسگاہوں کے طلبہ میں نہیں ہے، شام میں بالخصوص وہاں کی لڑکیوں میں جو یونیورسٹی اور کالجوں میں پڑھتی ہیں، خدا جانے کہاں سے یہ بات آگئی ہے کہ کھل کر اسلام کی حمایت اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی برداشت کرتی ہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ہم شرعی پردے کے ساتھ پڑھیں گے، اگر آپ کو منظور ہو تو ہم داخلہ لیں گے، ورنہ داخلہ نہیں لیں گے۔ یہ اتفاقی بات نہیں ہے، پاکستان کے مخصوص حالات نے نوجوانوں میں ایک نیا ردعمل پیدا کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو بھی منظور ہے اور اس پردے کے پیچھے کوئی اور طاقت کام کر رہی ہے، ورنہ یونیورسٹی کے نوجوانوں میں ایک نئی تحریک، ایک نیا جذبہ، ایک نیا جوش کہاں سے آتا، اب اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ مسلمان نوجوان سامنے آئیں اور زمام کاران کے ہاتھ میں رہے جو **انهم فتيه امنوا بربهم** کے مصداق ہیں۔

اپنے محدود تجربہ کی روشنی میں چند اور باتیں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، ایک بات تو یہ ہے کہ آپ سیرت سازی کی کوشش کریں، اس کے بغیر کام نہیں چلتا، ہماری دینی دعوتوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ سیرت کی تعمیر نہیں ہوتی اور نوجوان اگلے مرحلہ پر جا کر پست ہو جاتے ہیں، سیرت کی تعمیر کتاب وسنت، اسوۂ رسول ﷺ کے ماتحت ہو تو پھر پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔

اپنی فکر کیجئے:

دوسری بات یہ ہے کہ اپنی فکر کیجئے، اس زمانہ کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ دوسروں کی فکر زیادہ

اپنی فکر کم ہوتی ہے، ہمارے اجتماعی فلسفہ اور سیاسیات نے یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ آدمی کی نظر دوسروں کے عیوب پر پڑتی ہے، اس کا محاسبہ زیادہ تر دوسروں سے ہوتا ہے، فلاں پارٹی یہ کر رہی ہے، فلاں طبقہ یہ کر رہا ہے، فلاں شخص اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا ہے اور اس کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ آدمی اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ ہم میں کیا نقص ہے؟

منفی حصہ مثبت حصہ سے بڑھنے نہ پائے:

تیسری بات یہ کہ منفی حصہ مثبت حصہ سے بڑھنے نہ پائے، تناسب سے دونوں چیزیں ہوں، آپ کا مزاج یہ نہ بن جائے کہ ہر چیز کو آپ ہمیشہ ناقدانہ دیکھیں، ہر طبقہ سے جہاں آپ دین پائیں، ان کے پاس بیٹھنے سے آپ کو محسوس ہو کہ ایمان بڑھتا ہے، ان کے پاس بیٹھ کر نمازوں کی طرف توجہ ہوتی ہے، نماز پڑھنے کا طریقہ آتا ہے، اس کو بھی بہت غنیمت سمجھئے بلکہ نعمت سمجھئے اور یہ نہ سمجھئے کہ پورے دین کو انہوں نے سمجھا ہی نہیں، پورا دین تو یہ لے کر کھڑے نہیں ہوئے تو پھر ان کے پاس بیٹھنے سے کیا فائدہ ہے۔ نماز بھی بہت بڑی چیز ہے، آپ کو اگر نماز پڑھنی آ جائے، روزہ رکھنا آ جائے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں، اسی سے پوری زندگی ڈھلتی ہے۔

اپنا مطالعہ وسیع کیجئے:

چوتھی بات یہ ہے کہ مطالعہ آپ وسیع بھی کیجئے اور عمیق بھی۔ آپ کے مطالعہ میں وسعت بھی ہونی چاہئے اور عمق بھی ہونا چاہئے۔ یعنی آپ اسلام کے اصل سرچشمہ سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کو عربی زبان سے واقفیت کے بغیر ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات کس درجہ کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا لٹریچر پڑھیں جس میں کوئی گمراہی کی بات نہ ہو، کوئی کجی نہ ہو، کسی ایک لٹریچر پر انحصار رکھنا صحیح نہیں ہے، ایک ماڈل جو مکمل ہے وہ صرف رسول اللہ ﷺ کا ماڈل ہے، کسی انسان کا ماڈل ایسا نہیں ہے جو سب سے مستغنی ہو، کسی کے متعلق یہ خیال نہیں ہونا چاہئے کہ یہ آخری ماڈل ہے، اس کے بعد کسی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، کسی لٹریچر پڑھنے کی ضرورت نہیں، تنگ نظری سے کم سے کم آپ کو کام نہیں لینا چاہئے۔

میرا ہمیشہ یہ ذوق رہا اور میں کہتا بھی رہتا ہوں کہ کتابوں کا تنوع ہونا چاہئے اور جو چیزیں اچھی ہوں ان کو دیکھنا چاہئے، البتہ اپنے ذہن میں یہ صلاحیت پیدا ہو کہ درجہ و پہچان سکیں اور اس کے اثرات ونتائج محسوس کرسکیں۔

میرے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے

یہ بات پورے خلوص کے ساتھ میں نے آپ سے کہی، میرا یہاں حاضر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میرے دل میں آپ کے لئے کیا جگہ ہے؟ اور میں آپ کی قدر کرتا ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا مجھے اکثر یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ کئی جلیل القدر صحابی ایک جگہ جمع تھے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آج ہر شخص اپنی مرادیں مانگ لے، خدا سے دعا کرے، کسی صحابی نے کہا میرے پاس اتنا سونا ہو کہ میں خدا کی راہ میں صرف کروں، کسی نے کہا مجھے عبادت کی توفیق ہو، وغیرہ۔ حضرت عمرؓ کی باری آئی تو کہا بھائی میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ میرا گھر خالد اور ابوعبیدہ اور فلاں فلاں سے بھرا ہوا ہو اور میں ایک ایک کو ایک ایک محاذ پر بھیجوں اور ساری دنیا میں اسلام پھیلاؤں، تو اس کی کس سے امید کی جاسکتی ہے؟ آپ ہی جیسے نوجوانوں سے۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں، آپ کا شکریہ کہ مجھے آپ کے پاس آنے، خطاب کرنے اور ایک جگہ دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو نظر بد سے بچائے۔ نظر بد کا لفظ میں وسیع معنوں میں استعمال کررہا ہوں۔ نظر بد کا بہت ہی وسیع مفہوم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی نظر بد سے بھی بچائے اور دوسروں کی نظر بد سے بھی اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ کو اپنی صلاحیتوں کو بہترین مصرف پر صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حسب روایت طلبہ کی الوداعی تقریب ۲۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ہمالیہ ہال میں منعقد ہوئی۔ اس میں حضرت مولانا نے طلبہ کے سامنے الوداعی تقریر کی اور وہ صفات اور شرائط بیان کئے جن کے بغیر ان کے مقصدِ تعلیم کی تکمیل ممکن نہیں اور جو ان کی زندگی کیلئے مشعلِ راہ اور رہنما بن سکتے ہیں۔

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد۔

میرے عزیز طلباء، ایسے موقعہ پر اگر آپ رنجیدہ ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ موقع ایسا ہے جو رنج و مسرت دونوں کا جامع ہے۔ لیکن وہ ماں قابل مبارکباد نہیں جو ہمیشہ اپنے بچے کو سینے سے لگائے رہے، اور آنکھوں سے اوجھل کرنے کے لئے تیار نہ ہو، بلکہ اس کا ایک وقت مقرر ہے، اس وقت تک وہ بچے کی پرورش کرتی ہے، پھر وہی ماں اس بچے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کر دیتی ہے، تاکہ وہ اس کی پیری کے لئے سہارا بن سکے، اسی طرح آپ نے ایک مدت یہاں گذاری، اس میں آپ کا ہم سے مانوس ہونا یا ہمیں آپ سے انس ہونا بالکل قدرتی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے اندر انس پیدا کیا ہے، لیکن انسانوں کے اندر یہ جوہر بہت زیادہ نمایاں ہے، صرف لسانیت ہی نہیں نفسیات کے بھی بعض بڑے بڑے ماہروں کا یہ کہنا ہے کہ انسان کا لفظ اسی انس سے مشتق ہے، اس موقع پر یقیناً ہمیں اس حیثیت سے تو رنج ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں، ہمارا آپ کا جو ایک ساتھ تھا، وہ چھوٹ رہا ہے، لیکن دوسری حیثیت سے ہمیں یہ مسرت ہے کہ آپ نے تعلیمی مدت حسن و خوبی کے ساتھ پوری کر لی، آپ نے اس زمانے میں جبکہ بالکل ہی مخالف ہیں، اور زمانے سے سکون و اطمینان رخصت ہو چکا ہے، دین کی تعلیم حاصل کی۔ اس حیثیت سے آپ قابل مبارکباد ہیں اور ہمیں اس پر دلی مسرت ہے۔

فراغت کا غلط تخیل:

لیکن ایسے موقع پر جب "فارغ" کا لفظ آتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں لوگ غلطی کریں، دارالعلوم کو ایک ایسی تعلیمی مدت تو رکھنی ہی چاہئے تھی، جس مدت کو آپ طے کرتے اور اس مرحلے سے فارغ ہوتے، لیکن اس موقعہ پر جو اہم بات آپ سے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اس کا مفہوم یہ سمجھ لیا کہ ہم تعلیم سے فارغ ہو گئے، اب ہمیں تعلیم و تربیت کی کوئی ضرورت نہیں، تو بلا کسی حجاب کے اور تردد کے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ آپ نے کچھ بھی نہیں سیکھا اور آپ کا ادارہ اپنے مقصد میں بالکل ناکام ہے اور ہم لوگ بالکل ناکام ہیں، لیکن جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ نے فارغ ہونے کا یہ مفہوم نہیں سمجھا ہے، بلکہ فارغ ہونے کا مفہوم آپ کے نزدیک بھی یہ ہے کہ آپ اس قابل ہو گئے کہ کتابوں کو ہاتھ لگاسکیں اور حسب ضرورت ان سے استفادہ کرسکیں، بلکہ یوں کہا جائے کہ آپ کو اب علم کے حاصل کرنے کی کنجی دے دی گئی تو زیادہ صحیح ہوگا، آپ اس کنجی کے ذریعہ ہر قفل کھول سکتے ہیں اور علم کے خزانے اپنے پاس جمع کرسکتے ہیں، آپ اس کنجی کو جتنا ہی استعمال کریں اسی قدر وہ کام دیتی چلی جائے گی۔

ہر نصاب کی ایک خصوصیت ہوتی ہے، اگر وہ نصاب اپنے فارغ شدہ طلباء کے اندر اس احساس کو پیدا کردے یعنی جہل کا اعتراف، شاید یہ لفظ بعض کانوں کو نامانوس معلوم ہو، لیکن مجھے اس لفظ پر اصرار ہے، جسے لوگ ذوق علمی سے تعبیر کرتے ہیں، اگر آپ کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے تو آپ کامیاب اور قابل مبارکباد ہیں اور میں آپ کے ادارے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، اس کے بعد اس مختصر وقت میں اپنے جانے والے بھائیوں کو میں صرف تین باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

اخلاص:

پہلی چیز اخلاص ہے، آپ کسی بڑے سے بڑے بزرگ یا جس کا نام آپ دنیا میں روشن کرتے ہیں، اگر آپ اس کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو اس کی زندگی کی تعمیر میں اخلاص کو ایک اہم عامل پائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ اس کی ہر چیز کو اخلاص نے دوام بخشا ہے، آپ ملا نظام الدین کو دیکھ لیجئے، جس کے درس نظامی کا سکہ صرف ہندو پاک ہی نہیں، اقصائے عالم میں

چل رہا ہے، اور جس کو باوجود کوششوں کے اپنی جگہ سے ہلایا ہی نہیں جا سکا، محض ان کی علمیت کی بناء پر ایسا نہیں ہوا بلکہ ان کے ساتھیوں اور ان کے معاصرین میں بہت سے ایسے اشخاص تھے جو علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت میں اگر بڑھے ہوئے نہیں تو ان کے ہم پلہ ضرور رہے ہوں گے، لیکن کیا بات ہے کہ آج ملا نظام الدین تو زندہ جاوید ہیں، لیکن ان کے معاصرین کا تذکرہ اگر آتا ہے تو ان کے سلسلے ہی میں آتا ہے، اگر آپ غور کریں اور ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو اس کی پشت پر اخلاص کی وہ زبردست قوت کارفرما پائیں گے، جس نے ملا نظام الدین کو قیامت تک کے لئے زندہ جاوید بنا دیا، بات صرف اتنی تھی کہ انہوں نے پڑھنے کے بعد یہ محسوس کرلیا کہ انہوں نے کچھ بھی نہیں سیکھا ہے، اور انہوں نے اپنے زمانے کے ایک ایسے امی شخص سے جو گوشہ گمنامی میں اودھ کے ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں "بانسہ" میں اخلاص کا سرمایہ لئے پڑا ہوا تھا، اپنے آپ کو متعلق کرلیا، اگر ملا نظام الدین چاہتے تو بہت سے ایسے بھی خدا کے بندے ان کو مل سکتے تھے جو اپنے وقت کے امام تصور کئے جاتے تھے، لیکن ملا نظام الدین نے اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے سپرد کیا جس کی شہرت اگر ہوئی تو ملا نظام الدین کے ذریعے سے ہوئی، بہرصورت اس کی اگر مثالیں دی جائیں تو سینکڑوں مثالیں ملیں گی۔

جذبۂ قربانی:

دوسری بات جو ہمیں آپ سے کہنی ہے، وہ ایثار و قربانی ہے، ایثار و قربانی اور عزم یہ وہ طاقت ہے کہ اگر افراد میں ہوتی ہے تو انہیں ثریا تک پہنچا دیتی ہے اور اگر کسی ادارہ یا قوم کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا اس کے سامنے جھک جاتی ہے اور اس کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

جوہر ذاتی:

اس کے بعد جو تیسری بات ہے وہ جوہر ذاتی ہے، انسان کا ذاتی جوہر اور اس کی قابلیت ہی وہ چیز ہے، جو ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے، اگر آپ نے ان تینوں چیزوں یعنی اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی کو حاصل کرلیا ہے، تو آپ کے لئے زمانہ بالکل نہیں بدلا ہے، اور ہر وقت آپ کے لئے چشم براہ ہے، لیکن ان صفات سے اگر کوئی خالی

ہے تو وہ جہاں بھی جائے گا اور جس جگہ کی بھی سند یا ڈگری اس کے پاس ہوگی، حالات کو بدلا ہوا اور اپنے مخالف پائے گا، پھر میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے یہ صفات اپنے اندر پیدا کرلیں تو آپ کے لئے عالمگیر کا زمانہ، نظام الملک طوسی کا زمانہ اور امام غزالی، امام رازی، امام ابن قیم اور امام ابن تیمیہ کا زمانہ آج بھی منتظر ہے، اور وہ آپ کے لئے واپس ہوسکتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ زمانے میں کوئی جگہ خالی رہتی ہے، کبھی زمانے میں ایسا نہیں ہوا کہ کوئی جگہ پہلے سے خالی ہو اور کسی کی منتظر ہو کہ جب وہ شخص فارغ ہوگا تو اس کو وہ جگہ مل جائے گی۔ زمانہ ''بقائے اصلح'' کا قائل ہے، وہ بہت ہی حساس اور نقاد ہے، وہ صالح کے بجائے اصلح اور نافع کے بجائے انفع کو ترجیح دیتا ہے۔ لہذا اگر آپ کے اندر یہ چیزیں ہیں تو ہر زمانہ آپ کا ہے، اور آپ کا منتظر ہے۔ زمانے کا شکوہ دراصل اپنی کمزوری چھپانے کی کوشش اور احساس کمتری کی علامت ہے، دنیا نہیں بدلی ہے ہم بدل گئے ہیں، زمانہ آج بھی وہی ہے، جو پہلے تھا، تبدیلی صرف ہمارے اندر پیدا ہوئی ہے۔

آخری بات:

اگر ہمارے سامنے یہ تصور اور یہ خیال نہ ہوتا تو یقیناً ہمارے لئے اس زمانے میں قطعاً یہ جائز نہ تھا کہ ہم کسی ایک مسلمان بچے کو اس کے ماں باپ سے الگ کر کے ایسی تعلیم دلاتے جس کی دنیا میں بظاہر کوئی قیمت نہیں، لیکن یہی تین باتیں ہیں، اخلاص، جذبہ قربانی اور جوہر ذاتی، جس کی وجہ سے ہم کو اس کا پورا پورا حق حاصل ہے، اور اس کا پورا پورا جواز بلکہ ضرورت ہے کہ صرف ایک دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی نہیں ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، اور اس طرح کے جتنے بھی ادارے قائم ہیں، وہ قائم رہیں، اور ترقی کریں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ طلباء جو ہم سے رخصت ہو رہے ہیں، وہ اپنی آنے والی زندگی میں ان اصولوں کو اپنائیں گے، اور وہ طلباء جنہیں ابھی موقع حاصل ہے اور وہ کچھ سال یہاں گذاریں گے، زیادہ سے زیادہ ان اصولوں سے فائدہ اٹھائیں گے، اس کے ساتھ ہمیں اپنے رخصت ہونے والے بھائیوں سے یہ امید ہے کہ وہ اپنے دارالعلوم سے ہر حال میں تعلق رکھیں گے، اور اس کو اپنا نصب العین بنائیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

یہ تقریر جامع مسجد فیصل آباد میں ۲۲ جولائی ۱۹۷۸ء کو علماء، جدید تعلیمی اداروں کے اساتذہ، معززین شہر اور مختلف دینی، سیاسی، سماجی، علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں کے ذمہ دار حضرات کے ایک مخصوص و منتخب جلسہ میں کی گئی۔ مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل (رکن اسلامی نظریاتی کونسل) نے خیر مقدمی تقریر فرمائی۔

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی. اما بعد.

حضرات علماء کرام اور اساتذہ مدارس و جامعات!

قبل اس کے کہ آپ حضرات سے کوئی تفصیلی اور معین بات کہوں، ایک اصولی اور اجمالی بات کرنا چاہتا ہوں۔

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں:

اس وقت علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، جب کسی دعوت یا کوشش کے ساتھ اعلیٰ طبقہ کے وہ لوگ جو ذہین اور صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں اور جو دین کا گہرا علم رکھتے ہیں تو اس میں سنجیدگی، گہرائی اور پختگی ہوتی ہے اور اس کے بارے میں یہ امید ہوتی ہے کہ وہ کسی غلط راستے پر نہیں پڑے گی۔ اس تحریک میں جذباتیت نہیں ہوگی، اس میں عامیانہ اور تبذل انداز نہیں ہوگا۔ اس وقت عالم اسلام میں علماء کی اور دینی جماعتوں اور قائدین کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ ذمہ داری ہر زمانے میں زیادہ رہی ہے۔ لیکن اس زمانے میں وہ خاص طور پر بہت عظیم بن گئی ہے کہ وہ صحیح رہنمائی کریں گے اور تحریک دعوت اور جدوجہد کو سطحیت سے بچائیں گے، اس کے متعلق یہ تصور اور یہ تاثر قائم ہونے نہ دیں گے کہ دریا کا حباب ہے، بلکہ اس کے متعلق یہ تاثر دیں گے کہ اس کی جڑیں گہری اور علم و دین کی زمین میں پیوست ہیں۔

مسلم حکومتوں میں علماء کا کارنامہ:

خلافت بنی امیہ، خلافت بنی عباس کی پشت پر اگر علماء و مجتہدین نہ ہوتے تو اسلام بہ حیثیت نظام حیات کے ایک مرتب و مدون قانون کی شکل میں موجود نہ ہوتا۔

تاریخ میں ان لوگوں کی خدمات کو سراہا جاتا ہے جو ملک فتح کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے قائدین طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، عقبہ بن نافع، موسیٰ بن نصیر وغیرہ حضرات کی خدمات روز روشن کی طرح تابناک ہیں، لیکن جو لوگ مفتوحہ ممالک میں اللہ کے قانون کو رائج کرتے تھے اور وہاں کی مشکلات و مسائل کو حل کرتے تھے وہاں کی پیش آمدہ ضروریات کی تکمیل کرتے تھے، نئے نئے حالات جو پیدا ہوتے تھے ان میں رہنمائی کرتے تھے، ان کی خدمات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، حالانکہ اگر ائمہ مجتہدین، محدثین عظام، اس زمانہ میں نہ محنت کرتے اور ان کا دماغ اس تلوار کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک کو فتح کرتی تھی اور اس حکومت کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک میں نظم و نسق قائم کرتی تھی تو یہ سب کوششیں، فتوحات اور سلطنتیں بالکل کھوکھلی تھیں۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح:

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ تاتاریوں نے عالم اسلام کو زیروزبر کر ڈالا، عالم اسلام کی چولیں ہلا دیں، اس وقت مسلمانوں سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا۔ آپ اس زمانہ کی تصاویر دیکھیں جو آثار قدیمہ میں ملتی ہیں تو اس سے اندازہ ہوگا کہ کسی مسلمان کی داڑھی کسی گھوڑے کی دم سے بندھی ہے اور ایک تاتاری اسے کھینچے لئے جا رہا ہے، دنیا کی ہر قوم ان کی نگاہ میں عزت رکھتی ہے لیکن مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل نہ تھا اور خاص طور پر اس خطہ زمین کے مسلمان جو مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا تھا۔ یعنی ایران اور ماوراء النہر کا علاقہ جو آخر میں فقہ کا (خاص طور پر فقہ حنفی) کا مرکز رہا ہے، لیکن آپ حضرات اس سے واقف ہیں کہ وہی تاتاری جو مسلمانوں کے فاتح تھے، اسلام کے مفتوح بن گئے اور جن کو مسلمانوں کی تلوار شکست نہ دے سکی، ان کو مسلمانوں کی تہذیب نے، مسلمانوں کی ثقافت نے، مسلمان کے علم نے تسخیر کر لیا اور ان کو اپنے بے دام غلام بنا لیا۔ بات یہ تھی کہ تاتاریوں کے پاس کوئی علمی ذخیرہ، کوئی شائستہ تہذیب اور کوئی مرتب و وسیع قانون نہ تھا، ان کا ایک سیدھا سادھا روایتی قانون تھا جو قبائلی

زندگی میں رائج تھا اور کوہ قراقرم اور اس کے اطراف میں اس کا عمل دخل تھا۔ نیم وحشی اقوام میں جیسے ''عرف'' ہوتے ہیں، وہ ویسے تھے، ان کے پاس کوئی آئین، کوئی تہذیب، کوئی لٹریچر نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مسلمان علماء اور دانشوروں کی ضرورت پڑی۔ مسلمان علماء اور دانشور جب ان کے دربار مین پہنچے تو ان کی علمیت کا، ان کی ذہانت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ اسلامی تہذیب نے ان کو اپنا گرویدہ بنالیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری من حیث القوم مسلمان ہو گئے۔ مسلمان چونکہ صاحب دماغ تھے، ان کے پاس ذہانت کے سرچشمے تھے، ترقی یافتہ تہذیب تھی، ایک وسیع ثقافت اور علمی ذخیرہ تھا، وہ آئین سازی کا تجربہ رکھتے تھے، تمدنی مشکلات و مسائل کو حل کر سکتے تھے، تاتاریوں کو ان کی ضرورت پیش آئی،، فلسفہ تاریخ کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ جنگی طاقت اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اس کے پیچھے دماغ نہ ہو، آئین سازی کی طاقت نہ ہو اور کوئی منظم ادارہ نہ ہو۔

یہ دین جہالت سے نہیں بلکہ علم سے پیدا ہوا ہے:

عصر جدید میں عالم اسلام کے علماء جامعات کے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان اور ہمارے قانون دان اور ہمارے ادیب و دانشور طبقہ کی ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ یہ دین جہالت کے بطن سے اور فوجی طاقت سے نہیں پیدا ہوا ہے، معرفت سے پیدا ہوا ہے، اللہ کی رہنمائی سے پیدا ہوا ہے، وحی سے پیدا ہوا ہے، یہ زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، یہ تمدن کی رہنمائی کرسکتا ہے، اس کی نگرانی کرسکتا ہے کہ یہ تمدنی بے راہ نہ ہونے پائے، فاسد نہ ہونے پائے، تخریبی راستہ اختیار نہ کرنے پائے، یہ تاثیر علماء دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی دے سکتا ہے اور یہ بڑی ذمہ داری ہے، اگر کسی دین یا کسی قوم کے متعلق یہ خیال قائم ہوجائے کہ اس کا علم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے بلکہ علم سے اس کو نقصان پہنچتا ہے اور جہالت سے اس کو فائدہ تو خواہ تھوڑے عرصے کے لئے اپنے زور شمشیر، اپنے بازو سے وہ دعوت یا جماعت یا قوم دنیا کے کسی حصے پر قبضہ کرلے، لیکن دماغوں پر اس کا قبضہ نہیں ہوسکتا، سب یہی خیال کریں گے کہ اس کو زندہ رہنے کے لئے جہالت کی تاریکی چاہئے، جب تک وہ تاریکی رہے گی، وہ زندہ رہے گا اور جب علم آئے گا وہ غائب ہوجائے گا، اس کا پردہ چاک ہوجائے گا اور جس طرح

بدلی آفتاب کی روشنی سے چھٹ جاتی ہے۔ اسی طرح وہ چھٹ جائے گا، عیسائیت کا معاملہ یہی ہوا، عیسائیت نے علم کا ساتھ نہیں دیا، عیسائیت ایک خالص روحانی تحریک اور ایک معاشرتی انقلاب کے طور پر تو آئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا جب تک زمانہ رہا ان کی مقبولیت، ان کا تقدس، ان کی روحانی طاقت رہنمائی کرتی رہی۔ لیکن اس کے بعد پھر اس کو ایک زمانہ تک ذہین اور صاحب نظر لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہوا، پھر جب مسیحیت یورپ میں پہنچی تو سمجھا گیا کہ یہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لئے زندگی سے اس کو علیحدہ کر لینا چاہئے۔

عیسائیت مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی:

یورپ اس وقت ترقی کر رہا تھا، یورپ کے اندر ترقی کی طاقتیں اور ولولے جوش مار رہے تھے، یورپ میں تنازع للبقاء کے لئے سخت کشمکش تھی، ان کی پلک ذرا جھپک جاتی تو یہ قوم کی قوم بالکل مغلوب ہو جاتی، عیسائیت جو ابھی بالکل اپنے دور طفولیت میں تھی، جس کی ابھی نہ تدوین تھی نہ تشریح، نہ ان کے پاس آئین تھا، آئین میں وہ سارا انحصار یہودیت پر کرتی تھی۔ مسیحیت اپنے ساتھ کوئی مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی، شریعت موسوی تھی، جس میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی، **ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم** کہا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ میں تمہارے لئے مستقل شریعت لے کر آیا تو جو چیزیں یہودیت میں غلط طور پر داخل ہو گئی تھیں، مسیحیت ان کی اصلاح کرتی تھی، ان کے پاس مستقل کوئی آئین نہیں تھا اور ان کا زیادہ تر زور رحم پر، محبت پر، انسان دوستی پر، مظلوموں پر شفقت پر، اجارہ داری اور اس کے غرور کو ختم کرنے پر تھا، جب یورپ جیسے بے چین ملک اور وہاں کی بے چین قوموں میں جو زندگی کے لئے دوڑ رہی تھیں مچل رہی تھیں، عیسائیت پہنچی تو یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہو گئی کہ عیسائیت بدلتے ہوئے زمانہ، دوڑتے ہوئے معاشرے اور ابلتے ہوئے علم کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس وقت مسیحی علماء کی بہت بڑی ذمہ داری تھی کہ وہ مسیحیت کی افادیت کو ثابت کرتے اور رہنما اصول دیتے، زمانہ کے جائز تقاضوں اور فطرت انسانی کی جائز خواہشات کو قبول کرتے اور کہتے کہ یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے ساتھ مذہب کی ہدایت اور نگہبانی چاہئے، یہ انہوں نے نہیں کیا، وہ دو گروہوں میں بٹ گئے، حاکمانہ گروہ نے مسیحیت کو بس عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا اور باقی

زندگی کو، آئین کو، آئین سازی کو کھلی چھوٹ دے دی، دوسرا طبقہ علماء کا تھا۔ انہوں نے مخالفت شروع کردی اور کہا ترقی ضروری نہیں ہے، بلکہ ترقی زندگی سے فرار میں ہے، کلیساؤں میں جانے میں، جنگلوں میں چھپ جانے میں، شادی نہ کرنے میں، ازدواجی زندگی سے منہ موڑ لینے میں، عورت کے سایہ سے بھاگنے میں ہے، اور اس میں روحانیت کا بچاؤ ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقوں نے عیسائیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا، جو حاکم طبقہ تھا، اس نے آزادی کے ساتھ اپنے تمدن کا ڈھانچہ بنانا شروع کیا، لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا جو مسیحیت کی تعلیم کے خلاف تھا، اس نے مسیحیت کو بدنام کیا، سینٹ پال کے زمانہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور یہ تقریباً چوتھی صدی عیسوی سے آج تک جاری ہے، یورپ اسی راستے پر گامزن ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کلیسا سے رشتہ توڑ لیا، کلیسا اور ریاست میں ہمیشہ کے لئے جدائی ہوگئی اور عیسائیت سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ ہوگئی۔

اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے:

یہ غلطی عالم اسلام میں الحمدللہ نہیں ہونے پائی، اس لئے کہ شروع سے اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ میں نے کراچی یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس کی پہلی وحی ''اقراء'' کے لفظ سے شروع ہوئی ہو اور جس کی پہلی وحی میں قلم کو فراموش نہ کیا گیا ہو وہ علم اور قلم کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ اسلام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ دین وعلم میں کبھی بھی دوری ہوگی، اس لئے کہ اسلام اور علم کا شروع سے ساتھ رہا ہے، جب بدر کے قریشی قیدی مدینہ پہنچے تو ان میں کئی ایسے تھے کہ وہ فدیہ ادا کرکے رہائی نہیں حاصل کر سکتے تھے، ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ ہر شخص انصاریوں اور مہاجرین کے دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھادے۔

اسلام زمانہ کا رفیق ہی نہیں بلکہ راہنما ہے:

اس وقت عالم اسلام میں اہل عرب کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ یہ تاثر نوجوان طبقہ میں نہ آنے پائے کہ اسلام محض طاقت اور حکومت کے بل پر قائم رہ سکتا ہے، وہ زمانہ کی تبدیلیوں اور علم وفن کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، وہ اس زمانہ مین چلنے والی چیز نہیں، وہ ابتدائی، سادہ اور محدود زمانہ کا ساتھ دے سکتا تھا، جب انسانیت عہد طفولیت میں تھی، لیکن اس

پر یہ ترقی یافتہ اور وسیع تمدن کے دور میں اسلام زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا، سب سے بڑی خدمت علماء کی یہ تھی کہ اسلامی ملکوں میں اس چیلنج کو قبول کرتے اور اپنی ذہانت سے، گہرے مطالعہ سے، اصول فقہ سے کام لینے کی صلاحیت سے، کتاب و سنت کے ان ازلی اور آفاقی اصولوں کی مدد سے جو ہر زمانہ میں نسل انسانی کی رہنمائی کرسکتے ہیں، اس تمدن کو اسلام کے اصولوں سے مطابق رکھنے کی کوشش کرتے، اس میں اگر کسی ملک میں ذرا بھی چوک ہوگی تو اس کا نتیجہ کم سے کم جو ہو سکتا ہے وہ بے عملی اور شریعت کے خلاف زندگی ہے، اور بڑے سے بڑا نقصان جو ہو سکتا ہے وہ الحاد اور دین سے بغاوت ہے۔ کسی اسلامی ملک میں آپ دیکھیں گے کہ دوسرا نتیجہ ظاہر ہوا اور کسی اسلامی ملک میں دیکھیں گے کہ پہلا نتیجہ ظاہر ہوا، حالانکہ دونوں نتیجے اسلام کے حق میں مہلک ہیں، سب سے بڑا کام اس وقت یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اسلام اپنی اسی روح اور مقاصد کے ساتھ اپنے انہیں اصولوں کے ساتھ زندگی کا نہ صرف ساتھ دے سکتا ہے بلکہ رہنمائی کرسکتا ہے، ساتھ دینا تو میں نے علی سبیل التنزل کہا، وہ تو بہت ہی گھٹیا درجہ ہے، یہ اسلام کی کوئی تعریف نہیں ہے کہ وہ زندگی کا ساتھ دے سکتا ہے، نہیں بلکہ وہ نئی زندگی کی رہنمائی کرسکتا ہے، اس کو خطرہ سے صرف وہی بچا سکتا ہے اور وہ تمدن صحیح انسانی تمدن نہیں اور وہ ریاست معتدل اور محفوظ ریاست نہیں جو اسلام کے اصولوں سے ہٹ جائے، یہ ثابت کرنا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

اسلام کو ہر مفاد پر ترجیح دیجیے:

علماء اور دانشوروں کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ اسلام کے مفاد کو ہر جماعت، ہر ادارہ، ہر مدرسہ اور ہر گروہ کے مفاد پر ترجیح دیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب جماعتوں کو مٹا دینا پڑے گا، سارے نشانوں کو نکال دینا پڑے گا، سارے ناموں کو ختم کر دینا پڑے گا، سارے بورڈوں کو ہٹا دینا پڑے گا اور اسلام اس ملک میں غالب رہے گا تو ہمیں ایک منٹ بھی اس میں پس و پیش نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں دین وملت کا مفاد ہر جماعت سے عزیز ہونا چاہئے، سہرا کسی کے سر بندھے، سہرا ہونا چاہئے۔ حضور ﷺ کا معجزہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کے دل سے یہ شوق نکل گیا تھا کہ ان کا کارنامہ سمجھا جائے۔

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک مجلس میں واقعہ کے طور پر ذکر کیا

کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں گئے تھے، وہاں ہمارے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے، ہم نے چیتھڑے لپیٹ لئے، اسی وجہ سے وہ غزوہ ذات الرقاع کہلاتا ہے، یہ کہنے کے بعد ان کو ایک دم یہ احساس ہوا کہ میں نے یہ کیوں کہا، کہیں میرا یہ عمل باطل نہ ہوگیا ہو، کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ لوگوں نے سن لیا اور بڑا مجاہد سمجھا، یہ کافی ہے، اب ہم سے کیا لینے آئے ہو؟ تو بخاری شریف میں خاص طور سے ہے کہ انہوں نے کہا کاش میں یہ نہ کہتا، ان کو اس کا افسوس رہا۔ آج اس پر زیادہ زور ہے کہ یہ کارنامہ کس طرف منسوب ہوگا، ایک صاحب تھے غازی محمود دھرم پال، آپ ہی کے پنجاب کے، مجھے ان کا ایک لطیفہ یاد آ گیا، ایک تقریر میں کہنے لگے اخباروں میں چھپتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں صاحب کے دست حق پرست پر اسلام لایا، تو کہ اس کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان کے دست حق پرست کی بھی شہرت ہو جائے، حالانکہ دست حق پرست کی شہرت زیادہ منظور ہے۔ قبول اسلام کی شہرت ہو یا نہ ہو، یہاں تک کہ بعض لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ کسی بڑے آدمی کا جنازہ ہوتا ہے، لپک کر پہنچ جاتے ہیں جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے، اس لئے کہ اخبار میں کل یہ خبر چھپ جائے گی، یہ جذبہ بڑا نقصان پہنچاتا ہے، دیکھئے جب کسی کا عزیز جان بلب ہوتا ہے تو اس کے عزیزوں میں کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ تعریف کس کی ہو، سب کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمارا مریض بچ جائے، حکیم کے سر سہرا بندھے یا ڈاکٹر کے، تو اس وقت عالم اسلام بیمار ہے، آپ کا ملک بیمار ہے، آپ اس وقت بھول جایئے کہ کس کے حساب میں لکھا جائے گا اور تاریخ میں لکھنے والے کیا لکھیں گے کہ اس ملک کو سب سے زیادہ نفع فلاں ادارہ، فلاں جماعت سے پہنچا اور اس میں سب سے بڑا حصہ ان کا تھا۔ تاتاریوں کے بارے میں آج تک یہ ثابت نہ ہو سکا کہ ان کو مسلمان کرنے میں سب سے بڑا حصہ کس کا تھا، اس لئے کہ ان مخلصین نے جنہوں نے یہ خدمت انجام دی تھی اپنے کو اتنا چھپایا کہ تاریخ کی باریک بیں نگاہ بھی ان کو نہیں دیکھ سکی۔

اس وقت جو لڑائی لڑی جا رہی ہے، اس ملک کو اسلامی آئین دینے کی، اسلامی معاشرت وتمدن میں ڈھالنے کی اور یہاں سے ان خرابیوں کو دور کرنے کی جو مغربی تمدن نے اور ہمارے سیاستدانوں نے داخل کر دی ہیں، اس لڑائی میں فوج کے ادنیٰ سپاہی بن جائیں، خالص اللہ کی رضا کے لئے کام کیجئے، اللہ کے یہاں آپ کا نام اس کے نورانی دفتر میں لکھا جائے گا، یہاں ہوا

تو کیا اور نہ ہوا تو کیا، اس وقت لڑائی کسی مکتب خیال کی نہیں ہے، اس وقت لڑائی اسلام اور غیر اسلام کی ہے، اس طرح سمجھئے کہ ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے اس میں جو بھی شریک ہو جائے سب اجر میں شریک ہوں گے، اس میں یہ کس کا کتنا حصہ ہے اور کس کا نام پہلے ہے اور کس کا نام بعد میں ہے، یہ نہیں ہونا چاہئے، اس جذبہ کو جہاں تک ہو سکے مغلوب کرنا چاہئے، اپنے اپنے مسلک پر پورے طور پر قائم رہنا چاہیے، جسے ہم حق سمجھتے ہیں، اس کو حق سمجھنا چاہئے، اس سے ہٹنے کی ضرورت نہیں، سودا کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن سب دعوت اسلامی کا محاذ اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کا محاذ بنائیں، اس ملک میں اسلامی زندگی پیدا ہو اور وہ آنکھوں سے دیکھی جا سکے اور یہ ملک دوسروں کے لئے نمونہ بنے۔

ایثار و قربانی:

تیسری بات یہ ہے کہ ہم جتنا بھی ہو سکے ایثار سے کام لیں اور باہمی نزاع سے پرہیز کریں، ہماری زندگی جتنی سادہ ہوگی، ہماری زندگی میں جتنی قربانی ہوگی، اتنا ہے اثر پڑے گا، اتنا ہی بہتر نتیجہ نکلے گا، سب سے خطرناک بات آپس کی نزاع ہے، ہماری آپس کی دینی مباحث کا میدان اور ہے، اس کے کہنے کا موقع اور ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ اکبر اس لئے دین سے متنفر ہوا کہ اس نے علماء کو مرغوں کی طرح لڑتے دیکھا، اگر کوئی مسئلہ چھیڑتا تو ان میں آپس میں اتنی تیز بحث ہوتی اور ہر ایک دوسرے پر اپنا تفوق اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ پکے دنیا والے اور جاہ طلب کرتے ہیں، اکبر نے سوچا کہ یہ کیسے لوگ ہیں، یہ ہمارے وزراء، ارکان سلطنت اور خالص دنیادار لوگ بھی اس سطح پر نہیں آتے، جب حضرت مجدد صاحبؒ کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر کا ارادہ ہے کہ وہ چند علماء کو اپنے دربار میں مشورہ کرنے کے لئے رکھے تو انہوں نے نواب سید فرید کو خط لکھا کہ خبردار خبردار! بادشاہ کو رائے دو کہ مخلص اور حقانی عالم صرف ایک آدمی کو رکھے، یہ مجدد صاحب کی فراست ایمانی تھی جو انہوں نے اس بات کو سمجھا، میں نہیں کہتا کہ ہر موقع اور مجلس میں صرف ایک ہی عالم رہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علماء کے آپس کے نزاعات اور بحث اور نفی کرنے سے اور ایک دوسرے کی تذلیل کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

خطرے کے اظہار کرنے کا بہرحال ہر شخص کو حق ہے، ایک بچہ بھی خطرہ کا اظہار کر سکتا

ہے کہ یہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے، چور نہ آ جائے، اس طرح میں یہ دو تین چیزیں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک تو آپ جدید تعلیم یافتہ طبقے کو یہ تاثر لینے دیں کہ کتاب وسنت اور اس کی تشریحات میں فقہ کا اصول اور فقہ کا جو ذخیرہ ہے وہ موجودہ تمدن کا ساتھ نہیں دے سکتا، موجودہ مسائل حل نہیں کرسکتا، یہ خیال بڑا خطرناک ہے، یہ الحاد تک پہنچا سکتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ آپ عمل سے عوام پر اور خواص پر جو حکومت میں ہیں یہ تاثر دیں کہ آپ کی سطح بلند ہے عوام کی سطح سے، آپ کی زندگی میں سادگی نظر آئے، وہ دیکھیں کہ آپ تھوڑی چیز پر قناعت کر رہے ہیں یہ نہیں کہ آپ چاہیں کہ آپ کی بڑی بڑی تنخواہیں ہوں اور گریڈ ہوں اور جو تنخواہیں وزراء کو مل رہی ہیں اور ان کو جو فوائد اور مواقع حاصل ہیں وہ ہم کو بھی حاصل ہوں، ہماری کیڈلک کار ہو، ہمارے پاس بھی کوٹھی ہو اور وہ کسی وزیر کی کوٹھی سے کم نہ ہو، بلکہ صاف صاف میں یہ کہوں گا کوئی بوریہ نشین ہو تو زیادہ کام کرسکتا ہے، اس لئے کہ یہ طبقہ اسی کے سامنے جھکتا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی بہ تکلف بوریہ نشین بنے، میں اس کی تعلیم نہیں دیتا، لیکن یہ واقعہ ہے، یہ طبقہ اسی کے سامنے آ کر جھکتا ہے اور مانتا ہے جس کو سب سے زیادہ بے نیاز دیکھتا ہے۔ حضرت مجددؒ کے سامنے وقت کے شہنشاہ کیوں جھکے؟ اس لئے کہ یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی کسی کی سفارش کرتا ہے اور نہ کبھی دربار میں آتا ہے، بیٹھا اللہ اللہ کرتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے مشورہ دیتا ہے، ہمارے تمام مشائخ نے یہی کیا، کبھی بادشاہوں کے قریب نہیں گئے مگر دور سے نگرانی کرتے رہے، حکومت کو اچھے آدمی دیتے رہے، دعا کرتے رہے، ان کے حق میں، مشورہ دیتے رہے، لیکن وہ کہتے تھے کہ آگ کو دور سے تاپو تب تو ٹھیک ہے، اگر ہاتھ ڈال دو گے تو جل جاؤ گے۔

یہ چند باتیں ہیں جو میں نے مختلف موقعوں پر عرض کی ہیں، سب کا ماحصل یہی ہے کہ اس وقت بڑا امتحان ہے ہمارا، پھر عالم اسلام کا امتحان ہے، ہمیں اپنی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہئے، کہیں ہماری صلاحیت کی کمی سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے، کوئی یہ نہ کہے اور لکھے کہ علماء کی عدم صلاحیت سے یہ ہوا۔ میں اتنی باتیں بہت معذرت کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں...... اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلام اور علم کا دائمی رشتہ

۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو مدرسہ مطلع العلوم امین (ہندوستان) کی جدید عمارت کے سنگ بنیاد کے
موقعہ پر کی تقریر

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم اما بعد وماکان المومنون لینفروا کافة ، فلولا نفرمن کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون.

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین (کا علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تاکہ وہ حذر کرتے۔

میرے عزیزو، بھائیو! اور دوستو ابھی آپ نے مولانا برہان الدین صاحب استاد تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بڑی جامع مانع تقریر سنی میں بھی اس سے استفادہ کر رہا تھا۔ علماء کا اصل منصب کیا ہے؟ وہ نائبین نبی ہیں،، اور نبوت کے فرائض یا اس کے منصبی کام اور اس کے شعبے کیا کیا ہیں؟ وہ انہوں نے شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے تلاوت کتاب، پھر تعلیم کتاب، تعلیم حکمت بعض حضرات نے اس کو الگ الگ شمار کیا اور پھر تزکیہ۔ اس پر انہوں نے بڑے مناسب طریقہ سے روشنی ڈالی۔

اسلام اور علم کا رابطہ

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسلام علم کے بغیر نہیں رہ سکتا، واقعہ تو یہ ہے کہ علم بھی اسلام کے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہ کسی اور مجلس میں شرح وبساط کے ساتھ کہنے کی بات ہے وہ علم علم ہی نہیں جو وحی کی سرپرستی اور وحی کی رہنمائی بلکہ وحی اور علوم نبوت کی انگلی پکڑ کر کے نہ چلے اور جس پر وحی کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو، اور جو وحی اللہ تبارک وتعالیٰ کے بھیجے ہوئے ور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کی سرپرستی میں، اتالیقی میں، نگرانی میں، رہنمائی میں نہ ہو، وہ علم علم نہیں۔

ع علمے کہ راہ بحق نہ نماید جہالت است

اس وقت ہمارا آپ کا موضوع ہے کہ اسلام بغیر علم کے نہیں رہ سکتا، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ مچھلی کو پانی سے نکال دیجئے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ مر جاتی ہے، تو اسی طریقہ سے اسلام کے لئے علم ضروری ہے، خدا کی صحیح معرفت ہو اس کی ذات وصفات کی صحیح معرفت ہو، اس کا بندوں کے ساتھ کیا تعلق ہے، بندوں کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہئے، زندگی کا مقصد کیا ہے؟ آغاز کیا ہے انجام کیا ہے؟ ابتداء کیا ہے انتہا کیا ہے؟ انسان کہاں سے آیا کیوں آیا، کہاں اس کو جانا ہے اور پھر کیا ہونا ہے اس سب کا علم ہونا ضروری ہے، اسی لئے اسلام علم کو چاہتا ہے وہ علم کو ضروری قرار دیتا ہے۔

پہلی وحی میں علم وقلم کا تذکرہ

پہلی وحی جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں نازل ہوئی اور سینکڑوں برس کے بعد آسمان وزمین کا پہلی مرتبہ جو رشتہ قائم ہوتا ہے، زمین کیلئے کچھ لینے کیلئے اور آسمان کیلئے کچھ دینے کیلئے برسوں کے بعد دو بچھڑے ہوئے ملتے ہیں وہ ایک دوسرے کو کیا کیا فغاں وفریاد، شکایتیں اور حکایتیں سناتے ہیں لیکن اس وقت جو یہ دو بچھڑے ہوئے ملے تو آسمان سے اس نبی کو جس کو زمین والوں کا رشتہ اللہ سے جوڑنا تھا، سب سے پہلا پیغام ''اقراء'' کی شکل میں ملا، اس سے آپ علم وقلم کی اہمیت وعظمت سمجھئے جن کو اس پہلی وحی اور پیغام آسمانی میں عزت کا مقام دیا گیا۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کہا تھا

کتب خانۂ چند ملت بشست

لیکن آپ نے کتب خانے اتنے دھوئے نہیں جتنے کتب خانے بنادیئے وہی کتب خانے دھوئے جن کو دھونا چاہئے تھا لیکن دھو کر کے پھر کیا دیا؟ نور دیا، یقین دیا، اللہ کی صحیح معرفت عطا فرمائی، انسان کو انسان بنادیا اور جاہل انسان بلکہ حیوان صفت انسان کو دنیا کا معلم بنادیا بقول اکبر۔

ے جو نہ تھے خود راہ پر، غیروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی، جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

تعلیم وتعلم کی ضرورت اوراس کا انتظام

دنیا کی کوئی قوم علم سے مستغنی ہوسکتی ہے کہہ سکتی ہے کہ نہیں، ہمارا کوئی نقصان نہیں، ہم پرکوئی واجب نہیں، ضروری نہیں کہ ہم پڑھیں اور پڑھائیں، بچوں کی تعلیم کا انتظام کریں لیکن روئے زمین پر قیامت تک مسلمان کہیں بھی آباد ہوں، وہ چاہے مقامات مقدسہ ہوں، چاہے جزیرۃ العرب ہو، چاہے یورپ وامریکہ ہو، چاہے ہندوستان کی سرزمین ہو، شہر ہو، قصبہ ہو، دیہات ہو جہاں مسلمانوں کے چار گھر بھی ہیں بلکہ جہاں چار مسلمان بھی پائے جاتے ہیں۔ وہاں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ''اقرأ'' کا سامان کریں۔ وہ اسکی تعمیل کریں کہ پڑھو یہ کام شفاخانوں کے قیام سے زیادہ ضروری ہے، اور آپ کی دکانوں سے زیادہ ضروری ہے، یہ کارخانوں سے زیادہ ضروری ہے، اس میں سے کسی چیز کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مامور نہیں فرمایا، یہ نہیں فرمایا کہ تجارت کرو، کماؤ کہ یہ بھی بہت بڑی طاقت ہے، دین حق کو غالب کرنے کیلئے خوب پیسہ پیدا کرو، خوب دولت جمع کرو، اپنی امت کو یہ سبق سکھاؤ یہ کہیں نہیں فرمایا، فرمایا تو یہ فرمایا ''اقرأ'' (پڑھو) اب بتائیے کہ علم کا کیا مقام ہے؟

اچھا پھر وہ علم جو منجانب اللہ حاصل ہوتا ہے، ایک علم لدنی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کسی کسی کا سینہ کھول دیتا اور اسے علوم کا گنجینہ بنادیتا ہے، ان کی زبان سے حکمت ابلتی ہے، یہ سرآنکھوں پر ہم ان کو اپنے سے ہزار درجہ افضل مانتے ہیں ان کا سایہ پڑ جائے تو ہم سمجھیں کہ ہم آدمی بن جائیں گے لیکن ''اقرأ'' اپنی جگہ پر رہے گا، ان حضرات کو بھی ضرورت ہے کہ وہ مسئلہ پوچھیں عالموں سے بڑے بڑے صاحب ادراک صاحب کشف بھی نماز کا مسئلہ پوچھتے ہیں۔

یہ ''اقرأ'' کا سلسلہ ایسا ہے کہ نبی امی سے شروع ہوکر آخری امتی امی تک (یعنی جو لفظا بے پڑھا ہے) جاری رہے گا، کتنے ہی دنیا میں انقلابات آئیں، سلطنتیں بدلیں، تہذیبیں بدلیں، اور انقلاب عظیم برپا ہوئے، زبان بدل جائے، تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رہے گا۔

حفاظت قرآن کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے کسی زبان اور کسی کتاب کی حفاظت کی گارنٹی نہیں لی، قرآن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے، تو حفاظت کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بس کتاب رہے نہ کوئی اسے سمجھے نہ سمجھائے، اس کے لئے سمجھنے سمجھانے والے بھی ہونے چاہئے، اور وہ کتاب الفاظ میں ہے تو

زبان بھی ہونی چاہئے، الفاظ بغیر زبان کے نہیں رہتے اس لئے عربی زبان بھی رہے گی کتنی زبانیں مٹ گئیں لیکن شریعت الٰہی کی زبان عربی اپنی جگہ پر ہے، اور اس کا علم اپنی جگہ پر ہے، تو ہر جگہ کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے یہاں مقدور بھر دینی تعلیم کا انتظام کریں۔ ہر جگہ مسائل کے بتانے والے نہ صرف یہ کہ موجود ہوں بلکہ ان کا سلسلہ جاری رہے۔ یہ بھی مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے، مدارس کا سلسلہ ضروری ہے، یہ کوئی شوقیہ تفریحی کام نہیں ہے، یہ خالص دینی ضرورت ہے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ مساجد کے بعد نمبر دو کی چیز یہی ہے اور سچ پوچھئے تو مساجد کے پشت پناہ بھی یہی مدارس ہیں، اگر مدارس نہ ہوئے تو آپ کو امام کہاں سے ملیں گے، اگر ایسے امام مل گئے جو بس نماز پڑھادیں تو جمعہ پڑھانے کیلئے اس سے زیادہ کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ اور احکام ہیں پھر اس کے بعد مسائل کیلئے آپ کہاں جائیں گے مسجدوں ہی میں تو جائیں گے امام صاحب سے پوچھنے، امام صاحب کو کوئی علم نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی صورتیں یاد کرلیں، اور نماز پڑھانا آگیا، تو یہ مدارس درحقیقت مساجد کے بھی محافظ ہیں اور مساجد کو بھی غذا پہنچاتے ہیں۔

فضلائے مدارس کا فرض

میں نے آپ کے سامنے شروع میں یہ آیت پڑھی تھی ''وما کان المومنون لینفروا کافة'' یہ تو نہیں ہوسکتا، یعنی ایک غیر ممکن سی چیز ہے غیر طبعی چیز ہے کہ سب مسلمان کام چھوڑ چھاڑ کر دین سیکھنے کیلئے نکل جائیں، نہ دکان پر کوئی بیٹھنے والا ہو، نہ کوئی خرید وفروخت کرنے والا ہو، نہ کوئی ضرورت پوری کرنے والا، معلوم ہوا سارا شہر چلا گیا، مدرسہ کا طالب علم بن کر یہ ہونے والی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایسی بات نہیں کہتا، نہ اسکا مکلّف قرار دیتا ہے، نہ اس کا مطالبہ کرتا ہے، فرماتا ہے کہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ تمام مومنین سب کے سب گھر چھوڑ کر باہر چلے جائیں، ''فلولا نفر من کل فرقة منهم طآئفة'' پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر جماعت میں سے کچھ لوگ اس کیلئے تیار ہوجائیں کہ وہ دین سیکھیں'' لیتفقهوا فی الدین'' دین کی سمجھ حاصل کرلیں یعنی وہ دین کے احکام ومسائل کا علم حاصل کریں'' ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم '' اور اتنا ہی نہیں کہ خود اپنی ہی ذات کیلئے سیکھ کر بیٹھ گئے، اپنا کام نکال لیا'' ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم '' جاکر اپنی اپنی بستیوں میں ہدایت کا کام کریں واعظ

وارشاد کا کام کریں، اوران کو خطرات سے مہلکات سے بچائیں، شرک کے مہلکات سے، کفر کے مہلکات سے، ان عقائد سے، ان رسوم سے ان اعمال سے جن سے آدمی بالکل اسلام سے خارج ہوجاتا ہے، اور بعض اوقات وہ اسلام کی سرحد پار کرجاتا ہے، اور مسلمانوں میں اسکا شمار نہیں رہتا بعض چیزوں سے ایمان چلا جاتا ہے، بالکل آدمی نے کوئی ارتداد اختیار کرلیا'' **ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم**'' عالم ہی بتا سکتا ہے، مسلمانوں کا کوئی بڑا شہر ہو، تجارتی مرکز بھی ہو، کھاتے پیتے مسلمان رہتے ہوں ایک مدرسہ بھی وہاں نہ ہو، دین کے موٹے موٹے احکام سکھانے کیلئے قرآن مجید پڑھانے کیلئے۔ تو پورا شہر گنہگار ہوگا، بس یہی فرض کفایہ کے معنی ہوتے ہیں پورا شہر خطرے میں ہے، اور خدا کے یہاں سوال ہوسکتا ہے کہ تمہیں توفیق نہیں ہوئی کہ اتنے بڑے شہر میں مدرسہ قائم کرو، یہ بات ایسی نہیں جیسی تہجد پڑھنا، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تہجد فرض تو ہے نہیں اللہ توفیق دے، کوئی پڑھے تو بڑی اچھی بات ہے، ایسے ہی ان لوگوں نے مدرستہ قائم کردیا گویا تہجد پڑھ لی یا کوئی خیرات کردی، یہ بنیادی کام ہے، یہ آپ کیلئے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے کہ اپنے یہاں بقدر ضرورت کم سے کم دینی تعلیم کا انتظام کریں، آپ کے شہر میں ایسے لوگ ہوں جو وقت پر مسئلہ بتا سکیں اور مسلمانوں کیلئے کوئی خطرہ پیش آجائے، حلال وحرام، کفر وایمان کا کوئی مسئلہ آجائے تو اس میں وہ رہنمائی کرسکیں، بتاسکیں کہ یہاں سے یہاں تک تو اسلام ہے اس کے بعد کفر ہے اور اگر تم سمجھنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بتاتے ہیں'' **قد تبین الرشد من الغی ، فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ**'' (البقرۃ ۲۵۶) اور یہ غی ہے یہ اسلام ہے اور یہ جاہلت ہے یہ بتاسکیں اس کے بعد کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔

عوام کی ذمہ داری

بنیاد رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے بنیاد رکھ دی ہماری ایک ذمہ داری ہوگئی آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے یہ بنیاد تو ہم آپ کی طرف سے رکھیں گے، گویا آپ کے ہاتھوں سے، آپ سب تو ہاتھ نہیں لگا سکتے، تو ہم آپ کی طرف سے آپ کی نیابت کریں گے، خدمت ہم کریں گے کہ وہ پتھر رکھدیں، لیکن آپ کا کام ختم نہیں ہوتا بلکہ سچ پوچھئے تو اس سے شروع ہوتا ہے، اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس مدرسہ کو ترقی دیں، باقی مشورہ کا معاملہ ہے استادوں کا مسئلہ

ہے، کتابوں کا مسئلہ ہے، نصاب کا مسئلہ ہے، کبھی جلسوں میں آنے جانے کا مسئلہ ہے، اس کے لئے ہم حاضر ہیں، آپ کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ ایک بہت بڑی اجتماعی معصیت سے ایک قومی اور ملی کوتاہی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بال بال بچالیا، اگر یہ مدرسہ نہ ہوتا تو خدا کے یہاں پرسش ہوتی۔

مدارس دینیہ کے قیام وبقاء کے شرائط

[26 نومبر 1983ء بروز جمعہ ریاض العلوم کھجرانہ (اندور) کے دارالاقامہ کے سنگ بنیاد کے موقع پر]

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ، واشھد ان لا الہ الااللہ وحدہ لاشریک لہ، واشھد ان سیدنا محمدا عبدہ ورسولہ. امابعد.

انسانی سعی وکوشش کے آثار ومظاہر

حضرات! میں یہاں آ رہا تھا اور میری زبان پر ایک شعر خود بخود جاری ہو گیا کسی صاحب بصیرت شاعر کا ہے۔

عزم راسخ ہے نشان قیس و شان کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دہشت وکوہسار

یہ شاعر کی بات نہیں یہ اصل میں تو قرآن کی ترجمانی ہے۔

وان لیس للانسان الا ماسعیٰ، وان سعیہ سوف یریٰ، ثم یجزٰہ الجزاء الاوفیٰ (النجم: ۴۱،۴۰،۳۹)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی، پھر اس کو اسکا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اتنا ہی ہے جس کی وہ کوشش کرے اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور خاص طریقہ ادائے قرآنی کے ساتھ فرمایا گیا ''وان سعیہ سوف یریٰ'' (اور اس کی کوشش ایک مرتبہ نظر آ کر رہے گی) یہ بھی قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ یہاں ''سوف'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عام طور پر مستقبل بعید کیلئے استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں جلدی نتائج نظر نہ آئیں تو مایوس نہ ہونا ''سوف یریٰ'' وہ نظر آئے گا جو کچھ دنیا میں

دیکھ رہے ہیں سلطنتوں کا قیام، تہذیبوں کا عروج، علوم و فنون کی اشاعت، باکمال لوگوں کا پیدا ہونا، سب انسانی سعی وجہد وجہد کے ظہور کے نتائج ہیں اور قرآن مجید اس آیت کی تفسیر ہے۔

مردم خیز شہر اور قصبے

کسی سرزمین میں کچھ لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کو دھن لگ جاتی ہیں کسی کام کی، کسی علم و فن میں امتیاز پیدا کرنے کی اور لوگوں تک اس دولت کے عام کرنے کی، پھر علم پانی کی طرح برستا ہے ہندوستان کی تاریخ اور یہاں کے خاندانوں کی تاریخ پڑھیے جس خطہ کا تذکرہ پڑھیے گا تو معلوم ہوگا کہ اولیاء اللہ اور باکمال لوگ زمین سے اگتے تھے یا آسمان سے برستے تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یا ولی اللہ پیدا ہوتے تھے یا امام فن پیدا ہوتے تھے اس پر اس وقت کے لوگوں کا تعجب کرنے کا حق ہے جب کسی چیز کا چلن ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے یہ تہذیب بھی جب اپنی عمر پوری کرے گی اور کوئی مورخ لکھے گا کہ اس زمانہ میں اس ملک میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں گریجویٹ تھے، ڈاکٹر تھے، انجینئر تھے، ایل ایل بی تھے، پی ایچ ڈی تھے اور خدا جانے کیا کیا تھے لوگ کہیں گے کہ کتنا مبالغہ ہے بھلا ایک ملک میں کتنا ہی بڑا ملک ہو، ایک زمانہ میں ایک سو برس دو سو برس کے اندر اتنے باکمال و فاضل لوگ پیدا ہو گئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں کوئی آدمی رہتا ہی نہیں تھا سب ڈاکٹر، انجینئر اور اسکالر ہی رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی ہوا چل جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے (اصل تو ارادۂ الٰہی ہے اور اس کی طرف سے ہر طرح کی آسانی دی جاتی ہے) پھر لوگوں کی طبیعتوں میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ تھوڑی کوشش سے بڑے بڑے نتائج نکلنے لگتے ہیں بڑے بڑے کمالات حاصل ہونے لگتے ہیں۔

مالوہ کی قدیم تاریخ

مالوہ کی تاریخ آپ پڑھیں صرف شیخ محمد حسن مندوی کی ''گلزار ابرار'' ہی پڑھ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ، مشائخ طریقت، اور اصحاب سلسلہ، اور اہل روحانیت بارش کے قطروں کی طرح مانڈو کی سرزمین پر نازل ہوئے تھے۔ آدمی کو حیرت ہوتی ہے کہ کیا اس وقت اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن یہ حضرت اتنے نمایاں تھے کہ مورخ ان کو نظر انداز نہیں کر سکا کوئی بھی تاریخ ایسی نہیں ہے، جس کو یہ کہا جائے کہ یہ ایک طرح کی ڈائرکٹری ہے جس کا چاہئے

نام نکال لیجئے۔ یا ڈکشنری ہے جس کا چاہئے نام تلاش کر لیجئے، یہ بات نہیں ہے اگر انہوں نے سو کا ذکر کیا ہے تو ڈیڑھ سو دو سو آدمی چھوٹ بھی گئے یہ زمین سب کو اگانے کیلئے تیار ہے، آپ چاہیں تو یہ سبزی پیدا کرے، درخت پیدا کرے، اور آپ چاہیں تو اللہ کے حکم سے اولیاء اللہ پیدا کرے، اور کاملین فن پیدا کرے۔ زمین ہی کی طرف نسبت کرتے ہیں کہ اس سرزمین سے کتنے آدمی اٹھے۔

رضا کار و ایثار پیشہ خادم دین، علماء اور نگران حکومت و معاشرہ صوفی

بس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ پہلے کوئی بندہ دیوانہ بن جائے، تو اس کے بعد پھر تو دریا بہہ جاتے ہیں ایسے ہی یہ جنگل پڑا ہوا ہے ہم نے بہت کچھ بنا ہوا دیکھا۔ اور جن کی زندگی ہے وہ دس برس بعد آئیں گے اور بہت کچھ بنا ہوا دیکھیں گے۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ سارا میدان آپ کو گھروں کا اور اداروں کا ایک شہر نظر آئے، بہر حال یہ ایک مبارک بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند عزیزوں کو اس کی توفیق عطا فرمائی، اور انہوں نے یہاں پر ایک کوشش شروع کی ہے، بغیر کسی سلطنت کی سرپرستی کے، میں آپ کو یہ بھی بتلا دوں کہ پہلے بھی جو کوششیں ہوئی ہیں وہ ان سلطنتوں کی سرپرستی سے نہیں ہوئی ہیں، سلطنتیں اپنا کام کر رہی تھیں ان کا مذاق اور تھا۔ ان کی ضرورتیں اور تھیں، ان کے مصالح اور تھے یہ سب وہ لوگ کر رہے تھے جو پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھے اور بہت سے دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے علم و روحانیت کا دریا بہا دیا، اور سلطنتوں سے تو وہ دور ہی دور رہے، سلسلہ چشتیہ نے خاص طور پر اس کا لحاظ رکھا کہ سلطنت سے دور رہے، ایک بزرگ کا قول ہے کہ سلطنت وقت، اور بادشاہ وقت آگ کی طرح ہے کہ دور بیٹھ کر تاپے، آدمی پاس نہ جائے، ورنہ جل جائے گا، ان لوگوں نے یہی طرز عمل رکھا، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ تارک الدنیا تھے، ان کو خبر نہیں تھی کہ حکومتوں میں کیا ہو رہا ہے، اچھا برا سب ہو رہا تھا، یہ بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کر رہے تھے، اور وظیفہ پڑھ رہے تھے، اور ضربیں لگا رہے تھے، یہ غلط ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی ایک مثال دیتا ہوں، کہ وہ غیاث پورہ کی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے پورے ہندوستان کی نگرانی کر رہے تھے، کیسے لوگ آ رہے ہیں، کیسے آدمیوں کی ضرورت ہے اور جب ضرورت پڑتی تھی تو بادشاہ کو ایسے آدمی دے دیا کرتے تھے کہ نگینہ کی طرح حکومت میں اس طرح جڑ جاتے تھے، جیسے انگوٹھی میں

نگینہ جڑ دیا جائے، علاء الدین خلجی نے ایک مرتبہ کہلوایا کہ میں تو مل کر رہوں گا، چاہے جو کچھ ہو، فرمایا کہ میری خانقاہ کے دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازہ سے آئے گا، میں دوسرے دروازہ سے نکل جاؤں گا، چنانچہ جب بادشاہ آیا تو حضرت اجودھن چلے گئے، فرمایا، ملنے ملانے کی کوئی ضرورت نہیں، ملنے کا بالکل خیال نہ کریں، ہم دعا کر رہے ہیں ہمارا کام ہے دعا کرنا عام انسانوں کے لئے پھر مسلمانوں اور والئی سلطنت کے لئے کیوں نہیں، جس کی خوبی پر جس کی بہتری پر بہت کچھ موقوف ہے، اور یہی ان کا طرز عمل ساری عمر رہا۔

بات زبان پر آ گئی تو کہدوں کہ ایک وقت ایسا آیا کہ محمد تغلق کا ٹھٹھہ (سندھ) میں انتقال ہوا، وہاں دریائے سندھ کے اس پار مغل پڑے ہوئے تھے، وہ مغل جو وحشی مغل تھے، وہ نہیں جو بعد میں آئے، کئی لاکھ کا لشکر پڑا تھا، مسلمان لاوارث ہو گئے، اور کسی کے کچھ بنائے نہیں بنتی تھی، اور لوگ اس انتظار میں تھے کہ مغل دریا پار کر کے آئیں گے، اور جیسے کہ بکریوں کا شکار بھیڑیے کھیلتے ہیں، ایسے ہی مغل اس لاوارث فوج کی بوٹی بوٹی کر دیں گے، اس وقت کسی کے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، بادشاہ کا کوئی بیٹا اس قابل نہیں تھا، اس وقت حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی موجود تھے، ان کو بادشاہ نے ایک بہانہ سے بلا لیا تھا، لیکن اصل میں اللہ نے ان کو پہنچایا تھا، انھوں نے فیروز تغلق سے کہا (جو محمد تغلق کا چچازاد بھائی تھا) کہ دیکھو اگر تم سلطنت سنبھالتے ہو تو سنبھالو، ورنہ ہم کسی اور کے حوالہ کریں گے، اور اگر تم عدل اور حکومت کے خیال سے، رزم اور بزم کے خیال سے حکومت لیتے ہو تو میں اللہ سے تمہارے لئے تیس سال مانگ لوں گا، چنانچہ پورے تیس سال نہایت کامیابی کے ساتھ اس نے سلطنت کی، حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کا بٹھایا ہوا فیروز تغلق بادشاہ تھا، جس کے متعلق بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ دہلی کے تخت سلطنت پر فیروز تغلق سے بہتر اور مکمل اور جامع آدمی کوئی نہیں آیا، بعض حیثیتوں سے عالمگیر مرحوم سے بھی وہ فائق تھا، اور بعض حیثیتوں سے وہ فائق تھے، لیکن مجموعی طور پر فیروز تغلق جیسا بادشاہ نہیں آیا، پورے ملک میں امن و امان ہو گیا، جرائم ختم ہو گئے، ظلم کرنا لوگوں نے چھوڑ دیا، بے ایمانی کا رواج کم ہو گیا یا ختم ہو گیا، اور یہ کیا تھا، یہ ایک فقیر درویش کی دعا اور سرپرستی۔

تو اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوتا ہے، اور کسی کے دل سے لگ جاتی ہے تو جنگل میں منگل

ہو جاتا ہے، دل کے لگنے کی بات ہے، اور کچھ بھی نہیں، دل سے لگ گئی اللہ کے ایک بندہ کے تو دارالعلوم دیوبند کھڑا ہو گیا، یہ کیا ہے؟ حضرت حاجی عابد حسین صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں خیال پیدا ہوا، ایک نے اس کی ابتدا کر دی، دوسرے اس کی نگرانی کرتے رہے، اور ایسے ہی (جس کی طرف ان بھائیوں اور عزیزوں کا انتساب ہے) ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے دل سے لگ گئی، اور دیکھئے کتنے ساتھی تیار کر لئے، اور آج ندوۃ العلماء کی کیا حیثیت ہے، اور ایسے ہی مدرسہ مظاہر علوم اپنے بانیوں کے عزم واخلاق کا کرشمہ ہے، اور جو بھی بڑے بڑے جامعات ہیں، ازہر ہو یا اور کوئی جامعہ، سب کے پیچھے آپ کو کوئی شخصیت نظر آئے گی پھر وہ شخصیت اپنے ساتھی بنا لیتی ہے۔

اجتماعی کام کی شرطیں

اللہ کو جب کوئی کام منظور ہوتا ہے، تو اس کے بانی اور ذمہ دار شخصیت کی طبیعت میں صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ہر ایک سے کام لے لے، سب کو ملا کر رکھے، اپنے کو جھکا کر رکھے، دوسرے کو بڑھا کر رکھے، یہ علامت ہوتی ہے کہ اللہ کو کچھ کام لینا ہے، اور جب اللہ کو کام لینا نہیں ہوتا شخصیت تو ہوتی ہے، لیکن روز جھگڑا، کوئی اس کے ساتھ کام نہیں کر سکتا، سمجھ لیجئے کہ کام ہونا منظور نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ شخصیت بھی پیدا کرتا ہے، اور اس کے ساتھی بھی پیدا کرتا ہے، اور اس شخصیت کے دل میں ان کی قدر، اور ان کے دل میں اس کی عزت اور اس کا اعتراف، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کچھ اہل استطاعت واہل توفیق کو بھی کھڑا کر دیتا ہے، وہ اپنی سعادت سمجھتے ہیں، کہ آپ تو ایثار سے کام لے رہے ہیں، اور لیتے رہیں، لیکن ہمیں موقعہ دیجئے کہ ہم خدمت کریں، ہمارا بھی حصہ ہو جائے۔

عمارت کے تین پتھر

اس طرح کم سے کم تین پتھر ہوتے ہیں، ایک اصل کام شروع کرنے والا، ایک اس کے ساتھی، اور ایک کے ساتھ اس کے معاونین یہ تینوں جب پیدا ہو جاتے ہیں، تو چوتھی چیز مدرسہ کی شکل میں، جامعہ کی شکل میں نکل آتی ہے، اور دنیا دیکھتی ہے کہ کتنا بڑا دارالعلوم قائم ہو گیا،

بس ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ توفیق دے، اور عمر میں برکت دے ان لوگوں کی جنھوں نے یہ کام شروع کیا، اور اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ تعاون کا جذبہ، اور لوگوں میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا فرمادے، جو آج عمومی پیمانہ پر دنیا سے رخصت ہوتی جارہی ہے، اور خاص طور سے مسلمانوں کے اندر سے رخصت ہوتی جارہی ہے۔

مسلمانوں میں تعاون کی کمی

مسلمان سے سب کچھ کرا لیجئے، مسلمان سے کہئے تو وہ سر کے بل کھڑا رہے گا، سر نیچے اور پاؤں اوپر رات بھر کھڑا رہے گا، اور کہئے تو پیٹ پر پتھر باندھنے کے لئے تیار ہے، اور کہئے تو کسی وقت خندق میں کودنے کے لئے بھی تیار ہے، مگر یہ کہئے کہ دو دن کسی آدمی کے ساتھ مل کر کام کر لیجئے تو مسلمان کے لئے یہ مشکل ہے، حالانکہ یہی سب سے بڑا کام ہے، جو کامیابی انبیاء علیہم السلام سے لے کر ان کے جانشینوں تک ہوئی ہے، وہ اسی کا کرشمہ ہے، وہ وہی لوگ ہیں، کسی طریقہ سے اللہ نے جن کے دل جوڑ دیئے۔

پہلے دل جوڑنا پھر اینٹیں

پہلے دل جوڑنا پڑتا ہے، پھر اینٹیں جوڑنا، لوگ سمجھتے ہیں اینٹیں جوڑنا اصل کام ہے، نہیں دل جوڑنا اصل کام ہے، دل جڑے تو اینٹیں سب جڑ جائیں گی، بڑی سے بڑی عمارت کھڑی ہو جائے گی، ہم پڑھتے ہیں بڑے بڑے مدرسوں کے بانیوں کے حالات، میں نے دیکھا کہ کیسے کیسے نازک موقعے آئے، خود ندوہ کے بانیوں نے اور اس کے شروع کے ناظموں نے کیسے کیسے کڑوے گھونٹ پئے ہیں، اور کیسے کیسے لوگوں کو برداشت کیا، اس وقت ہمارے اس کام کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب کی سن لیں، اور سب سے فائدہ اٹھائیں، اور سب کو ہم سینہ سے لگائیں، تب جا کر اللہ تعالیٰ نے یہ دن دکھایا کہ ندوہ کے پڑھے ہوئے فرزند یہاں موجود ہیں، اللہ ان سے کام لے رہا ہے، کسر وانکساری ضروری ہے، تھوڑا سا ٹوٹنا تھوڑا سا توٹنا، جب ہی کام چلتا ہے، اور توڑنا ہی توڑنا ہو، دوسرے کو توڑے اور خود نہ ٹوٹے تو اس طرح کام نہیں چلتا۔

جہاں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کوئی انتشار ہے اس کا سبب یہ ہے کہ کارکن جھکنا نہیں جانتے، ماننا نہیں جانتے، کسی کی بات قبول کرنا نہیں جانتے، ایک ہی سبق پڑھا ہے کہ ہماری مانو، اس کی وجہ سے آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ بڑی بڑی جگہوں میں انتشار اور جھگڑا ہے، اللہ

تعالیٰ ہماری اپنے نفس کے آفات وشرور سے حفاظت فرمائے اور اس جنگل میں اپنے فضل سے، محض اپنی قدرت کاملہ سے صحیح علوم دینیہ کا ایک مرکز قائم کرے، جہاں سے علوم نبوت کے آفتاب کی شعاعیں پھیلیں، اور واقعی اس سرزمین کو مالا مال کردے، اور صحیح معنی میں مالوہ بنادے اور پھر یہاں سے دور دور فیض پہونچے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

فتح وغلبہ کے دو الٰہی نظام

یہ تقریر ۱۶ شعبان ۱۳۸۸ھ (۸ نومبر ۱۹۶۸ء) کو "مدرسۂ ثانویہ طیبہ" مدینہ منورہ کے وسیع ہال میں کی گئی۔ اس جلسے میں جامعہ اسلامیہ، مدارس اور کالجوں کے اساتذہ، اور طلبا اور سربرآوردہ حضرات کی کثیر تعداد شریک تھی۔

الحمدللہ و کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ. امابعد.

دو الٰہی نظام

اس کائنات میں دو نظام کارفرما ہیں، پہلا طبعی نظام جسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لئے منتخب کیا ہے اور اسے پوری کائنات کے لئے دستور بنایا ہے۔ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کثرت قلت پر امارت افلاس پر، اسباب وسائل کی فراوانی قلت اسباب پر اور قوت ضعف پر غالب رہتی ہے۔ تنظیم، اتحاد، عزم، قوت ارادی، مستقل مزاجی، مستعدی یہ وہ صفات اور خصوصیات ہیں جو ہمیشہ اپنے اضداد پر غالب رہتے ہیں ہم سب اپنی روزمرہ زندگی میں اس نظام کے تجربات سے گزرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء میں کچھ خاصیتیں رکھی ہیں۔ جو ماہ وسال کی گردش زمانے کے الٹ پھیر اور صدیوں کی مدت دراز پر بھی ان سے جدا نہیں ہوتیں آگ میں جلانے کی خاصیت رکھی گئی، لہٰذا آگ ہمیں جلاتی ہے۔ پانی میں اپنی خاصیت ہے مٹی کے کچھ خواص ہیں غرض تمام اشیاء میں مخصوص خواص ہیں جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔

منصفانہ قانون، میزان عدل

طبعی نظام کا قانون ایک ایسا منصفانہ قانون ہے کہ جو کسی کی رعایت نہیں کرتا یہ طبعی قانون ایک انسان دوسرے انسان یا ایک گروہ پر دوسرے گروہ کو افضل نہیں ٹھہراتا۔ حتیٰ کہ یہ قانون مومن و کافر، متقی اور فاجر نیک و بد، مصلح و مفسد تک میں امتیاز نہیں برتتا، آگ ہر اس شخص کو جلاتی ہے جو اس کی طرف بڑھتا ہے، وہ نہ کسی مصلحت کی رعایت کرتی ہے اور نہ انجام سے

خائف ہوتی ہے یہ وہ میزان عدل ہے جو اشیاء کا صحیح صحیح ناپ تول کرتی ہے، نہ مداہنت برتتی ہے نہ رعایت اور فرق و امتیاز سے ہمیشہ بالاتر رہتی ہے۔ یہ وہ قانون ہے جس کا تجربہ انسان نے اپنے وجود سے آج تک ہزاروں سال کی طویل مدت میں کیا ہے اس کے تجربات، واقعات اور مشاہدات کے تسلسل سے انسانیت کی تاریخ کے مختلف گوشے پر ہیں اور ان میں آپ کوئی استثناء نہیں پائیں گے۔

ایک حکومت دوسری حکومت پر غالب آتی ہے۔ طاقتور اپنے حریف کو زیر کرتا ہے، ایک توانائی دوسری توانائی کو ختم کرتی ہے۔ ایک تعداد اپنے مقابل تعداد کو مغلوب کرتی ہے۔ اور یہ سب اس قانون طبعی کے مطابق ہوتا ہے جس کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

دلائل سے بے نیاز

قانون طبعی اپنے اثبات کے لئے نہ بحث و دلائل کا محتاج ہے نہ فکر و فلسفہ کا حاجت مند، یہ ایک بدیہی حقیقت تسلیم شدہ قانون، فطری امر، آزمودہ علم اور ہر ایک کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ چنانچہ آسمانی کتابوں اور انبیائے کرام کا یہ کبھی موضوع بحث نہیں رہا یہ قانون فطرت پوری قوت سے نافذ اور ہر طرح آزاد ہے اگر اسے اس کے فطری حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے مطلق فرماں روائی حاصل ہو تو اس کے عمل اور کارفرمائی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

دوسرا نظام

یہ وہ نظام ہے جو انبیاء کرام کا موضوع رہا ہے آسمانی صحیفوں نے اپنا موضوع بنایا ہے اس کی تشریح اور توضیح کی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے چند مقاصد کو افضل اور ممتاز اور (خواص اشیاء کے حقیر مقاصد نتائج سے زیادہ) احترام اور اہتمام کا مستحق قرار دیا ہے۔

حقیر اس مفہوم میں کہ آگ جلاتی ہے، پانی ڈبوتا ہے، زہر ہلاک کرتا ہے، تریاق زہر کے اثر کو زائل کرتا ہے، طبیب علاج کرتا ہے، مرض لاغر اور کمزور کرتا ہے، دوا صحت اور آرام بخشتی ہے۔ یہ تمام نتائج اور مقاصد قابل قدر اور عقل کیلئے قابل تسلیم ہیں، مگر ان کے علاوہ چند اور اعلیٰ مقاصد ہیں، جو ان سے توجہ و اہتمام کے مستحق ہیں اور وہ ہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت، انسان کی ہدایت، مقصد تخلیق، انسانیت کی سعادت، عدل و انصاف، انصاف پرور حقوق آشنا اور صالح

زندگی اور ایک ایسے مثالی معاشرے کے قیام جس میں خوف خدا ہو، انسانیت کا احترام ہو، حقوق کی ادائیگی اور امانت کی حفاظت ہو، جس میں لوگوں کو اللہ کی معرفت کی سہل تر راہ میسر ہو اور ان کے قوی اور صلاحیتوں کا نشو ونما ایسے ماحول میں ہو سکے کہ ان کی رسائی اس مطلوب کمال اور اعلیٰ مقصد تک بآسانی ہو جائے جس کی خاطر اس کائنات کی تخلیق عمل میں آئی۔

طبعی نظام کی شکست

یہی وہ نظام ہے جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا۔ آسمانی کتابیں نازل فرمائیں، اسی نظام کے آگے طبعی قوانین سرنگوں ہوئے اور انہیں اپنی خاصیتوں کو بدل دینا پڑا۔ جب دو مقاصد کا تصادم ہوتا ہے فطری نظام اور اس شرعی نظام کا جو عقل دین اور اخلاق کا تابع ہوتا ہے۔ اور یہی کائنات کا مقصد وجود اور انسان کا مقصد تخلیق بھی ہے۔ تو پلڑا شرعی نظام کا بھاری ہو جاتا ہے۔ جب سیدنا حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ کی سنت آگ میں جاری تھی طبعی عوامل کارفرما تھے، آگ ہزاروں سال سے جلا رہی تھی انسانی تاریخ نے اپنی دیانت، دقت نظر، تحقیق و جستجو کے باوجود ایک واقعہ بھی ایسا محفوظ نہیں کیا کہ آگ نے اپنے فطری عمل سے کسی بادشاہ یا عالم کے احترام میں پس و پیش کیا ہو۔ کیونکہ اس کا کام تو جلانا ہی ہے لیکن طبعی تصادم یعنی آگ کا ٹکراؤ، اس شرعی نظام سے ہوا جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے اس وسیع کائنات کی تخلیق کی ہے جس میں آگ، پانی، اجرام فلکی، ہزاروں زمینی اشیاء اور مختلف غذائیں ہیں اس سے جب آگ کی فطرت ہدایت کی فطرت سے متصادم ہوئی تو آگ کو حکم دیا گیا کہ وہ نہ جلائے، آگ سے جلانے کی وہ صلاحیت سلب کر لی گئی جو ابتدائے آفرینش سے اس میں موجود تھی، آگ نے شاید وہ غیبی آواز سنی ہو جسے نہ نمرود سن سکا اور نہ کوئی اور انسان کہ خبردار ابراہیمؑ کو نہ جلانا میں وہ ہستی ہوں جس نے تجھے جلانے کی خاصیت عطا کی ہے لیکن ابراہیمؑ کی جس مقصد کی خاطر تخلیق ہوئی ہے اور انہیں نبوت سے سرفراز کر کے تبلیغ و ہدایت کے لئے مخلوق کے پاس بھیجا گیا ہے۔ یہ وہ اعلیٰ و ارفع مقاصد ہیں کہ جن کے آگے تجھے اپنی خاصیتوں کے ساتھ ہزاروں بار سرنگوں ہو جانا چاہئے۔ ابراہیمؑ کے کپڑوں تک کو نہ چھونا چہ جائیکہ ان کا پاک و مقدس جسم اور مومنانہ قلب سلیم جو دعوت نبوت کا مسکن اور امین ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا۔

ولقداتینا ابرھیم رشدہ من قبل و کنا بہ عالمین

اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔

اس امر الٰہی کے آگے آگ نے سپر ڈال دی، دین فطرت کے مقابل آگ کی فطرت اور خاصیت کو سرنگوں ہونا پڑا۔ کیونکہ یہ دین فطرت ہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے بغیر اس کائنات کا وجود عبث اور بے معنی ہے اللہ تعالیٰ کا حکم آگ کو تسلیم کرنا پڑا۔ حضرت ابراہیمؑ کو جلانے سے اس نے گریز کیا اور ایک جان فزا خنکی میں تبدیل ہوگئی۔

قلنا ینار کونی برداوسلما علی ابرھیم، وارادوا بہ کیدا فجعلناھم الاخسرین

ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہوجا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر، وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام بنادیا۔

انبیاء کی بے سروسامانی اور بے اسبابی

آپ حضرات یہ بخوبی جانتے ہیں کہ انبیائے کرام کی بعثت جن قوموں میں ہوئی وہ قومیں اپنے سازوسامان کی کثرت اور مادی ترقی کو کامیابی کا معیار سمجھتی تھیں۔ نبی پر ایمان لانے والے غرباء ان کیلئے حجاب بن جاتے۔ اس معاملے میں ہر نبی اور اس کی قوم میں عظیم تفاوت تھا۔ یہ بدیہی حقیقت دلیل کی محتاج نہیں، قرآن اس قسم کے واقعات، دلائل اور شواہد سے پر ہے، جب نوحؑ اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تو ان کی قوم نے کہا۔

قالوا انومن لک واتبعک الارذلون.

انہوں نے جواب دیا'' کہ ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے''

اور یہ بھی کہا کہ۔

وما نراک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا بادی الرای ومانری لکم علینا من فضل بل نظنکم کذبین.

اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں ارازل تھے

بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے، اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہوں بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو انہیں کہا گیا۔

قالو یٰشعیب ما نفقه کثیراً مما تقول وانا لنراک فیناضیعفاً ولولا رهطک لرجمنک وماآ انت علینا بعزیز.

انہوں نے جواب دیا کہ اے شعیب تیری بہت سے باتیں تو ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بے زور آدمی ہے تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے۔ تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو۔

حضرت موسیٰ اور ان کے کمزور رفقاء اور ان کے حریف فرعون اور ان کے لشکر کی کیا نسبت تھی۔

قرآن کہتا ہے:

ونادی فرعون فی قومه قال یٰقوم الیس لی ملک مصر وهذه الانهٰر تجری من تحتی افلا تبصرون، ام انا خیرمن هذا الذی هومهین ولایکاد یبین فلولاالقی علیه اسورة من ذهب اوجآء معه الملئکة مقترنین ، فاستخف قومه فاطاعوه انهم کانوا قوماً فسقین.

ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہیں کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل وحقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کرسکتا، کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا؟ اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی درحقیقت تھے وہ بڑے فاسق لوگ۔

اور حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ آپؐ اپنی قوم میں کس قدر بے سہارا اور آپ کے چند رفقاء کتنے بیکس اور مظلوم تھے، اللہ تعالے اس دور کو یاد دلاتے ہیں ارشاد فرماتا ہے:

واذ کروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم

الناس.

یاد کرو وہ وقت جب تم تھوڑے تھے زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں۔

حتیٰ کہ ان کی قوم نے ان چند نفوس کو اپنے وطن مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت پر مجبور کیا، جہاں آج ہم سب جمع ہیں۔

غیبی تائید اور اسباب

لیکن اللہ تعالیٰ نے تمام طبعی قوانین کو اس اعلیٰ اور افضل مقصد کے تابع کیا ہے، جس پر انسان کی سعادت کا انحصار اور نجات کا دارومدار ہے، اگر اسباب اور وسائل کو ہر موقع پر اپنی کارکردگی کی پوری آزادی ہوتی، فطرت اپنی مقررہ اور طے کردہ رفتار سے ہر لمحہ سفر کرتی تو انبیاء کرام کی دعوت کی کامیابی مشکوک تھی، طبعی حالات کا غلام ماحول اور یہ مادی معاشرہ دعوت نبوت کو خدانخواستہ نگل جاتے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اخلاق وصفات میں بھی چند خاصیتیں رکھی ہیں، اسی طرح قوی، توانا اور موثر جس طرح مادی اشیاء میں رکھی گئیں۔

سچ کی خصوصیت ہے، اور اس کا اپنا ایک قانون ہے، امانت، خوف خدا غرض ان سب کا اپنا ایک نظام ہے، اعلیٰ صفات، احترام انسانیت، عدل ومساوات، رواداری، مروت، احسان، ایثار قربانی، دنیا پر آخرت کو ترجیح یہ وہ امتیازات عادات اور اعمال ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے بڑی توانائی، پراسرار طاقت، قوت تسخیر، روحانیت، نصرت اور کامرانی عطا کی ہے، کیونکہ وہ بڑا قادر اور علیم ہے۔

کامیابی کا رمز

جب اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مبعوث فرمایا انھیں رسالت سے سرفراز کیا اور اپنی کتابوں کو نازل فرمایا تو ان انبیاء نے عقائد اور ایمان کی دعوت دی، اچھے اخلاق سے مزین اچھی صفات سے آراستہ ہونے کا پیام دیا، اللہ نے انسانوں سے یہ وعدہ کیا کہ عقائد واعمال اور اخلاق وصفات میں اصلاح کے ذریعہ دنیا میں کامیابی غلبہ اور فتح کی میں ضمانت دیتا ہوں

تمہاری کامیابی اور قوت کا رمز یہی دعوت ہے جو انبیاء لے کر آئے اور یہی تمہاری سپاہ ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

انهم لهم المنصورون ، وان جندنا لهم الغلبون.

یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔

انا لننصر رسلنا والذین امنوا فی الحیوة الدنیا ویوم یقوم الاشهاد.

یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

کتب الله لاغلبن انا ورسلی.

خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

انبیاء کرام عقل سلیم کا اعلیٰ نمونہ

انبیاء کرام ماؤف الدماغ، فاتر العقل نہیں تھے، وہ عقل سلیم کا اعلیٰ نمونہ، انتہائی ذکی، اشیاء کی طبعی خصوصیات اور ان کی توانائی سے بخوبی آشنا تھے، نہ وہ فریب خوردہ تھے، نہ لاعلم، انھیں بخوبی علم تھا کہ جب قوت قوت سے، فوج فوج سے، لوہا لوہے سے، تعداد تعداد سے متصادم ہوتی ہے تو ان میں کمزور کو شکست ہوتی ہے، اور قوی غالب آ جاتا ہے۔

جب کسی معرکہ میں صرف مادی قوت پر اعتماد کیا جاتا ہے تو اس میں کمزوری کو ناکامی اور شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مگر انبیاء کرام اس عرفان کے حامل تھے جو مخفی امور پا لیتا ہے، اس ہلکی سی کرن کو ان کی دور بین نگاہ دیکھ لیتی ہے جو ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان حائل رہتی ہے، جسے نصرت الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ وہ صاحب بصیرت انسان ہوتے ہیں کہ جن کی کائنات پر گہری نظر ہوتی ہے، اور اللہ کی نصرت پر یہ کلی اعتماد رکھتے ہیں۔

فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی کشمکش

آپ کو فرعون اور حضرت موسیٰؑ کا وہ واقعہ یاد ہوگا، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ وہ رات کی تاریکی میں جزیرہ نمائے سینا کی طرف روانہ ہوں (وہی جزیرہ نمائے سینا جس کی یاد

ہمارے سوزِ غم کو بڑھا دیتی ہے، اور ہمیں خون کے آنسو رلاتی ہے، ہم نے اپنے ایمان ویقین کو کھونے کی وجہ سے اسے بھی کھو دیا) جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ ساحل سمندر پر پہونچے تو آپ کو قوم بنی اسرائیل کے خوف اور ہراسانی کی کوئی انتہا نہیں رہی، چونکہ سامنے سمندر کی غضبناک موجیں تھیں، اور پیچھے تعاقب کرتا ہوا فرعون اور اس کا لشکر، وہ چیخ اٹھے، ''اے موسیٰ کیا اسی لئے تو ہمیں یہاں لایا، ہم تو پکڑے گئے''۔

قال اصحٰب موسیٰ انا لمدرکون.

موسیٰ کے ساتھی چیخ اٹھے، کہ ''ہم تو پکڑے گئے''۔

ان کا یہ خوف واقعات اور تجربات کی روشنی میں صحیح تھا، اگر فرعون سے بچنے کے لئے وہ سمندر میں کود پڑتے تو ان کا انجام ظاہر تھا، سمندر بغیر کشتی اور جہاز کے پر عافیت گذر گاہ نہیں بنتا، غرق کرنے میں ظالم ومظلوم، حاکم ومحکوم کے درمیان امتیاز نہیں برتتا ہے۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور تھے، انھیں اللہ تعالیٰ کے وعدے پر پختہ یقین تھا، اور نورِ نبوت کے ذریعہ انھیں اس کا علم تھا کہ وہ جس اعلیٰ مقصد کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، جس رسالت کا انھیں اعزاز بخشا گیا، وہ اللہ کے نزدیک سمندر کے عمل اور مقصد سے زیادہ اہم اور لائق احترام ہے، آپ نے پورے اعتماد ویقین سے فرمایا۔

کلا ان معی ربی سیھدین.

ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔

کیا یہ اعتماد اور یقین اس انسان میں پیدا ہو سکتا ہے جو صرف نیچر پر یقین رکھتا ہو؟ فطرت کے ان آہنی اصولوں پر ہی اس کی نظر ہو جو ظالم ومظلوم میں کوئی فرق نہیں کرتے؟ کیا کسی عام انسان سے یہ ایمانی جملہ ممکن تھا، وہ جملہ جس کی آواز آج تک کانوں میں گونج رہی اور تاریخ میں جس کی بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے، سنئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فاوحینآ الیٰ موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر، فانفلق فکان کل فرقٍ کالطود العظیم، وازلفنا ثم الأ خرین، وانجینا موسیٰ ومن معہ اجمعین، ثم اغرقنا الاخرین.

ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ ''مار اپنا عصا سمندر پر'' یکایک سمندر پھٹ گیا

اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا، اسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے، موسیٰ اور ان سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے ہم نے بچا لیا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔

مشعل راہ

تمام انبیاء کرام اگر چہ اشرف ترین خاندان اور افضل ترین نسب رکھتے ہیں، مگر یہ جانتے ہیں کہ دشمن کے مقابلے میں اعلیٰ نسبی سود مند نہیں، انبیاء تنہا عقل و تجربہ، حواس ظاہری کی کارفرمائی، اپنی طاقت، تنظیم اور تعداد پر اعتماد نہیں کرتے چونکہ ان میں ان کا حریف ان سے بدرجہا فائق ہوتا ہے، بلکہ دونوں کی مادی طاقت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، ان حالات میں انھوں نے اللہ تعالےٰ پر اعتماد کیا، ایمان کو مشعل راہ بنایا، اپنے پیام، اعلیٰ اخلاق وصفات کی وجہ سے وہ اپنے دشمنوں سے نمایاں اور ممتاز تھے، ان ہی صفات نے ان کے ساتھیوں کو حیرت انگیز درخشانی وتابانی بخشی تھی۔

وہ معرکہ کارزار میں اللہ پر اعتماد کے سہارے قدم رکھتے تھے، ان کی زبانوں پر اللہ تعالےٰ سے مدد و نصرت، حق کی فتح، باطل کی ناکامی کی دعائیں جاری رہیں۔

تاریخ ساز واقعہ

معرکہ بدر کو ذہن میں تازہ کیجئے، میدان بدر آپ سے زیادہ فاصلے پر نہیں، یوم بدر آپ کی تاریخ میں گمنام اور غیر معروف نہیں، غور کیجئے، جب رسول اللہ صلعم ۳۱۳ مہاجرین وانصار کی مختصر جماعت کے ساتھ اس دشمن کے مقابلے کے لئے نکلے تھے، جو تعداد، آلات حرب، اسباب ووسائل، شجاعت وبہادری میں کئی گنا زیادہ اور جوش غضب سے مغلوب تھا۔

آپ نے جب اپنے بے سرو سامان ساتھیوں اور دشمنوں کے عظیم لشکر کو دیکھا تو ان دونوں میں کوئی نسبت اور تناسب نہ تھا، اس نازک موقع پر آپ کی سلامت فکر فراست نبوت اور تجربہ نے یہ محسوس کر لیا کہ ان لمحات میں مسلمانوں کو طبعی قوانین کے حوالے کرنے کے نتیجہ میں ان کی کامیابی تو درکنار مدینہ صحیح سلامت لوٹنے کی توقع تک نہیں کی جا سکتی۔

آپ اپنے رب کی طرف انابت اور دعا کے لئے متوجہ ہوئے آپ کو بخوبی علم تھا کہ فتح عطیہ الٰہی ہے، طبعی نظام اسی نے بنایا ہے، وہ اسے موقوف بھی کر سکتا ہے، آپ یہ جانتے تھے کہ

فیصلہ آسمان سے نازل ہوتا ہے، زمین سے پیدا نہیں ہوتا، حکم، قوت اور فتح کا سرچشمہ اللہ تعالےٰ کی ذات ہے، آپ نے اپنی جبین مبارک خاک پر رکھی، الحاح وزاری، عاجزی و درماندگی سے اس طرح دعائیں مانگیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آپ کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور بے چین ہو کر انھوں نے فرمایا۔

حسبک یا رسول اللہ

بس بس اے اللہ کے رسول

دعا، کا پاسنگ

معرکۂ بدر تاریخ کا مشہور فیصلہ کن معرکہ ہے، جس کے سایہ میں ہم زندہ ہیں، ہماری حکومتیں، ہم میں مختلف رنگ ونسل کی مسلمان قومیں، یہ سب بدر کی پروردہ ہیں، اور بدر اس دعوت وپیام کا رہین منت ہے، جسے آنحضرت صلعم لائے تھے، بدر میں دو مقابل لشکر نہیں تھے، بلکہ دونوں عدد، اسباب ووسائل میں عدم تناسب کے اعتبار سے گویا دو مختلف پلڑے تھے، ایک پلڑا اپنے بوجھ سے زمین کو چھورہا تھا یہ کفار ومشرکین کا پلڑا تھا، دوسرا بے وزنی کی وجہ سے فضا میں معلق تھا، یہ اہل ایمان کا پلڑا تھا۔ آنحضرت صلعم نے اپنی دعاؤں میں نصرت الٰہی کا پاسنگ مسلمانوں کے پلڑے میں ڈال دیا۔

آپ نے زمین پر اپنی پیشانی رکھی اور وہ جملہ فرمایا جو بلاشبہ مسلمانوں کی اس قلیل تعداد کی بقا بلکہ امت کی بقا کا حقیقی سبب تھا، آپ نے فرمایا:

اللھم ان تھلک ھٰذہ العصابۃ لن تعبد.

اے اللہ اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہوگئی تو تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔

اللہ تعالےٰ نے اس جماعت کی نصرت فرما کر اس کی تصدیق کی۔

تاریخ میں آج بھی یہ واقعہ زندہ اور اس کے آثار اس دنیا میں تابندہ ہیں، انسانوں کی فلاح وبہبودی اسی جماعت سے منسلک ہے، جن کی بقا کی دعا میدان بدر میں ایک آزمائش کے موقع پر اتنے بلیغ انداز میں پیغمبر اسلام نے کی تھی، دین اخلاق فاضلہ، انصاف، احترام انسانیت کا وجود بدر کی اسی مختصر جماعت کا مرہون منت ہے۔

''فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم''؟

اگر آپ چاہیں تو ان تمام حقائق کو ضائع کردیں، اس تمام دولت وثروت کو تلف کردیں تمام انبیاء کی آرہا یہ ں اور مصلحین کی کوششوں کو مٹادیں تو انسان باقی رہے گا، مگر انسانیت فنا ہو جائے گی، جسم متحرک ہوگا، مگر روح پر موت طاری ہوجا ئے گی، اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں مسلمانوں کو واضح کامیابی دی، دشمن اپنی قوت وکثرت کے باوجود ناکام رہا، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

ولقد نصر کم اللہ ببدرٍ وانتم اذلۃ فاتقو اللہ لعلکم تشکرون.

آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کرچکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے لہٰذا تم کو چاہئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گذار بنو گے۔

بحر وبر پر حکمرانی

میں آپ کے سامنے ایک دوسرا واقعہ بیان کرتا ہوں حالانکہ میں داستان گوئی کا شائق نہیں، گر جو واقعہ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں، اس میں ایک پیام ہے، اور نئے معانی پنہاں ہیں، جب سعد بن ابی وقاص مدائن کی فتح کے ارادہ سے روانہ ہوئے، تو دریائے دجلہ میں طغیانی تھی، موجیں اٹھ رہی تھیں، ایرانیوں نے تمام پل اور آبی گذرگاہوں کو توڑ دیا تھا، اور کشتیوں اور جہازوں کو دور کردیا تھا، سعد بن ابی وقاصؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریا کے ساحل پر چند لمحے رکے غور کیا اور فرمایا ساتھیو: کیا خیال ہے، لوٹ جائیں یا دجلہ میں کود پڑیں اور پار ہوجائیں؟

مسلمان اس دور میں اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، انسانیت کی نجات انھیں کے ذریعہ ممکن ہے، اللہ تعالیٰ انسانیت پر مہربان ہے، اور اس نے انسان کو بیکار نہیں پیدا کیا۔

افحسبتم انما خلقنا کم عبثاً وانکم الینا لاترجعون.

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔

مسلمان یہ جانتے تھے کہ وہ اسلام کے نمائندے، اس کی روشنی کے مینار اور اسلامی دعوت کے مشعل بردار ہیں، وہ دنیا کی تمام قوموں میں واحد جماعت تھی، جو اس مقصد کی خاطر تیار کی گئی تھی، رہا دجلہ تو اس طرح کے ہزاروں دریا ہیں، لہٰذا دجلہ کو یہ کیسے اجازت دی جاسکتی تھی کہ وہ اس لشکر کو غرق کرے جس کو کوئی مادی غرض نہیں، جو جزیرۂ عرب سے اس لئے نکلا کہ ایک تخت کے بجائے دوسرا تخت بچھائے، ایک حکومت کے بجائے دوسری حکومت کرے، ایک بادشاہت کو دوسری بادشاہت میں تبدیل کرے، ایرانیوں سے قیادت وسیادت چھین کر عربوں کو پیش کرے اور کسریٰ کا تاج لے کر اسے عمر (رضی اللہ عنہ) کے سر پر رکھے، یہ باتیں مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

شہادت ہے مطلوب ومقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

(اقبال)

ان کی مہم کی غرض یہ رہتی تھی جیسا کہ ان میں سے ایک نے کہا ہے "اللہ نے ہمیں بھیجا ہے تا کہ ہم انسانوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر عبادت کی طرف رجوع کریں، دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کی طرف لائیں، مذاہب کے ظلم وجبر سے اسلام کے عدل وانصاف کی طرف بلائیں"۔

یہ جان کر کہ اب سوائے اللہ پر اعتماد کے کوئی چارہ نہیں اگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوگا، کہ یہ لشکر باقی رہے اپنے پیام کو پہنچائے اور اپنے دین کو پھیلائے اور لوگوں کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی کی طرف لے جائے اور ان پر پڑی ہوئی ظلم وستم کی زنجیروں کو دور کردے تو اللہ تعالیٰ یقیناً دریائے دجلہ کو اس پہ مامور کرے گا کہ وہ اسلامی لشکر کے لئے راستہ دے دے۔

مومنانہ فراست

حضرت سعدؓ نے اس موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ سے مشورہ کیا، انھوں نے جواب دیا، "بیشک اسلام ایک تازہ پیام ہے" یہ جملہ میرے قلب وذہن کو بہت متاثر کرتا ہے، کیونکہ اس میں بڑے گہرے معانی مضمر ہیں، اس جواب میں مومن کی ذہانت کا نور جھلکتا ہے، میری مراد عقل عام نہیں بلکہ فراست مومن ہے، جس کا یہ جملہ بہترین نمونہ ہے۔

حضرت سلمانؓ نے فرمایا ''بخدا تری ان کے لئے ایسے ہی زیر کردی جائے گی، جیسے خشکی مسخر کی گئی تھی، اس میں سے فوج در فوج لوگ نکلیں گے، جیسے فوج در فوج داخل ہوئے''، سلمانؓ کے قول کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ اس دنیا کو تمام ادیان پر غالب کرے چونکہ اسلام نے ابھی تک اپنی مہم پوری نہیں کی، اس کے سامنے وسیع میدان ہے، بہت سی قومیں اور قبائل ہیں متمدن ممالک ہیں اور یہ پوری دنیا اس دعوت کی منتظر ہے، جس کے وہ حامل ہیں، ان اخلاق وصفات کی منتظر ہے، جن سے یہ آراستہ ہیں، دنیا اس نجات دہندہ سپاہ کی منتظر ہے، حضرت سلمانؓ نے سچ کہا کہ میری مومنانہ عقل اسے قبول نہیں کرتی کہ ہم غرق ہوں گے اور دجلہ ہمیں نگل لے گا، اللہ تعالےٰ اسے ضرور حکم دے گا اور مامور کرے گا کہ وہ ہمارے لئے راہ دے اور تاریخ اس سے گواہ ہے کہ ہوا بھی یہی۔

ایمان وعقیدہ کا نظام

یہ دو خدائی نظام ہیں، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ایک طبعی نظام اقلیت پر اکثریت کا غلبہ، ضعف پر طاقت کا غلبہ، انتشار پر اتحاد کا غلبہ، بدنظمی پر انتظام کا غلبہ، کمزور ارادے پر قوی ارادے کا غلبہ اور کاہلی وجہالت پر علم ومستعدی کا غلبہ، یہ ایک قدیم نظام ہے، جسے اللہ تعالےٰ نے پیدا فرمایا ہے، اور اس کا حکم اور قانون اس وسیع وعریض دنیا اور انسانیت کے بڑے حصے میں جاری وساری ہے۔

لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک دوسرا نظام بھی ہے، وہ ایمان وعقیدے کا نظام، اخلاق وصفات اور دعوت وپیام کا نظام ہے، اور یہی وہ سلاح ہے، جس کے ذریعہ مومن جنگ کرتا ہے، اور کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے، یہی وہ ہتھیار ہے، جس کو لے کر عرب، جزیرۂ عرب سے نکلے تھے، پھٹے کپڑے، ٹوٹے جوتے، خالی پیٹ اور بغیر زین کے گھوڑوں کے ساتھ، لوگ انھیں حقارت سے دیکھتے اور مذاق اڑاتے اور کہتے ''انھیں ان کے جزیرہ سے بھوک اور برہنگی نے نکالا ہے، انھیں خوب کھلاؤ اور پلاؤ یہ اپنے وطن لوٹ جائیں گے۔

موجودہ عربوں کی دونوں نظاموں سے بغاوت

یہ دو خدائی نظام ہیں لیکن جب کوئی فرد یا جماعت ان دونوں نظاموں کو چھوڑ دیتی ہے اور

ان دونوں سے بغاوت کرتی ہے، یعنی نہ نظام طبعی کے تقاضے پورا کرتی ہے اور نہ دین واخلاق ہی کے نظام ہی کو اپناتی ہے تو اس کا کیا انجام ہو سکتا ہے؟"

آج کے عربوں میں خواہشات کی پیروی، باہمی رزم آرائی، اپنی قومیت پر فخر اور صرف کھوکھلے دعوت اور بلند بانگ نعرے ہیں، بے معنی شور وغوغا ہے، بدنظمی و بے تدبیری ہے، کیا ایسا ملک اور ایسی فوج فتح کی مستحق ہو سکتی ہے؟

نسل ونسب

اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان نسب کا کوئی رشتہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

وقالت اليهود والنصرى نحن ابناء الله واحبآئه، قل فلم يعذبكم بذنوبكم، بل انتم بشر ممن خلق۔

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے چہیتے ہیں ان سے پوچھو پھر وہ تمہارے گناہوں پر کیوں سزا دیتا ہے، درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے۔

خدا کسی انسان کو دوسرے انسان پر، کسی فرد کو دوسرے فرد پر، ایک قوم کو دوسری قوم پر، نسب، قومیت، ذات و برادری کی بنیاد پر فضیلت نہیں دیتا، وہ انسانوں کو ان کی دیانت وتقویٰ والی زندگی پر افضل قرار دیتا ہے۔

ان اكرمكم عندا لله اتقكم.

اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

وہ حبش کے غلام بلالؓ کو قریش کے معزز سردار ابوجہل سے افضل قرار دیتا ہے۔

۵/ جون کی جنگ

جب ہم اس جنگ میں کودے تو گویا ہم تہی دامن تھے، نہ ہمارے پاس طبعی نظام تھا، جو ہم میں بیداری، احتیاط، اتحاد باہمی، محبت، ایثار، قربانی، سرفروشی اور شجاعت پیدا کرتا، ہمیں محنت ومشقت کا عادی بناتا اور دنیاوی چمک دمک کی حقارت ہمارے دلوں میں پیدا کرتا، ہم اس طبعی قانون کے بھی پوری طرح پابند نہیں تھے، نہ ہمارے پاس وہ مقدس نظام ہی تھا، جس کی

کامیابی کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے کی ہے، اور فرمایا ہے:

وان جند نالھم الغلبون.

اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔

اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ" ان جند ناغالبون" تو کافی تھا، یہ فرماتا کہ" ان جند نا لغالبون" تب بھی کافی تھا لیکن بات میں زور، یقین اور وزن پیدا کرنے کے لئے فرمایا گیا:

انھم لھم المنصورون، وان جندنا لھم الغلبون.

یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔

انا لننصرر سلنا والذین امنوا فی الحیوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد.

یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

جنگ کے زمانہ میں مصر کی اخلاقی ودینی حالت

ہم جب میدان جنگ میں پہونچے تو ہم نے ہوائی باتوں، بے سروپا دعووں پر اعتماد کیا، ہم دشمن سے عالم خیال میں معرکہ آرائی کرتے رہے، لذائذ وخواہشات کے غلام بنے رہے، ان قوموں کی طرح جن کی مثالیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بکثرت بیان فرمائی ہیں، نہ جانے ہم کس انجام کے منتظر تھے؟

میں آپ کے معاملہ میں صاف گوئی اور حق گوئی پر مجبور ہوں کیوں کہ میں جب دنیا کے کسی خطہ میں بھی جھوٹ سے پناہ مانگتا ہوں تو رسول اللہ کے جوار اور ان کی مسجد کے زیر سایہ غلط بیان سے کیوں کام لوں؟ ہماری زندگی کا جو رخ تھا اور ہے اس کا اندازہ تو ہمارے ریڈیو اور ہماری صحافت سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

صرف زمانہ جنگ اور اس سے چند دن قبل کے اخبارات ورسائل پڑھئے کیا یہ اخلاق اور یہ طریقۂ زندگی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا موجب ہو سکتا ہے؟ کیا ام کلثوم (۱) کے گیت اللہ تعالیٰ ورسول کی رضا اور فتح وکامرانی کے نزول کا ذریعہ بن سکتے ہیں؟ کیا نائٹ کلب، عریانی وبے حیائی کے اڈے، جسے ہمارے بھائیوں نے اس ملک، میں نئی زندگی بخشی جس پر مقدس اسلامی مقامات کے دفاع کی سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ہمیں رسوائی

وہزیمت سے بچا سکتے ہیں؟

ایک غیر عرب بادشاہ کا عمل

مسلمانوں پر تو یہ لازم تھا کہ وہ ہنگامی حالات میں رہتے، اور ہمیشہ مستعد اور تیار رہتے، اپنے آپ پر اللہ کی مباح کی ہوئی لذتیں تک حرام کر لیتے، اور ان پہ بے چینی اور ہمہ وقت بے کلی طاری رہتی، زندگی ان کے لئے تلخ ہو جاتی، یہ سانحہ اس کا متقاضی تھا، تاریخ میں ایک غیر عرب بادشاہ نے یہی کر کے دکھایا ہے، جب شہنشاہ بابر (اس سلطنت مغلیہ کا بانی جو ساڑھے تین سو سال تک ہندوستان میں رہی) کا مقابلہ اس کے دشمن رانا سانگا کے لشکر سے ہوا تو یہ

دونوں لشکر تعداد و اسباب کے اعتبار سے بیّن فرق رکھتے تھے، بابر کے ساتھ صرف بیس ہزار سپاہی تھے، اور رانا کا لشکر ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔

بابر شراب کا رسیا تھا، تاریخ میں یہ مشہور بات ہے کہ وہ ہمہ وقت شراب میں مست رہتا مگر اس نازک اور آزمائشی موقع پر اس نے کامیابی کے لئے دعا کی اور شراب اور تمام شرعی محرمات اور منکرات سے توبہ کی اور میدان جنگ میں کود پڑا، دشمن سے زبردست جنگ کے بعد عظیم الشان فتح حاصل کی، اور اس وسیع مسلم حکومت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوا، جس کے لازوال اجتماعی وتمدنی آثار اب بھی باقی ہیں۔

حقیقت پسند فوجوں کا یہ طرز ہوتا ہے، اور حقیقت دوست لوگ ایسے ہوتے ہیں، رہا شکست خوروں کا حال تو ان کی داستانیں مشہور ہیں _ انھیں مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں۔

کیا یہ رزم وجنگ الف لیلہ کے ڈراموں میں سے کوئی ڈرامہ ہے کہ کوئی طائفہ کوئی تمثیل مزاحاً اور تفریحاً پیش کرے، یہ بادشاہ، وہ وزیر یہ فوجی وغیرہ جب کوئی حقیقی مسلح لشکر آجاتا ہے تو مسخروں کی فوج بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور ڈرامہ دھرا رہ جاتا ہے۔

نمائشوں، ڈراموں کا خاص موقع ہوتا ہے، یہ امن آسائش کا زمانہ اور اطمینان وفراغت کے ماحول میں کئے جاتے ہیں۔

شکست تعجب خیز نہیں

اب ایسی صورت میں ہم کیوں نہ اس نکبت وذلت اور رسوائی کے مستحق ہوتے جو ۵ جون

کے سانحہ میں ہمارے حصہ میں آئے۔

اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں سے ایک صفت عدل بھی ہے ہم سب کا اس پر ایمان ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم واقعی اس شکست کے مستحق تھے، شکست کا ہونا تعجب خیز اور حیرت انگیز اور بعید از قیاس نہیں اس کے برعکس ہوتا تو حیرت اور تعجب کی بات تھی۔

کیا اللہ تعالےٰ ان نام نہاد مسلمانوں کی مدد کرتا جو اپنے بھائیوں کے دشمن اور اپنے دشمن کے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

محمد رسول الله والذين معه اشدّاء على الكفار رحمآء بينهم.

محمدؐ خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل۔

یمن کی داستان غم (۱)

مگر ہم دشمنوں کے بارے میں رحم دل اور آپس میں انتہائی سنگدل ہیں، اس غریب یمن کا کیا قصور تھا؟ اسے اپنی بہادری، جنگ آزمائی اور انتقام کا مرکز و میدان کیوں بنایا گیا؟ یہ شجاعت اپنے حقیقی دشمن کے خلاف کیوں استعمال نہیں کی گئی؟ مگر مصریوں کا حال تو اس شعر کے مصداق ہے۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ظلم وستم کے شکار یمنی مسلمانوں کے خون ناحق کی پرسش جب اللہ تعالےٰ فرمائے گا، تو ان کے پاس کیا جواب ہوگا؟ وہ منصف حقیقی تو قرآن مجید میں فرماتا ہے:۔

واذا المودة سئلت، باى ذنب قتلت.

---

(۱) مبصرین کا اندازہ ہے کہ اس بے مقصد اور بلاوجہ جنگ کے نتیجے میں جو مصر کی طرف سے یمن کے خلاف لڑی گئی دو لاکھ مسلمان شہید ہوئے، مصریوں نے اس جنگ میں وحشت و بربریت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے، جنگ کے زمانے میں غاروں میں پناہ لینے والے غریب یمنی عرب مسلمانوں پر زہریلی گیس چھوڑی جاتی تھی، جس کا استعمال بین الاقوامی قانون جنگ کے خلاف اور اقوام متحدہ کے اصول حقوق انسانی کے منافی ہے، شدید سردی میں مصری جہاز یمن میں گرم سیوٹر گراتے غریب یمنی اسے ایک نعمت سمجھ کر پہنتے مگر اس میں موت پوشیدہ ہوتی تھی، ان اونی سویٹروں میں ایسے بم پوشیدہ ہوتے جو پہننے والے کے جسم کے چیتھڑے اڑادیتے۔

جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی۔

ایک نوزائیدہ بچی کے قتل ناحق پر جو عہد جاہلیت میں زندہ دفن کی جاتی تھی، اللہ تعالےٰ کے یہاں اس کے قاتل سے پرسش ہوگی تو قوم کی اتنی بڑی تعداد کے قاتل قیامت میں اپنا دامن کیسے چھڑا سکیں گے۔

قریب یارو ہے روز محشر، چھپے گا کشتوں کا خوں کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

وہ اہل یمن جن کے متعلق حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

اتاكم اهل اليمن، ارق افئدة و الين قلوباً، الايمان يمان، والفته يمان، والحكمته يمانية(صحيح بخاری)

تمہارے پاس یمن کے لوگ آئے ہیں، جن کے دل سب سے زیادہ نرم اور رقیق ہیں، ایمان یمن کا حصہ ہے، دین کی سمجھ یمن کی سوغات ہے اور حکمت یمن کا مال ہے۔

اس قوم کا کیا قصور تھا؟ کیوں یہ اس تباہی کا مستحق قرار دی گئی؟

"نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری"

یہ میری قسمت میں نہیں تھا کہ میری پیدائش اس مقدس مقام پر ہو، اللہ تعالےٰ کی حکمت اور مشیت کہ میں بہت دور پیدا ہوا، میری نشو ونما ایسے ملک میں ہوئی جہاں عربی زبان بولی نہیں جاتی، یہاں ہمارے استاد علامہ تقی الدین ہلالی[۱] مراکشی تشریف فرما ہیں، ان سے ہمارے ملک کے متعلق دریافت کیجئے، یہ عرصہ تک وہاں مقیم رہے، ایک ایسا ملک جو مرکز اسلام سے طویل فاصلے پر ہے، وہاں کے لوگ عربی زبان سے بہت کم واقف ہیں، مگر الحمد اللہ اپنے اسلامی عقیدے پر نازاں ہیں، ہمارا اس پر پختہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ ہماری سعادت، کامیابی اور بقا کا راز حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی میں مضمر ہے، ہمارے شاعر نے کہا ہے:

(۱) علامہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی عرصہ تک دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس رہے، موصوف کے شاگردوں میں اس کتاب کے مصنف کے علاوہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، مولانا ابوالليث صاحب ندوی، مولانا حافظ محمد عمران خان صاحب، ندوی اور کئی حضرات ہیں، جنھوں نے علمی، دینی، سماجی اور تعلیمی میدان میں ممتاز مقام حاصل کیا۔

محمد عربی کا بروئے ہر دو سرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

حضرت محمد صلعم کی قیادت کو تسلیم کئے بغیر ہم کبھی فوز و فلاح نہیں پا سکتے، اگر آپ نے اس سے انکار کیا جیسا کہ عرب قومیت کے رہنماؤں نے کیا ہے تو اس کے نتیجہ میں تائید غیبی فتح و نصرت اور عزت و سر بلندی سے ہم محروم ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ نے عربوں کی ترقی و سر بلندی اور مستقبل کو حضرت محمد صلعم کے دامن سے وابستہ رکھا ہے، کسی اشتراکی لیڈر اور قومیت کے رہنما سے نہیں۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

نہ صرف عربوں کی بقاء ترقی، عزت و سر بلندی اور فتح و کامرانی کا انحصار محمد رسول اللہ کی غلامی اور پیروی میں ہے، بلکہ آپؐ کی بعثت کے لمحے سے قیامت تک تمام دنیا کے انسانوں کی فلاح و بہبود، سعادت و نجات آپؐ ہی کے نقش قدم کے اتباع اور دامن سے وابستگی میں ہے۔

عرب قومیت کے علم برداروں نے کیا دیا؟

حیوانات کی بڑی تعداد، واقعات اور تجربات سے فائدہ اٹھاتی ہے، سبق حاصل کرتی ہے، ہم کیوں نتیجہ نہیں نکالتے؟ نفع اور نقصان کا گوشوارہ نہیں تیار کرتے؟ ہمیں ان عرب قومیت کے زعماء اور انتہا پسند ملحد لیڈروں نے کیا دیا؟ کس برے انجام کے رخ کو انھوں نے موڑا؟ کون سی آفت ٹالنے میں یہ کامیاب رہے؟ کون سا کھویا ہوا اعتماد انھوں نے دوبارہ حاصل کیا؟ اقتصادی اور معاشی خوشحالی لانے میں یہ کب کامیاب رہے؟ صنعت و حرفت ایجاد و اختراع میں عرب ممالک کی پسماندگی اور محتاجی کہاں ختم ہوئی؟ انھوں نے تو ہماری تابناک تاریخ پر سیاہی پھیر دی، ہمارے رعب و اثر کا بڑا حصہ لوگوں کے دلوں سے زائل کر دیا، ہمیشہ اپنی اسلامی عربی تاریخ پر فخر کیا کرتے تھے، .... مگر آج ...... عام مجلسوں میں اس کا حوالہ دینا دشوار ہو گیا ہے، جو عظمت رفتہ ہمیشہ حال و مستقبل میں حوصلہ دیتی رہی وہ ان لیڈروں کی بے دانشی کی نذر ہو گئی۔

عرب قومیت میں غیر عربوں کے لئے کوئی کشش نہیں

یہ کوئی دانش مندی کی بات اور عقل مندی کا تقاضا نہیں کہ ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا، ترکی، ملیشیا کا انسان تمہاری عرب قومیت کی وجہ سے تمہارا احترام کرے، وہ تو اسلام، ایمان اور انسانیت کی ہدایت کے لئے تمہاری تاریخی کوششوں کی بنا پر تمہارا احترام کرتا ہے، کمزوروں کی دستگیری، ظالموں کی سرکوبی یہ تمہارا شعار رہا، تمہارے اعلیٰ اخلاق وصفات اور اسلامی دعوت سے تمہاری وابستگی نے مشرق ومغرب کے مسلمان کے دل میں تمہاری محبت جاگزیں کی اور ان ہی خصوصیات کی وجہ سے اسلامی دنیا نے تمھیں ہمیشہ اپنے سینے سے لگایا، اور محبوب رکھا، صدیوں پہلے جزیرۃ العرب سے نکل کر تم نے اسلام کی روشنی وسط ہند تک پہونچائی، افغانستان، ایران، سمرقند، بخارا یہ سب تمہارے زیر نگیں ہو گئے، یہ وہ ممالک ہیں، جن کی تاریخ شکست سے ہمیشہ ناآشنا رہی، انھوں نے کبھی تلوار کی دھار کے آگے گردن نہیں ڈالی، انھیں اسلام نے شکست دی، اسلام کے اعجاز، اس کے پیام ودعوت کے آگے یہ جھک گئے، عربوں نے انھیں اپنا غلام نہیں بنایا بلکہ اسلام نے انھیں اپنا حلقہ بگوش کیا، یہ انصاف، مساوات اور انسانیت کی خیر خواہی کے ان مظاہر کے آگے سپر انداز ہوئے جنھیں تم لے کر پہونچے تھے اس دعوت سے دنیا کی مختلف رنگ ونسل کی قومیں متاثر ہوئیں، جسے حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور جس میں پوری انسانیت کی فلاح ونجات کا سامان تھا۔

قومیت عربیہ اور عالم انسانیت

مجھے بتلائیے کہ عالم انسانیت کے لئے قومیت عربیہ کے پاس کیا پیام اور کون سا فلاحی پروگرام ہے؟ تمام بنی نوع انسان کی کون سی بہتری کسی بھی قومیت کی دعوت میں ہے؟ قوم، جنس، رنگ ونسل کے حریف تو ہر جگہ ہیں، اگر تمھیں اپنی عرب قومیت پر فخر ہے تو دنیا میں سینکڑوں قومیں ہیں جنھیں اپنی اپنی قومیت پر فخر ہے، کسی قومیت کو دوسری قومیت یا کسی قدیم تہذیب وکلچر پر اپنی دوسری قدیم تہذیب کو کوئی افضلیت نہیں، افضلیت تو اس پیام کے لئے ہے، جسے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پیش فرما گئے۔

دنیا تمہاری منتظر ہے

اے عربو! اسلامی دنیا تمہارا احترام کرتی ہے، اس کی قدر کرو، اسلامی غیرت اور انسانی ہمدردی کے باقی ماندہ اثاثے کو لے کر اٹھو، دنیا تمہاری منتظر ہے کہ تم اسے اس بیسویں صدی کی جہالت سے نکالو، جس نے اسے پامال اور مشرق ومغرب کو مسموم کر دیا ہے، قیادت اور ہدایت کے اپنے دیرینہ منصب ومقام کی طرف لوٹو، آفاق کی وسعتوں میں دعوت اسلامی کا فریضہ انجام دو، کامیاب اور کامرانی ہر معرکہ میں تمہارے ہم رکاب ہوگی۔

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

''ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم''۔

اجتہاد اور فقہی مذاہب کا ارتقاء

الحمد للہ و کفی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفی. اما بعد.

اسلام کی دائمی حیثیت:

حضرات! یہ بنیادی حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور ترقی پذیر ہے، ہمیشہ جوان رہتی ہے، اس میں نشوونما کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے، ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ نیز ایک رنگ سے دوسرے رنگ میں ڈھلتی رہتی ہے۔ اسے جمود یا ٹھہراؤ لاحق نہیں ہوتا، نہ ہی یہ بڑھاپے اور تعطل کا شکار ہوتی ہے۔ اس کے طویل اور مسلسل سفر میں وہی حرکی دین اس کے ہم رکاب ہوسکتا ہے جو نہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہے، نہ ہی اس سفر سے عاجز آئے، بلکہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلے۔ اور اس کا جوہر حیات اور ارتقاء ختم نہ ہو۔ اسلام ہی ایسا دین ہے۔ اگرچہ اس کا خمیر پختہ عقائد اور ابدی حقائق سے اٹھایا گیا، تاہم وہ زندگی سے لبریز اور ارتقاء سے پر ہے۔ اس کے ہاں ایسا جوہر حیات موجود ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور ایسا مواد ملتا ہے جو کم نہیں ہوتا۔ یہ دین ہر زمان و مکان کے لئے عمل ہے۔ اس کے پاس ایسی روشنی ہے جو زندگی کے ہر نئے انداز کے لئے نسل انسانی کے لئے تاریخ کے ہر دور میں، یکساں مفید ہے۔

اکثر مسلمانوں کے عقیدے کے برعکس اور بہت سے مستشرقین اور مغربی مورخین کی پیش کردہ تصویر کے برخلاف، اسلام کی ایک دور کی تہذیب نہیں، نہ ہی کسی خاص تاریخی دور کی صنعت و حرفت سے عبارت ہے کہ وہ اسی دور کے آثار و قواعد کی نمائندگی کرے۔ پتھروں رسومات اور تصاویر میں زندہ رہے جبکہ حقیقی زندگی سے اسے کوئی تعلق نہ ہو، اور مسائل زیست کو اپنے پیغام کی روشنی میں حل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جیسا کہ یونانی اور رومی تہذیبوں نیز ترکی اور مغلیہ صنعت و حرفت کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

بلکہ وہ ایک زندہ دین ہے۔ اس کا پیغام ابدی ہے، وہ زندگی کی طرح زندہ اور فطری حقائق

اورزندگی کے قوانین کی مانند ابدی اور دوائی ہے۔ کیونکہ اسے عطا کرنے والا طاقت والا، غالب اور جاننے والا ہے۔

صنع اللہ الذی اتقن کل شیء (سورۃ النمل آیت ۸۸)

(ترجمہ) اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو خوب پختہ طور پر بنایا ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

(ترجمہ) اب ہم تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر چکے اور ہم نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور ہم نے تمہارے لئے (اسی) دین اسلام کو پسند کیا۔

اس دین کو کاملیت حاصل ہے، اس کے بعد کسی اور دین کا انتظار نہیں ہوگا، اس کی موجودگی میں کسی نئے پیغام کی ضرورت نہیں۔ اس میں ایسا جوہر حیات موجود ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور اس میں نمو کی وہ کیفیت ہے، جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اسی وجہ سے وہ ایک طرف زندگی کے دوش بدوش اور اس کے قدم سے قدم ملائے رواں دواں ہے، تو دوسری جانب اس کی اصلاح اور درستگی کے لئے اس کی نگرانی اور رہنمائی کرتا ہے، اور اس کی کجی اور گمراہی کو درست کر دیتا ہے۔ وہ بہت سے تحریف شدہ ادیان کی طرح ترقی کی راہ میں حائل نہیں، نہ ہی وہ بہت سے نظری فلسفوں کی طرح جامد نگراں ہے یہ زندہ انسانوں کے لئے زندہ اور کامل دین ہے جو انسانی شعور کا ادراک رکھتا اور اس کی ضروریات کا انتظام کرتا ہے، مشکلات میں اس کی رہنمائی کرتا اور برائی کی جانب جانے سے اسے روکتا ہے۔

امت مسلمہ، شریعت اسلامیہ، اور انسانی زندگی:

امت مسلمہ اس امر کی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ لاتعداد تغیرات، غیر محدود اور قیاس کی حد سے فزوں تر مسائل کا حل پیش کرے۔ چنانچہ وہ زمان ومکان کے خلاف اور لباس و ماحول کی بو قلمونی کا دو قوتوں سے مقابلہ کر سکتی ہے۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اجہاد اور مجتہدین:

اسلام جزیرۃ العرب میں طلوع ہوا یہاں زندگی سادہ اور تہذیب اپنے ابتدائی دور میں

تھی۔ وہاں سے اسلام ایسے وسیع اور زرخیز علاقوں میں پھیلا جو قدیم تہذیبوں کے مراکز اور وسیع علاقوں پر مشتمل تھے جیسے شام، عراق، مصر اور ایران۔ یہاں سماجی زندگی وسیع ہو چکی تھی۔ تجارت، حکومت، زراعت آبپاشی اور ٹیکسوں کے نظام رائج تھے۔ سب سے اہم جو مسئلہ درپیش تھا وہ یہ تھا کہ اسلامی اصولوں کو ان امور اور مسائل سے ہم آہنگ کیا جائے اور معاشرے کو اسلامی اصولوں کو ان امور اور مسائل سے ہم آہنگ کیا جائے اور معاشرے کو اسلامی روح اور اساسیات کا تابع بنایا جائے۔ یہ کام بلند پایہ ذہانت، باریک بینی اور ہم عصر معاشرے سے مسلمانوں کی گہری واقفیت کا متقاضی ہے اس کے ساتھ نفسیات اور انسانی فطرت سے کامل آگہی نیز قوم کے مختلف گروہوں اور زندگی کے زاویوں کے بارے میں وسیع تجربہ چاہتا ہے۔ مزید برآں وہ یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ کتاب وسنت میں موجود دین کے فقہی سرمایہ کی وسیع معلومات حاصل ہوں، علم کے بنیادی آخذ اور اسلامی قانون سازی کے اساسی قواعد میں ممارست نیز عربی زبان میں مہارت اور کمال حاصل ہو۔ کیونکہ یہی وہ زبان ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا اور جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادات فرمائے۔

اس امت پر اللہ تعالی کا کرم ہے کہ اس نے اس اہم منصب کی سہولت کے لئے امت کو ایسے رجال کار عطا فرمائے جن کا شمار نابغہ روزگار میں ہوتا ہے اور ان کی نظیر نہیں ملتی۔ ان حضرات نے تفقہہ، امانت اور خلوص میں منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ انہیں حضرات میں سے یہ چار آئمہ بھی ہیں۔

الف۔ امام ابوحنیفہ متوفی ۱۵۰ھ

ب۔ امام مالک متوفی ۱۷۹ھ

ج۔ امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ

د۔ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ ان

فقہاء کا فقہی سرمایا زندہ جاوید ہے اور عالم اسلام میں سے اکثریت اس پر عمل پیرا ہے۔ یہ چاروں فقہاء وسیع اور دقیق نکتہ فہمی میں ممتاز تھے۔ انہوں نے فقہی اور قانونی متاع کو تشکیل دینے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کیں اور اپنی خداداد صلاحیتیں صرف کیں۔

اس فقہی متاع کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ فقہ آج کے دور میں بھی قانون سازی

کے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان آئمہ نے اپنے کو اس گراں قدر خدمت کے لئے وقف کیا اور آج امت مسلمہ ان کی پیروی کر رہی ہے۔ انہوں نے زندگی میں ہر آرام، راحت اور منصب و مرتبہ قربان کر دیا اور ان میں سے ہر ایک نے علمی متاع اور فقہی میراث یادگار چھوڑی جو آج کے علمی اداروں اور بڑی بڑی تنظیموں کے پاس موجود ہے۔ اللہ تعالی نے ان فقہاء کو سعادت مند شاگرد عطا فرمائے تھے، جو نہ صرف ان کی علمی میراث کے وارث ہوئے بلکہ انہوں نے اس میں اضافے کئے۔ وہ اس کی چھان پھٹک کرنے اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ فقہا میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ وہ ان کے بعد کے زمانوں اور ان کے ملکوں سے باہر نکل کر دوسرے علاقوں میں رائج ہو سکے۔

امت اسلامیہ کی زندگی میں اجتہاد کی فضیلت:

ان آئمہ مجتہدین اور فقہائے کرام کا وجود اسلام کی ابتدائی صدیوں میں روشنی کا مینار تھا۔ ان کی کوششوں اور دانائی کے سبب امت کے سماجی امور، باہمی معاملات اور مالی پالیسیوں میں وحدت عمل پیدا ہوئی۔ اور یہی وحدت عبادات، خاندانی نظام اور شخصی قانون میں بھی نظر آنے لگی۔ اسی اتحاد نے دینی اور فکری ہم آہنگی کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ امت اس سماجی اور قانونی انتشار سے محفوظ رہی ہے جس انتشار کا دوسری قومیں اور ادیان اپنے ابتدائی ادوار میں شکار ہوئے اور یہی انتشار آہستہ انہیں غیر دینی زندگی کی طرف لے گیا اور اس طرح ایسا دینی نظام وجود میں آیا کہ اقوام اپنے دین کی مبادیات کے خلاف دیگر اقوام کی خوشہ چینی کرنے لگیں یا مسیحیت کی طرح دین سیاست سے جدا ہے کے مفروضے کے مطابق عمل کر دیا۔

اگر ابتدائی دور کے علمائے کرام اجتہاد اور مسائل کے استنباط میں سستی سے کام لیتے اور محنت و مشقت پر آرام و راحت کو ترجیح دیتے تو ان کے علمی نتائج اور کارنامے کمزور ہو جاتے اور ان کے اذہان پر جمود طاری ہو جاتا چنانچہ زندگی کی عملی مشکلات اور تقاضوں کے پیش نظر حکومتیں مجبور ہو جاتیں کہ وہ روسی اور ایرانی نظاموں کی خوشہ چینی کریں، اسلامی ریاست میں رومی اور ایرانی قانون نافذ کریں کیونکہ انتظامی ڈھانچہ کو چلنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور قانون سازی کے انتظار میں زندگی کی حرکت کو کوئی معطل نہیں کر سکتا، اسی طرح تجارتی معاملات کی تکمیل اور

دینی فرائض کی ادائیگی میں تاخیر نہیں کی جا سکتی کہ علمائے کرام غور و خوض کر کے کسی حتمی نتیجہ تک پہنچ جائیں اور ان امور کی بجا آوری ممکن ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو امت کی بہت بڑی بدبختی ہوتی کیونکہ وہ اسلامی قانون کی برکتوں، اسلامی معاشرے کی نعمتوں، اسلامی شریعت اور سنت نبوی کی رہنمائی سے محروم ہو جاتی۔ یہ امر اس کا مقدر ہوتا کہ وہ دیندار امت کی حیثیت سے نہ صرف مسجدوں میں وقتی طور پر زندہ رہتے۔ ان کے گھر، بازاروں اور عدالتوں میں کبھی سے جاہلیت یا لادینیت کا دور دورہ ہوتا جیسا کہ ان ممالک اور ریاستوں میں ہے۔ جن کا سرکاری مذہب عیسائیت ہے لیکن وہ عیسائی قانون سے محروم ہیں۔ افسوس اور ندامت کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، کہ جیسا ان ممالک اور ریاستوں میں ہے جو عقیدہ اور عبادات میں تو اسلام پر یقین رکھتی ہیں لیکن اسلامی قانون اور شریعت ان کے ہاں رائج نہیں۔ عیسائیت کو ایسا راس آ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ آئین کی دولت سے محروم ہے۔ اس لئے وہ پوری زندگی میں دین کے نفاذ پر اصرار نہیں کرتی لیکن اسلام میں یہ تصور لانا آسان کام نہیں کیونکہ وہ دین اور ریاست، عقیدہ اور سیاست نیز عبادت اور سماج سے عبارت ہے اور امت اپنی زندگی کے خطرناک اور مشکل دور سے کامیابی کے ساتھ گزر کر آگے بڑھی اور صدر راستے پر کھڑی تھی ایک بڑی غلطی ہو یا دس چھوٹی غلطیاں اسلام کی سماجی زندگی یا سیاسی نظام سے تعلق توڑنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں آئندہ نسلوں کے لئے دین کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنا برائے نام رہ جاتا ہے۔

یہی حال تفصیلی احکام کا ہے۔ جن امور کا تعلق عبادات سے ہے ان میں جو مسائل اور مشکلات درپیش ہوتی ہیں اور بتقاضائے بشری جو غلطیاں اور کمزوریاں سرزد ہوئی ہیں۔ بسا اوقات سہو، بھول، نسیان، غفلت وغیرہ کی بنیاد پر ہوتی ہیں جو التباس لاحق ہو جاتا ہے وہ کبھی جان بوجھ کر ہوتا ہے اور کبھی شریعت سے عدم واقفیت کی وجہ سے۔ ان میں جو کمی بیشی پائی جاتی ہے اس کے اسباب علم، دینی ثقافت اور اسلامی تربیت میں فرق ہے یا قبولیت اسلام میں تقدیم وتاخیر ہے، مکمل اسلامی ماحول، اسلام اور جدید معاشرتیں یا مخلوط ماحول بھی ان وجوہات کا حصہ ہیں۔ یہ تمام معاملات فیصلہ کن جواب اور فوری حل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک شخص جواب نہ ملنے کی وجہ سے نماز سے منہ موڑ گیا حالانکہ وہ اس کا احترام کرتا ہے اور یہ روزہ دار ہے جس نے اپنے کو کھانے سے روک لیا، اور یہ امر بھی فتویٰ چاہتا ہے کہ مسلمان پر کن مال میں زکوٰۃ فرض

ہوتی ہے؟ زکوۃ کی مقدار کیا ہے؟ اس کے مصارف کون سے ہیں؟ یہ ہی حال حج کا ہے۔ جو ایک وسیع فریضہ ہے؟ جو لمبی مدت، طویل مسافت، ایک رکن سے دوسرے رکن نیز ایک جگہ سے دوسری جگہ نہایت احتیاط اور پیچیدگی سے منتقل ہونے پر مشتمل ہے۔ ان امور کی بجا آوری کے لئے رہنمائی، شرعی حکم، سنت نبوی اور اسوۂ رسول اللہ علیہ وسلم سے واقفیت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں مہلت دینے کا امکان ہو۔ جس شخص کو یہ مسائل درپیش ہوتے ہیں اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ انہیں سابقہ شریعتوں کے ماخذ سے تلاش کر لے یا غلطی کا شکار رہے۔ اس لئے لازمی ہے کہ ضروری احکام، ان کی جزئیات اور فقہی معلومات بآسانی میسر ہوں اور ایسے علمائے کرام بھی موجود ہوں۔ جو شرعی علوم میں مہارت رکھتے اور رہنمائی کے لئے مستعد ہوں۔ اسلامی معاشرے کی سلامتی اس امر میں پنہاں ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی طرح عبادات میں تحریف وتصرف نہ کرے اسلام کے سوا دیگر مذاہب میں ماہوار یا سالانہ تقریبات میں شریک ہونے والوں میں کوئی رشتہ قائم نہیں ہوتا حالانکہ وہ سب ایک ہی مذہب کے پیرو اور ایک ہی عمل میں مشغول ہوتے ہیں۔ وہاں طمانیت قلب یا صبغۃ اللہ جیسی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی مسجدیں، حج اور دینی مراکز وحدت اسلامی کے رشتہ میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں، ان میں یگانگت اور اتحاد ہے، عقیدہ اور عبادت کی وحدت نمایاں ہے اور وہ ایک ہی شریعت کے پیرو ہیں۔ اس وحدت کا سہرا دینی ہدایات کی صحت اور ان کی یگانگت کے سر ہے۔ پھر محدثین اور فقہا بھی لائق تحسین ہیں جو اس امت کے قانونی خزانے کی حفاظت کرتے رہے اور اس کا تعلق اپنے حقیقی سرچشمہ اور متحدہ دینی نظام سے جوڑے رکھا۔

یہ اجتہاد فقہ کی تدوین اور شرعی احکام کا استنباط اپنے اپنے زمانے اور اپنے اپنے وقت پر ظہور میں آیا اس میں نہ کچھ پہلے ہوا اور نہ بعد میں۔ اس فقہ کا یہ نمو طبائع الاشیاء اور امور کائنات کی نہج کے عین مطابق ہے کیونکہ اس دین کی عالمگیریت اسی امر کی متقاضی ہے۔ یہ ویسا ہی طبعی اور منطقی تقاضا تھا جیسا کہ علم الصرف نحو، عربی زبان کے قواعد، بلاغت اور بیان کے علوم کی نشو ونما کا حال ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد سابقہ عربوں کے کلام، عربی زبان میں نازل شدہ قرآن حکیم اور شعر عرب پر استوار ہے۔ جب کہ عرب اور عجم کے اختلاط اور اسلام پر عمل کرنے

والوں کے لئے تمام عربی علوم کی تدوین کی نسبت فقہ کی تدوین زیادہ ضروری تھی۔ کیونکہ فقہ ہر مسلمان کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے، عبادت اور عقیدہ سے اس کا مضبوط رشتہ ہے اخروی زندگی اور اس پر مرتب ہونے والے ثواب و عذاب، سعادت اور بدبختی نیز بخشش اور ہلاکت پر فقہ کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری سے پہلے لوگوں کی حالت:

ہماری گفتگو سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جو لوگ ان بلند پایہ مذاہب اور عالی مرتبہ عملی طریقوں کی نشونما کے وقت، ان فقہی مذاہب میں سے کسی ایک لڑی میں پروئے گئے تھے اور انہوں نے ایک ہی مذہب سے اپنا تعلق مضبوطی سے جوڑ لیا تھا اور اس سے بال برابر بھی انحراف نہیں کرتے تھے۔ مزید برآں اس وقت کا مسلم معاشرہ ان مذاہب میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اور وہ سب ان مذاہب میں سے کسی ایک کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا تھا۔ فقہ اور علم کی تاریخ سے ایسی کوئی گواہی نہیں ملتی نیز ایسا ہونا انسانی فطرت اور اس دور کے مسلمانوں کی حقیقی زندگی کے بھی منافی تھا۔ البتہ ایسا بعد کے ادوار میں ضرور ہوا۔ جب ہم اسلامی کلینڈر کی رو سے اس امر کی تجدید کرنا چاہئیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا چوتھی صدی ہجری میں وقوع پذیر ہوا۔ جب یہ مذاہب پختہ اور مکمل ہو کر اپنے اپنے علاقوں میں پھیل چکے تھے۔ نیز سیاسی، حکومتی اور تربیتی عوامل بھی اس بارے میں معاون ثابت ہوئے، اور ان علاقوں کے مسلمانوں کی حقیقی زندگی بھی یہی تقاضا کرتی تھی۔

ہم موجودہ صدیوں میں آنے والے اسلام کے بطل جلیل کا ذکر کرتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے انصاف، متوازن فکر، وسعت قلب و نظر نیز حدیث نبوی اور فقہ میں وقت نظر سے نوازا تھا۔ وہ حکیم الاسلام امام احمد بن عبد الرحیم دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) ہیں جو شیخ ولی اللہ دہلوی کے نام سے معروف اور شہرہ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے مصنف ہیں، وہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے کے مسلمانوں کی فقہی حالت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہیں اس دور میں اپنی دینی زندگی میں جو مسائل اور مشکلات درپیش ہوتی تھیں تو اس کا وہ کیا حل تلاش کرتے تھے؟ وہ ''حجۃ اللہ البالغہ کے باب'' چوتھی صدی ہجری سے پہلے اور بعد کے لوگوں کا حال میں لکھتے ہیں۔

جان لیجئے کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے لوگ ایک ہی مذہب کی تقلید نہیں کیا کرتے تھے، ابو طالب مکی نے اپنی کتاب ''قوت القلوب'' میں لکھا ہے کہ بے شک کتابیں اور مسائل کے مجموعے وجود میں آتے رہتے تھے، علماء کے اقوال، ایک مذہب کے فتاوی ہر چیز کے بارے میں ایک شخص کا قول یا حکایت یا اس کے فقہی مذہب کو اپنانا، پہلی اور دوسری صدی ہجری تک کے لوگ اس کے پابند نہیں تھے۔

میں کہتا ہوں۔ دو صدیوں کے بعد ان میں تخریج مسائل کا عنصر پیدا ہوا حالانکہ چوتھی صدی ہجری کے باشندے ایک مذہب ایک فقہ اور کسی ایک شخص کے قول یا حکایت کی تقلید محض نہیں کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ بعد میں ہوا۔ اس عمل میں عامتہ الناس اور علماء بھی شامل تھے۔

عوام الناس کا یہ حال تھا کہ اپنے اجتماعی مسائل، جن میں مسلمانوں یا جمہور مجتہدین کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ ان میں صرف صاحب شریعت کی تقلید کرتے، وضو، غسل، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کی تعلیم اپنے والدین یا اپنے شہر کے علماء سے حاصل کرتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ جب انہیں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو کسی مذہب کا فرق کئے بغیر، انہیں جو بھی مفتی میسر آتا اس سے مسئلہ کا حل دریافت کرتے۔

خواص کا یہ عالم تھا کہ وہ اہل حدیث تھے۔ اس لئے حدیث پر عمل کرتے تھے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے آثار تک اپنے کو محدود رکھتے کسی مسئلہ کے بارے میں جب انہیں صحیح یا مستفیض حدیث مل جاتی تو اس کی موجودگی میں انہیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بعض فقہا بھی اسی پر عمل پیرا تھے۔ حدیث نبوی، جمہور صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال پر عمل نہ کرنے والے کے پاس کوئی عذر نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی وہ اس کی مخالفت کو پسند کرتے تھے۔ جب کسی حدیث میں تعارض ہوتا اور اس میں ترجیح کا پہلو معلوم نہ ہوتا نیز درپیش مسئلہ کا تسلی بخش حل میسر نہ آتا تو وہ لوگ ماضی کے بعض فقہاء کرام کی طرف رجوع کرتے۔ اگر انہیں ہم پلہ دو اقوال ملتے تو وہ کسی ایک یا ان میں سے ثقہ قول کو اپنا لیتے۔ وہ اہل مدینہ یا اہل کوفہ کے قول میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ ان میں کچھ اصحاب ایسے بھی ہوتے تھے کہ جب وہ کسی مسئلہ میں واضح احکام نہ پاتے تو وہ خود مسائل کا استنباط کیا کرتے تھے اور فقہی مذاہب میں اجتہاد کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگ مروجہ فقہی مذاہب

کے بانیوں کی طرف منسوب ہوتے تھے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شافعی ہے، فلاں حنفی ہے، اہل حدیث بھی ان مذاہب میں سے جس مذہب سے زیادہ متفق ہوتے اسی کی طرف منسوب ہوتے تھے، مجتہد کے علاوہ کوئی دوسرا شخص قاضی یا مفتی نہیں ہوتا تھا اور فقیہ کو مجتہد کے نام سے ہی موسوم کیا جاتا تھا۔ ان صدیوں کے بعد لوگ اپنی اپنی پسند کا مذہب اپنانے لگے۔

متبع رسول ﷺ کی اجتہادی فکر:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایسے مقلد کے بارے میں کیا انصاف کی بات کہتے ہیں۔ جو درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا ارادہ رکھتا ہو لیکن وہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ شرعی حکم تک براہ راست رسائی حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ایک عام شخص ہے یا وہ دوسرے امور میں مشغول ہے یا (قرآنی) نصوص تک رہنمائی کرنے والے وسائل اسے میسر نہیں یا وہ ان نصوص سے مسائل کا استنباط نہیں کرسکتا۔ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمتہ ابن حزم کا یہ قول نقل فرماتے ہیں تقلید حرام ہے۔ کسی کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ دلیل کے بغیر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور شخص کا قول اختیار کرے۔

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ ابن حزم کے اس قول میں کوئی شبہ نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی اور کا قول دین نہیں ہوتا، اللہ اور اس کے رسول صلی علیہ وسلم کے حلال کردہ امور کو ہی حلال، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حرام کردہ امور کو ہی حرام جانو، لیکن جب کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ناواقف ہو، احادیث کے اختلافات میں مطابقت پیدا نہ کرپائے اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے مسائل کا استنباط کرسکے تو وہ ہدایت یافتہ عالم کی پیروی کرے۔ کیونکہ وہ عالم جو کچھ کہتا اور جو فتویٰ دیتا ہے اسے معلوم ہے کہ وہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا پیرو ہے۔ اگر اس کے خیال سے اختلاف ہو تو اس سے جھگڑا کئے بغیر اور اپنی رائے پر اصرار کئے بغیر بات ختم کردے کیونکہ اس حقیقت کا کوئی کیسے انکار کرسکتا ہے کہ فتویٰ پوچھنا اور فتویٰ دینا مسلمانوں کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے رائج رہا ہے۔ اس امر میں کوئی فرق نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی فتویٰ پوچھا جائے یا کبھی کبھی فتویٰ دریافت کیا جائے۔ جبکہ ہم نے جو کچھ بیان کیا اس

پر اجماع امت ہے، ایسا کیوں نہ ہو؟ کیا ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فقہ پر ایمان نہیں رکھتے؟ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی کے ذریعے عطا کیا اور ان کی اتباع ہم پر فرض کی کیونکہ وہ معصوم ہیں اگر ہم مجتہدین میں سے کسی ایک کی تقلید کرتے ہیں تو یہ اس یقین کے ساتھ ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا عالم ہے۔ اس کا قول یا تو کتاب وسنت کی صریح نص سے ثابت ہوگا یا ان سے مروجہ طریقے سے استنباط کیا گیا ہوگا، یا قرائن سے جانا گیا کہ ہماری مطلوبہ مشکل کا حل اس طرح سے ہے اس علم سے ایسے مجتہد کا دل مطمئن ہوگیا اور اس نے ان امور کو جن کے بارے میں کوئی نص نہیں، ایسے امور پر قیاس کیا جن کے بارے میں کوئی نص موجود ہے گویا وہ کہتا ہے ...... میں نے گمان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کبھی یہ علت موجود ہو تو اس کا حکم یوں ہوگا۔ قیاس کرنے والا اس عموم میں اضافہ کرسکتا ہے اور یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوگا لیکن مجتہد کا طریق کار ظنی ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمان کسی مجتہد کی تقلید کیوں کرتے اگر ہمیں معصوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی اتباع ہم پر فرض کی گئی کی صحیح سند والی حدیث مل جائے جو کسی فقہی مذہب کے خلاف ہو اور پھر ہم نے حدیث کو چھوڑ دیا اور اس ظنی بات کی پیروی کی تو ہم سے بڑا کوئی ظالم نہیں ہوگا اور قیامت کے دن رب العلمین کے حضور ہمارے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا۔

مذاہب اربعہ کی خصوصیات:

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے بلند پایہ رسالہ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید میں اس چاروں مذاہب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

جان لیجئے۔ ان چاروں مذاہب کو اپنانے میں بہت بڑی مصلحت ہے ان سب کو چھوڑنے میں بڑا افساد ہے۔ ہم اس کے اسباب بیان کرتے ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ وہ شریعت کو جاننے کے لئے اپنے اسلاف پر اعتماد کرتی ہے۔ تابعین نے ان امور میں صحابہ کرام پر اعتماد کیا اور یہ عمل ہر طبقہ میں جاری رہا۔ علمائے کرام اپنے سے پہلوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ عقل بھی اس کی اچھائی کی طرف رہنمائی کرتی ہے کیونکہ شریعت، روایت اور استنباط سے ہی جانی جاتی ہے اور روایت اس وقت تک درست نہیں ہوتی جب تک

پہلے گروہ سے مل کر روایت نہ کی جائے۔ اسی طرح استنباط کے لئے متقدین کے مذاہب کا علم ہونا بھی ضروری ہے تا کہ ان کے اقوال سے الگ نہ ہو جائیں اور اس امر پر استوار اجماع ختم نہ ہو جائے اور پہلے افراد اس بارے میں معاون ثابت ہوتے ہیں کیونکہ تمام صنعتیں جیسے صرف، نحو، طب، شعر لوہے کا کام، تجارت اور کپڑے رنگنا اسی وقت حاصل ہوتی ہیں جب ان کے ماہرین سے تعلق استوار کیا جائے۔ ماہرین سے تعلق قائم کئے بغیر ان صنعتوں کا سیکھنا شاذ و نادر ہی ممکن ہوتا ہے اگر چہ عقلی طور پر ایسا ہونا ممکن۔ ہے جب اسلاف کے اقوال پر اعتماد قائم ہو گیا وہ صحیح اسناد کے ساتھ مروی ہوں یا مشہور کتابوں میں جمع ہوں اور وہ کتب تفصیلی ہوں تا کہ مختلف ممکنہ اقوال میں سے قابل ترجیح قول کی وضاحت کی جا سکے۔ بعض مقامات پر ہم عام کی تخصیص کریں، بعض دوسرے مقامات پر مطلق کو مقید بنائیں، اختلافات کو جمع کریں اور احکام کی علتیں بیان کریں۔ بصورت دیگر ان پر اعتماد درست نہیں ہوگا۔ ان آخری ادوار میں مذکورہ بالا چاروں مذاہب کے علاوہ کوئی اور ایسا مذہب موجود نہیں ہے۔

اجتہاد کی ضرورت، جدید نسل کی کوتاہی:

اجتہاد کی ضرورت کے بارے میں آج کل بہت سی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ ترقی اور جدت کے لئے نعرہ علامت بن گیا ہے۔ بلا شبہ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس دین کی ضروریات میں سے ہے جو زندگی کو آگے بڑھاتا اور اس کی قیادت کرتا ہے۔ یقیناً تہذیب، صنعت اور تجارت اس حد تک ترقی کر چکی ہیں کہ اندزہ کرنا مشکل ہے، نئے اسلوب پیدا ہو چکے ہیں، معاہدات اور تجارتی امور ایسے فقہی حکم کا مطالبہ کر رہے ہیں جن کی بنیاد اسلامی شریعت کی روشنی میں اسلامی اصولوں اور اصول فقہ پر قائم ہو۔

لیکن جو لوگ شرعی مسائل اور آج کی ایجادات کے بارے میں صدائے اجتہاد بلند کر رہے ہیں۔ یعنی عالم اسلام کے فکری قائدین، سیاسی اور انتظامی رہنما، عرب ممالک میں بیرونی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل نوجوان اور اپنے ممالک کی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل نوجوان۔ ان کی عربی تہذیب کے لئے ایسی صلاحیت، ذہانت اور قوت ارادہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی جس میں بہادری، دانائی شامل ہوتا کہ وہ عربی تہذیب کے طریقوں اس کی خامیوں اور

خوبیوں اور معاملات میں خام مال کی طرح اپنے راستے الگ کریں جن سے ایسی ثقافت وجود میں آئے جو دینی تعلیمات عصری ضرورتوں اور مشرقی مسلم اقوام کی طبیعت کے مطابق ہو جس سے وہ ایسا نظام ترتیب دیں جو اس امت کی بعثت کے مقاصد کی تکمیل کرے اور ان اقوام کو راہ دکھائے جو مادیت کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ جب مغرب سے کوئی چیز لیں تو پہلے اس گرد وغبار و صاف کر لیں جو تاریخ یورپ کے دور تاریک میں اس پر لگ چکی ہو۔ حالت یہ ہے کہ آج ہم یورپ سے جو کچھ لے رہے ہیں وہ ایک اعصابی کشمکش اور نفسیاتی الجھن کی کیفیت میں لے رہے ہیں، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ یورپ کے ان علوم کی آج ہمیں سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے اختصاصی میدانوں میں ایسا کردار ادا نہیں کیا جو دونوں نظاموں کو مربوط کرتا اور تربیتی نظام میں آزاد اسلامی رنگ بھر دیتا، یہی عمل اجتہاد کے مشابہ ہے جو ان کے فکری اور قائدانہ کردار کی تکمیل کرتا۔ لیکن یہ قدیم سے انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے قول سے جلد ہی دست بردار ہو جاتی ہے اور دوسروں سے مطالبہ شروع کر دیتی ہے کہ وہ اس کا فریضہ ادا کریں۔

اس رائے کے علی الرغم جو قابل مواخذہ نہ سمجھی جائے۔ درحقیقت شرعی مسائل اور عصری ایجادات کی موجودگی میں اجتہاد کی ضرورت روز روشن کی طرح عیاں ہے اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ شرعی علوم کے ماہرین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس میدان میں اپنا قائدانہ اور اساسی کردار ادا کریں اور اس قیمتی سرمایہ سے استفادہ کریں جو اصول فقہ کے نام سے موسوم ہے جس کی نظیر احکام و مسائل کے استنباط کے میدان میں دوسری کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ یہ واضح حقیقت ہے کہ زمانہ کی دوڑ کو نہ روکا جا سکتا ہے، نہ وہ معطل کیا جا سکتا اور نہ ہی ماضی کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے۔ جبکہ اسلام آج اقوام اور معاشروں کا دین ہے جنہیں یہ مسائل درپیش ہیں اور جنہیں ان کا ہر روز سامنا ہوتا ہے۔

بعض علاقوں اور ادوار میں اجتہاد کے معطل ہونے کے اسباب:

مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں امت اجتہاد پر قائم رہی اور علمائے کرام بھی اس پر عمل پیرا رہے۔ جس کی مثالوں اور نمونوں سے چاروں مذاہب کی فقہی کتب پر ہیں۔ تاتاری حملوں

کے بعد یہ ادارہ (اپنے جدید معنوں میں) پژمردگی اور کمزوری کا شکار ہو گیا۔ تاتاری یلغار کی وجہ سے ذہانت اور ثقافت کے سوتے خشک ہو گئے اور جو اقوام تاتاری اور مغول حکومت کے زیر اثر آئیں وہ مسلح اور غیر مسلح فوج کشی کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ چنانچہ مسلماں علما، خاص طور سے عالم اسلام کے مشرقی حصہ کے علماء نے اس دور میں اجتہاد کے ارتقاء میں رکاوٹ محسوس کی جس کے اسباب حکام کی سختی کا خوف، سیاسی اور انفرادی مصلحتیں نفع سے زیادہ نقصان۔ بعض اوقات اجتہاد دین میں تحریف اور اس امت کے جماعتی انحراف کا باعث بنا۔ یہ سب کچھ وقتی تھا اور ابتداء ہی سے اس اصول پر قائم تھا کہ فائدہ کے حصول کی بجائے نقصان کو دور کیا جائے۔

اب اس دروازے کا کھولنا لازم ہو چکا لیکن انہیں شرائط کے ساتھ یہ دروازہ کھل سکتا ہے جو اصول فقہ کی کتب میں مذکور ہیں اور مستحسن امر یہ ہے کہ (کسی خاص ضرورت کے علاوہ) اجتہاد انفرادی نہ ہو اور یہ جماعتی اور علمی اداروں کا کام ہوتا کہ ماہرین کے ساتھ تبادلہ افکار گہرا غور وخوض کتاب وسنت کی روشنی میں مسئلہ کی چھان پھٹک ہوتا کہ فقہ اور اصول فقہ کے گرانقدر سرمایہ سے مکمل استفادہ کیا جا سکے اور اس میں سازشیں اور دسیسہ کاریاں داخل نہ ہوں اور کسی سیاسی طاقت یا خود مختار حکومت کو رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اجتہاد کی حدود:

بعض مبلغین کی باتوں سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ جدید تہذیب یافتہ طبقے، یونیورسٹی کے پر جوش طلبہ اور اسلامی ممالک کے بعض حکمرانوں کو اجتہاد کی ضرورت ہے۔ ہر مسئلہ میں مطلق اجتہاد کی دعوت اور بوسیدگی کے باوجود مغربی اقدار اور عصری طریقے اپنانا گویا ایسا ہے کہ زمانہ اس طرح چل رہا ہے جیسے پہلے دن اسلام آیا تھا، انسانی معاشرہ پیچھے کی طرف الٹی چال پڑا ہے اور فقہاء اور مجتہدین نے ماضی میں جو کچھ کیا تھا وہ سب کچھ ضائع ہو گیا، ان کی آراء اور حاصل مطالعہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی کیونکہ اس دور کی طبیعت اور حقیقی زندگی سے اسے کوئی موافقت نہیں رہی۔ یہ ایسا نکتہ نظر ہے جو سطحیت لاپرواہی اور اس پروپیگنڈے کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا نتیجہ ہے۔ وقت حاضر کا ادب جس پروپیگنڈے کے ذریعے اسکی ترقی اور زمانے کے حالات کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو نوجوانوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے وہ سوچتے ہیں کہ گویا

وہ آج ہی پیدا ہوئے ہیں اور دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی موجود نہیں جو کل کی اشیاء سے مشابہت رکھتی ہو۔ یہ حقیقت سے زیادہ تخیلی تصویر ہے اور صورت حال کو منطقی اور حقیقی انداز سے بیان کرنے کی بجائے جذباتی انداز میں مبالغہ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

دین ہی زندگی کا محافظ ہے:

دین کا مطیع اور پیرو ہوتے ہوئے میرے لئے یہ کبھی ممکن نہیں کہ میں کسی بھی ایسی تبدیل شدہ حالت کو تسلیم کرلوں جس کا دین حل پیش نہ کرتا ہو، آپ بھی ایسی کسی بات پر متفق نہیں ہو سکتے، کیونکہ دین آلہ حرارت کا نام نہیں جو ایک حد کے بعد گرمی ریکارڈ کرنے سے قاصر رہے اور نہ ہی وہ قطب نما ہے کہ ہواؤں کا رخ متعین کرلے۔ ان الفاظ سے دین کی تعریف نہیں ہوسکتی اور یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ مغربی اوزاروں کی طرح ہو، ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو چاہتا ہو کہ دین وقتی تبدیلیوں کے ریکارڈ کے طور پر کام کرلے۔ کسی خود ساختہ دین کے لئے بھی ممکن نہیں کہ وہ یہ صورت حال برداشت کرلے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ دین ایسا ہو؟

بے شک دین واقعی حقیقت کی طرح تبدیلی کا اعتراف کرتا ہے اور درست تبدیلی کے تحت معاملات کو چلنے کے کامل مواقع مہیا کرتا ہے۔

دین زندگی کے دوش بدوش ترقی کرتا ہے اور ایک تابع کی حیثیت سے اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ اور یہ امر دین کے فرائض میں سے ہے کہ وہ مفید اور غیر مفید کو تعمیری اور تخریبی تبدیلی کے مابین امتیاز کرے اور دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ نشان دہی کرے کہ کون سی تبدیلی انسانیت یا کم ازکم اس کے پیروکاروں کیلئے مفید یا مضر ہے۔

ایک طرف تو دین فعال زندگی کے دوش بدوش چلتا ہے تو دوسری طرف وہ محافظ اور نگران کا کام سرانجام دیتا ہے کیونکہ نگرانی اور حفاظت کی ذمہ داری بھی اسے ہی سونپی گئی ہے۔

وصی کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنے زیر وصیت کمزور اور ناتواں کے ہر کام میں مدد کرے اور اسکی ہر نئی اچھی یا بری خواہش کی تائید کرے، یا ہر اس چیز پر مہر تصدیق ثبت کردے جو اس کے سامنے پیش کردی جائے۔ دین دراصل مہر ہے، اس کی حیثیت ایک روشنائی کی ہے، وہ ایک طرز تحریر ہے۔ اس کی یہ شان نہیں کہ وہ ہر وثیقہ اور ہر معاہدے سے اتفاق کرلیا کرے بلکہ ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں میں تمیز کرے اور ان میں سے (مفید چیز کو) منتخب کرے۔

پہلے وہ (وثیقہ) کی چھان پھٹک کرے۔ پھر اس کے بارے میں کوئی حکم جاری کرے۔ اگر اس میں کوئی چیز غلط یا نقصان دہ ہوتو دین کی یہ کوشش ہوگی کہ اسے نرمی سے ترک کردے اور اگر ممکن ہوتو حالات کے مطابق طاقت سے اسے مسترد کردے جب اس کے سامنے کوئی ایسا وثیقہ پیش کیا جائے جو اس کی رائے میں انسانیت کے لئے ضرر رساں ہوتو وہ نہ صرف خود اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے باز رہے گا۔ بلکہ اس کا پوری قوت سے مقابلہ کرے گا اور اسی مقام پر دین اور اخلاق کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ دین اپنا فرض اور ذمہ داری سمجھتا ہے کہ غلط رجحان کی نشاندہی کرے اور اس کا رد کرے۔ جبکہ اخلاق اس کی طرف اشارہ کرنے اور اس کے اظہار کو ہی کافی سمجھتا ہے۔

اس وقت نظر اور گہرائی، امانت اور ذمہ داری کے احساس، اس دین کی طبیعت اور پیغام سے آگہی، اپنے زمانے کے تقاضے اور ان کا پیچیدہ تانا بانا، اختلاف اور تبدیلی نیز ترقی اور ترقی پذیری کے مابین مطابقت، حرکت اور ثبات نیز مفید قدیم ورثہ کی حفاظت کے پیش نظر ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم وسیع تر مفہوم میں فقہ اسلامی کی ضرورت کی نفی کریں، اسے ترقی اور وسعت میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ انتشار پھیلانے یا ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے نہیں۔ نیز اسلامی معاشرے کی یہ اہم ضرورت ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات اور احکام پر اس دور میں عمل پیرا ہو، جو موجودہ دور کی طرح وسیع پیمانے پر تہذیب یافتہ ہے۔ جس میں موجودہ زندگی قدرتی طور پر تیزی سے ترقی کررہی ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔

وعلى الله قصد السبيل و منها جائر.

اور دین کے دو راستے ہیں ایک سیدھا راستہ جو خدا تک پہنچتا ہے۔ اور بعض ٹیڑھے راستے پر ہیں۔

مغربی تعلیم اور اس کے تباہ کن اثرات

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لااله الا الله وحده لاشريک له ، ونشهد ان سيدنا محمدا عبده ورسوله .اما بعد.

ایک اہم مسئلہ:

حضرات! آپ کی اجازت سے میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل اور وضاحت و صراحت کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔موضوع کی نزاکت اور اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ کہانی بہت دور سے شروع کی جائے ،اس لئے کہ یہ مسئلہ آج کا یا چند مہینوں اور سالوں کا نہیں ہے، یہ ایک بہت قدیم مسئلہ اور پرانی مشکل ہے جس کی جڑیں ملت کی زندگی اور تاریخ میں اندر تک پیوست اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اس مسئلے میں پہلی نفسیاتی حقیقت جس سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے ، وہ اسلامی معاشرے میں ایسے اشخاص کا وجود ہے، جنکو اس عقیدے پر (جس پر اس معاشرے کی اساس ہے)قلبی طور پر انشراح نہیں ہوتا اور وہ ان حقائق ومبادی اور مقاصد واقدار پر یقین نہیں رکھتے جن کے لئے یہ معاشرہ زندہ اور کوشاں ہے۔

انسانی معاشرے کا مزاج:

یہ دراصل ہر اس انسانی معاشرے کا مزاج اور خاصا ہے جو کسی مخصوص عقیدہ اور متعین حدود قیود کا پابند ہے اور جب اس معاشرہ اور جماعت کا کوئی فرد ان حدود کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس کے دائرے سے خارج یا اس کا باغی قرار دیا جاتا ہے اور ان حقوق وامتیازات سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو اس کو اب تک حاصل تھے، برخلاف قومیتوں کے جن کا دروازہ ہر عقیدہ ومسلک اور ہر قسم کے صحیح اور غلط طرز زندگی اور کردار کے لئے کھلا رہتا ہے اور ان کی صرف ایک شرط ہوتی

ہے اور وہ یہ کہ یہ فرد اپنی قومیت تبدیل نہ کرے، حکومت یا ملک کے خلاف کوئی سازش نہ کرے اور کسی قومی غداری کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔

یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے اور جن لوگوں پر اس معاشرے کے اچھے برے کی ذمہ داری ہے، ان کے لئے سب سے سنگین مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ عنصر (جس نے اس عقیدہ کو کبھی اخلاص کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا یا کسی وجہ سے اس کو ہضم نہیں کر سکا تھا یا کسی خاص سبب سے ہضم کرنے کے بعد اسے پھر خارج کر دیا تھا) اس مومن و مسلم معاشرہ کے دائرہ اور فریم کے اندر اس کے ایک جزو کی حیثیت سے زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا چاہتا ہے اور اپنے مستقبل کو کسی مصلحت یا مجبوری سے اس کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کرتا ہے لیکن بایں ہمہ اپنے کو اس کے مطابق ڈھالنا اس کے رنگ میں رنگنا اس کو کسی حالت میں گوارا نہیں ہوتا۔ وہ اس معاشرے کے مسئلہ و بنیادی حقائق و تصورات اور صفات و خصوصیات پر یقین نہیں رکھتا اور نہ اس کے اندر اس کے لئے کوئی گرم جوشی اور اخلاص پایا جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات فتنہ ارتداد سے زیادہ خطرناک، فتنہ انگیز اور دوررس ہے جس کی سنگینی سے ہمارا مسلم معاشرہ واقف ہے۔

یہ مسئلہ اس وقت کچھ اور پیچیدہ بن جاتا ہے جب یہ عنصر اپنی ذہانت و ہنرمندی سے عوامی اعتماد حاصل کرنے اور دوسروں پر چھا جانے کی وجہ سے زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور پھر اس کے بعد پورے معاشرہ کو اس راستے پر لے جاتا ہے جو اس کے نزدیک الحاد و بے دینی اور اس کے طے شدہ اصولوں اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کے راستے ہیں۔ بعض اوقات اس کو ان مقاصد کی طرف بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا جاتا ہے جو اس کے دین و عقیدہ کے سراسر منافی یا اس کے متوازی ہوتے ہیں، وہ ایک ایسی عمیق نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے جس سے زیادہ سخت کشمکش تاریخ انسانی، تاریخ اخلاق و نفسیات اور تاریخ مذاہب میں شاید ہی کبھی پیش آئی ہو۔ وہ موت و زیست کی درمیانی اور بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے جس سے اس کو کسی وقت چھٹکارا نہیں ملتا۔

اس قیادت کے اثر سے، جو اپنے معاشرہ اور قوم کے دین و عقیدہ پر ایمان نہیں رکھتی بلکہ اکثر اوقات اس سے برسرپیکار اور آمادہ فساد رہتی ہے، فکری و ذہنی ارتداد کو کھلی چھوٹ مل جاتی

ہے اور ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد، جن کے پاس اخلاقی ونفسیاتی حفاظت کا کوئی سامان یا ایمانی و روحانی قوت کا کوئی ذخیرہ یا کوئی علمی وفکری حصار نہیں ہوتا، اس سمندر میں غرقاب ہوجاتی ہے۔ دولت کے پرستار، چڑھتے سورج کے پجاری، موقع پرست، ابن الوقت اس کا خصوصیت سے اور زیادہ آسانی سے شکار ہوتے ہیں یا پھر دوسری شکل میں نفاق پورے معاشرے میں عام ہوجاتا ہے۔ معاشرے کی داخلی قوت ختم ہوجاتی ہے اور اس کا پورا ڈھانچہ اندر ہی اندر سڑنے لگتا ہے، مکروفریب عام ہوتا ہے، سازشوں کی کثرت ہوتی ہے، غداری اور قومی خیانت کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں، ضمیر اور بڑی سے بڑی قابل احترام اور مقدس میراث کا سودا ارزاں اور آسان ہوتا ہے، ملک کے بڑے بڑے رقبے چند سکوں کے عوض فروخت کردیئے جاتے ہیں، جاسوسوں اور دشمنوں کے کارندوں اور ایجنٹوں کی بن آتی ہے اور ان کو اس خدمت کے لئے کوئی بھی طریقہ اور حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہیں ہوتا۔ یہ وہ صورت ہے جس کی نظیر کسی اور انسانی معاشرے میں (جس کو یہ سخت آزمائش پیش نہیں آئی ہے یا جس کے عوام اور قیادت کے درمیان اتنی وسیع، گہری اور بنیادی ونظریاتی خلیج نہیں ہے) نہیں ملتی۔

معاشرہ میں کمزوری:

اس کے نتیجے میں یہ معاشرہ کسی بیرونی دشمن یا اندرونی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا اور اس کی اصل وجہ یہی ذہنی انتشار اور نفسیاتی کشمکش اور قیادت اور اس کے دیئے ہوئے اعلانات اور نعروں سے عوام کی بے تعلقی اور عدم دلچسپی ہے۔ یہ سب حالات وواقعات کا منطقی نتیجہ اور نفسیات انسانی کا طبعی خاصہ ہے اور ان تمام ملکوں کی قدیم وجدید تاریخ اس پر گواہ ہے جو اپنے قائدین وزعماء یا اپنے حکام وامراء کی محبت سے کبھی آشنا نہیں رہے اور جہاں جمہور قیادت میں جذباتی ہم آہنگی اور فکری یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہوسکی۔

البتہ اس اسلامی سوسائٹی نے، جو خود دعوت اسلامی کی اساس پر قائم تھی اور جس نے نبوت محمد ﷺ کی آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی، اس طبعی اور تاریخی حقیقت اور امر واقعی کا کامیابی سے مقابلہ کیا جس کا واسطہ قدرتی طور پر ہر اس جماعت کو پڑتا ہے جس کی تعمیر ایمان

وعقیدہ، ذہانت وتقویٰ اور دعوت و جہاد کی بنیادوں پر ہوئی ہو، نفاق کی بیماری تو صرف اس ماحول کو لگتی ہے جہاں دو حریف نظریات اور مقابل قیادتیں پائی جاتی ہوں، خواہ ان دونوں میں ضعف وقوت اور قلب و کثرت کے لحاظ سے کوئی تناسب نہ ہو۔ اس موقع پر وہ متردد عنصر سامنے آتا ہے جو ان دونوں مخالف کیمپوں کے درمیان گھومتا رہتا ہے اور متردد رہتا ہے کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے اور کس کا دامن تھاما جائے؟ پھر کسی نہ کسی دعوت کی طرف مائل ہو کر اس میں شامل ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی محبت وتعلق کا مرکز بنالیتا ہے۔ تاہم اس کی مادی مصلحتیں اور حریف کی قوت اور عروج واقبال اس کو اپنے موقف کے اعلان، اپنی رائے کے اظہار اور نئی دعوت کو بالکلیہ قبول کرنے سے باز رکھتا ہے اور مقابل دعوت سے اپنی راہ ورسم قطعی اور آخری طور پر ختم نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں اسی کیفیت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

''بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں، نہ ان کی طرف (ہوتے ہیں) نہ ان کی طرف۔''

(النساء:۱۴۳)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

''لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کنارے پر (کھڑے ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں، اگر ان کو کوئی (دنیاوی) فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جائیں اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائیں (یعنی پھر کافر ہو جائیں)۔''

اسی لئے جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ مکہ میں نفاق کا وجود نہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام وہاں مغلوب تھا، اس کے اندر نفع ونقصان پہنچانے اور تغیر وتبدل کی کوئی طاقت نہ تھی اور وہاں دو متوازی قوتیں نہ تھیں، مشرکین بڑے طاقتور اور غالب تھے اور مسلمان مظلوم، نہتے اور مغلوب تھے۔ جب اسلام مکہ سے مدینہ منتقل ہوا اور اسلامی سوسائٹی اپنے تمام لوازمات اور طبعی خاصیتوں کے ساتھ وجود میں آئی تو نفاق نے سر اٹھایا، یہ ایک ایسی قدرتی اور نفسیاتی صورت حال تھی جس سے کوئی مفر نہ تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے تشریف فرما ہونے اور سلسلہ وحی کی وجہ سے یہ نوزائیدہ سوسائٹی ان منافقین کے ضرر سے محفوظ رہی۔ قرآن مجید نے متعدد جگہوں پر ان کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے۔ عام مسلمان بھی ان سے واقف، بیزار اور متنفر تھے، سوسائٹی نے بھی ان کو اپنے دائرے سے خارج کر دیا تھا اور ان کے لئے اس کے اندر

چوری چھپے گھسنے اور خلل اندازی کرنے کا زیادہ موقع باقی نہیں رہا تھا، سوسائٹی کے اعتماد کو حاصل کرنے اور منصب واقتدار تک پہنچنے کی بات تو بہت دور کی بات تھی، چنانچہ یہ اولین اسلامی سوسائٹی برابر صحت مند اور ان آلائشوں سے محفوظ رہی، نفاق اس کو کمزور نہ بنا سکا اور منافقین کو بھی اس کو نقصان پہنچانے کا موقع نہ مل سکا بلکہ ان کی کمزوری، شکست خوردگی اور بدحالی کو دیکھ کر بہت سے صحابہ رضی اللہ عنھم کو، جن میں بڑے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے، یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ان کی نسل ختم ہو چکی ہے اور عہد نبوی کے بعد اب نفاق کا کوئی وجود نہیں رہا لیکن نفاق پہلے بھی انسانی زندگی کا ایک خاصہ اور بہت سے لوگوں کی کمزوری تھا اور آج بھی ہے، اس نے کسی وقت قافلہ انسانی کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے اور ہر موقع اور گنجائش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی جگہ بنائی ہے۔ بہت سے اسباب وعوامل نے (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) اس کی ہمت افزائی کی اور اس کو تخت سلطنت، حربی قوت اور انتظام حکومت کی منزل تک پہنچایا نیز علم و ادب کی محفلوں میں اس کو باریابی کا موقع دیا اور یہ سب اس عہد میں ہوا جب اسلام پیش قدمی کر رہا تھا، فاتح و با اقتدار تھا اور اسلام قبول کرنے اور اسلامیت کا مظاہرہ کرنے میں بہت سے سیاسی اجتماعی اور اقتصادی فوائد بھی تھے، یہ وہ موقع تھا جب نفاق نے آگے بڑھ کر وسیع اسلامی سلطنت کے کلیدی اور اہم عہدوں پر قبضہ کر لیا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے کسی خاص فن یا صنعت میں اپنی مہارت کی وجہ سے یا غیر معمولی ذہانت یا علمی برتری کی وجہ سے نوزائیدہ اسلامی حکومت پر پورا تسلط حاصل کر لیا اور ان میں بڑے اعلیٰ درجے کی انتظامی صلاحیتوں کے لوگ، افواج کے سپہ سالار اور ادباء و اہل قلم اور حکومت کے اہل کار پیدا ہوئے۔

ان حالات میں ایک مرتبہ سیدنا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے نفاق اور منافقین کی موجودگی کے بارے میں سوال کیا گیا اور آنحالیکہ اقتدار اسلام اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور صرف ان کے وجود کی تصدیق ہی نہیں کی بلکہ اس کا اظہار کیا کہ وہ طاقت کی پوزیشن میں ہیں۔ ان سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت! کیا آج بھی نفاق کا کہیں وجود ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر منافقین بصرہ کی گلیوں کو چھوڑ دیں تو تم کو ویرانی کی وجہ سے وحشت ہونے لگے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر وہ نکل جائیں تو تم اپنے دشمنوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکو۔ ایک موقع پر کہا کہ خدا کی شان! اس امت کو منافقین نے کتنا نقصان

پہنچایا اور کس طرح اس پر قبضہ کرلیا۔

اس کے بعد غیر ملکی اقتدار اور مغرب کی فکری وتہذیبی یلغار کا دور شروع ہوتا ہے اور مشرق اپنے ارادے سے یا بلا ارادہ مغربی طرز تربیت، نظام تعلیم، دبستان فکر، مغربی تصور اور علوم وفنون کے مغربی زاویہ نگاہ کے سائے میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس کی گود میں اس طرح آجاتا ہے جیسے کوئی شیر خوار بچہ کسی دیرینہ سال مربی واتالیق کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ وہ اس کے پورے نظام تعلیم یا مختصر الفاظ میں اس کے نظریہ تعلیم کو اس کی ساری خرابیوں اور خامیوں کے باوجود جوں کا توں قبول کر لیتا ہے، جو ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوا اور نافذ کیا گیا جس کے عقائد، بنیادی اصول، اخلاقی قدریں، اسلامی معاشرہ کی قدروں اور بنیادی ومسئلہ اصولوں سے ہر جگہ اور ہر سطح پر مختلف ہیں، جن پر وہ پورا ایمان رکھتا ہے یا ان پر ایمان لانا، ان کے لئے جدوجہد کرنا، ان کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی دینا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے بلکہ مغرب کی اخلاقی قدروں کی تردید اور ان کی بیخ کنی اور تحقیر ہی پر اس کی بنیاد ہے، ایسی حالت میں اس کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہوتی ہے جو آب حیات کے شوق میں زہر کا پیالہ پینا چاہے یا کھاری اور نمکین پانی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرے۔

انہوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور علمی اداروں کی تشکیل میں بیرونی ملکوں کے تعلیمی مشیروں کو پورا اختیار دے رکھا ہے اور ان ملکوں سے صرف درسی کتابیں ہی درآمد نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ ان ملکوں میں اپنے تعلیمی وفود بھیجتے ہیں تاکہ وہ مغربی ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں نشوونما حاصل کریں۔ پھر ان کو ممالک اسلامیہ کی تعلیمی منصوبوں اور پالیسیوں کی تشکیل وتربیت کی پوری آزادی بھی دے دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کا نقشہ بنائیں اور ان کا جو رخ چاہیں متعین کریں۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے عقائد وافکار اور اپنے اخلاق وسیرت میں ذہنی انتشار کا شکار ہے، فکر مغربی اور فکر اسلامی کے درمیان تذبذب کی حالت بھی بسا غنیمت تھی لیکن اس نے اکثر اوقات اپنے ملک وملت اور اپنے معاشرے کے سارے معتقدات ومسلمات اور اصول واقتدار سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی جس پر کوئی تعجب نہ کرنا چاہئے بلکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مقام تعجب تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ماہرین اور مشیران تعلیم اور ان کے شاگرد اپنے کام میں مخلص

ہوں اور اس تعلیمی پالیسی اور منصوبہ بندی میں ان کے پیشِ نظر اسلامی ملکوں اور نئی نسلوں کی فلاح وترقی ہو لیکن یہ فرض کر لینے سے بھی ان ملکوں میں پیدا ہونے والے فکری اضطراب اور بنیادی تضاد اور ناہمواری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتا اور تصویر اسی طرح تاریک رہتی ہے، ان میں سے اکثر لوگوں کی اس خاصیت کو اس پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے کہ وہ دین سے اور اس کی بنیادوں اور اصولوں سے، مسلم اقوام کے مزاج و کردار، اور ان کی شخصیت و دعوت کے مطابق اور منافی دونوں چیزوں سے واقف نہیں ہوتے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ان ملکوں اور قوموں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہوں لیکن ان کو بچانے کی یہی کوشش ان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

عہد حاضر کے ماہرین تعلیم نے بالا تفاق اس کا اظہار کیا ہے کہ تعلیم کوئی ایسا تجارتی سامان نہیں ہے جو درآمد کیا جا سکے مثلاً مصنوعات، خام مال، وہ ایجادات وضروریات جو کسی ملک اور علاقہ کے سات مخصوص نہیں، وہ ایسا لباس ہے جو ان اقوام کے قد وقامت اور جسامت کے ٹھیک ناپ کے مطابق تراشا اور سیا جاتا ہے اور پسندیدہ ومحبوب علم وفن اور ان مقاصد کو سامنے رکھ کر تیار کیا جاتا ہے جن کے لئے وہ ہر طرح کی قربانی دے سکتی ہیں اور وہ ہے کہ تعلیم صرف اس عقیدہ کو مضبوط کرنے کا ایک مہذب اور شائستہ طریقہ ہے جس کا حامل یہ ملک یا قوم ہے۔ اس کا مقصد فکری طور پر اس کو غزا دینا، اس پر اعتماد پیدا کرنا اور اگر ضرورت ہو تو علمی دلائل سے اس کو مسلح کرنا ہے، وہ اس عقیدہ کے دوام وبقا کا وسیلہ اور بے کم وکاست آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ نظام تعلیم کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ والدین اور مربیوں اور نگرانوں کی اس سعی پیہم کا نام ہے جو وہ اپنی اولاد کو اپنے دین ومسلک پر قائم رکھنے کے لئے کرتے رہتے ہیں اور ان کی اس طرح تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ورثے کے (جو انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے حاصل کیا تھا) اہل وارث اور امین ثابت ہوں اور ان کے اندر اس ثروت میں اضافہ اور توسیع اور اس کو ترقی دینے کی پوری صلاحیت ہو۔

برطانیہ کے ماہرین تعلیم کی ایک رپورٹ میں یہی بات کہی گئی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"ریاست کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دیکھے کہ اسکولوں کے ذریعے قومی زندگی کے مکمل

اجزاء نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے ہیں۔اس کا کام ہے کہ یہ دیکھے کہ طلبہ قومی مفاد کے مقررہ معیار کی کارکردگی کو قائم رکھتے ہیں اور اسے ترقی دیتے ہیں ریاست کی ظاہری تعلیمی سرگرمی کے پس پشت غیر مرتب لیکن معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ بچے قومی خصوصیات کے جانشین بنتے ہیں۔''

گارفورڈ نے اپنی ایک کتاب میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

''اولین طور پر تعلیم کے مقصد کو سماج کی روایات اور اس کے موجودہ اقدار پر رکھنا چاہئے کیونکہ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر اس کی خصوصیات اور بقا منحصر ہے، اور یہ بے حد ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان دفعتاً کوئی بے ربطی نہ پیدا ہو۔اس کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ترقی کی ہر کوشش سماج کے مسلم اقدار کی بنیاد پر ہو۔''

ایک اور ماہر تعلیم ورنن میلنسن کی شہادت میں اس سے زیادہ یقین اور صراحت سے کام لیا گیا ہے، وہ لکھتا ہے:

''ایک قسم کا ذہنی منشور جو پورے معاشرے کے مشترکہ مقصد اور مشترکہ کوششوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ایک طرح یہ بڑے پیمانہ پر قومی جذبہ کی عکاسی کرتا ہے اور ان خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو معاشرے کے نصب العین کے لئے ضروری ہوتا ہے۔''

مغرب اپنے سیاسی نظاموں اور مکاتب خیال کے اختلاف نیز اپنے مشرقی و مغربی کیمپوں اور اپنی ساری قومی بیماریوں، نقائص اور خامیوں کے باوجود اس تعلیمی پالیسی پر پوری طرح کاربند ہے اور تعلیم و تربیت کے تمام شعبوں میں اس نے اس بہ تمام و کمال نافذ کر رکھا ہے اور اس کے تمام تعلیمی پروگرام اور تعلیمی پالیسیاں اسی مقرر کردہ اصول کی تابع ہیں۔

سوویت یونین بھی، جو انقلابی ذہن اور اپنی انتہا پسندی میں مشہور ہے، اس اصول کو نافذ اور جاری کرنے میں سرمایہ دارانہ جمہوری حکومتوں سے پیچھے نہیں رہا بلکہ شاید اپنے اشتراکی نظریہ کی حفاظت اور انقلابی روح کی بناء پر اس اصول کو علمی جامہ پہنانے میں وہ ان ممالک سے بھی آگے ہے۔ایک سرکاری حکم نامہ مجریہ ۱۲/نومبر ۱۹۵۸ء میں یہ کہا گیا ہے کہ:

''ان خصوصیات کے حصول میں سماجی علوم کی تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے مارکسزم، لینن ازم کے مبادیات کا علم ہر فن کے ماہرین کے لئے اشد ضروری ہے۔ہمارے نوجوانوں کی

تربیت اس طرح ہونی چاہئے کہ ان میں نصب العین اور احیاء پرستی کے خلاف تعصب کی روح سرایت کر جائے۔''

یہی وہ چیز ہے کہ جس کی وجہ سے مغرب اس نقصان سے محفوظ رہا جس کا شکار مشرق کے اسلامی وغیرہ اسلامی ممالک ہیں، چنانچہ آج مغرب میں عوام اور قیادت یا جمہور اور حکومت میں کسی گہری اور وسیع نظریاتی، ذہنی وفکری خلیج کا سراغ نہیں ملتا، وہاں صرف ایک طرز، ایک آئیڈیل اور ایک قسم کے اصول ونظریات اور مقاصد ونصب العین پائے جاتے ہیں۔ وہاں مختلف طبقات اور سوسائٹی کے افراد کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور نفسیاتی رسہ کشی نہیں اور اسی وجہ سے یہ ممالک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے محفوظ ہیں۔

مغرب کے بعد ان مشرقی ممالک کا نمبر آتا ہے جو مدت دراز سے اپنا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور ان کو ان حقائق پر یقین نہیں جن کی ایمان بالغیب اور انبیاء کی تعلیمات وہدایت پر بنیاد ہے۔ ان کے پاس متعین آسمانی تعلیمات یا محفوظ آسمانی صحیفے بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف ان قومی روایات اور جماعتی وشخصی مفادات کی حامل ہیں جن کو یہ تعلیمی نظام اور پروگرام چیلنج نہیں کرتی اور کسی جگہ اور دونوں کے مفادات کا ٹکراؤ نہیں ہوتا، چنانچہ یہ ممالک بھی اسی طرح اس تضاد سے محفوظ ہیں جو مغربی نظام تعلیم پیدا کرتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اس نظام تعلیم سے صلح صفائی کر لی ہے اور دونوں میں پوری مفاہمت پائی جاتی ہے یا انہوں نے اپنے آپ کو ان تعلیمی وتربیتی نظریات کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اسی لئے انقلابات اور سازشوں کا تناسب یہاں بہت کم اور تضاد بھی بہت کم یا اتنا کمزور ہے کہ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ ملک سے غداری اور قومی خیانت کے واقعات شاذ ونادر ہی رونما ہوتے ہیں اور یہاں بھی عوام اور رہنما طبقہ میں وہ وسیع خلیج حائل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی ملکوں میں نظر آتی ہے۔ ان ممالک کے امراض اور ان کے عیوب دوسری نوع کے ہیں اور اس کے اسباب وعوامل بھی بالکل دوسرے ہیں جن کا تعلق ان کی تاریخ، ان کے قومی مزاج مخصوص عقائد، دینی حاسہ کی کمزوری، شعور کی کمی اور نظام تعلیم وتربیت کی فساد سے ہے۔

جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے، وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد بڑے وسیع پیمانہ پر اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے۔ وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے تو دوسری طرف

اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسہ کسی ہے اور تیسری طرف دیندار، آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست گریباں ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جا رہا ہے یا مغربی ذہن اور نظام تعلیم کے خطوط پر خود ان ملکوں میں تیار کیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک ایسی نسل پیدا ہو رہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کر پاتی جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے، اس لئے کہ یہ نظام تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل و دماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لئے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کرتی ہے تو لازماً اس کے نتیجے میں یہ نظام تعلیم ضرور کمزور پڑتا ہے لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کی آغوش میں تربیت پا کر نکلتا ہے تو قوم کے عقیدے، خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے ملبے کو (جیسا کہ اس طبقہ کے افراد یہ اصلاح استعمال کرتے ہیں) راستے سے ہٹا کر اپنی قوم و ملک کو ماضی کے بار گراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے۔ اس موقع پر ایک ایسی طویل کشمکش برپا ہوتی ہے جس پر ملت کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو بیرونی جنگوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ ان ممالک کے قصے ہیں جہاں ایسی قیادتیں برسراقتدار تھیں جو انقلابی، قوم پرستانہ اور لادینی فلسفوں پر یقین رکھتی تھیں۔

اگر اس طبقہ کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اور وہ طاقتور شخصیت سے محروم ہوتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے اندر عقائد اور مقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ آئے دن اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے، غیر ملکوں اور بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر لیتا ہے اور عوام کے قومی جذبہ اور دباؤ اور علماء و دعوت دین کے علمبرداروں کے اثر و رسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجے میں غداری کے واقعات بار بار رونما ہوتے ہیں اور یہ ممالک مستقل طور پر بے یقینی، خوف و دہشت، ذہنی انتشار اور شبہ و بے اعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

اس غیر فطری اور غیر ضروری صورت حال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظام تعلیم تیار کیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد وقامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی ودنیاوی ضروریات پوری کر سکتا ہو۔

یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ، اس کی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آواز اور اسلامیان عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

اس مسئلے کا حل، خواہ وہ کتنا ہی دشوار نظر آرہا ہو؟ اور صبر آزما اور دقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادیت، خدا سے سرکشی، اخلاقی وروحانی قدروں سے بغاوت اور جسم وخواہشات کی پرستش اور فکر اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری وساری کر دی جائے۔ اس مقصد کے لئے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات اور معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنا ہوگی۔ مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہوگا، اس کی قیادت و امامت کا انکار کرنا پڑے گا، اس کے علوم ونظریات وعلمی تحلیل وتجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ رد عمل کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانیت اور تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

اس کے علوم کے ساتھ مواد خام کا سا معاملہ کرنا ہوگا اور اس سے وہ چیزیں تیار کرنا ہوں گی جو ان قوموں اور ملکوں کی اپنی ضروریات، رجحانات اور ان کے عقیدہ وتہذیب سے ہم آہنگ ہوں۔

اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن تجدد پسندی، آزاد خیالی اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا واحد طریقہ ہے جس نے عالم اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے اور اسلام کے فکری واجتماعی ڈھانچہ اور ملت ابراہیمی کے شیرازہ کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے، اور جس کے نتیجے میں مسلم اقوام کے پرجوش اسلامی جذبات، ان کی سادہ دلی اور گرم جوشی، ان کی قربانیاں

اور سرفروشیاں اور اخلاص ووفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہ راست دخل ہے) افرنگی اور مغربیت کے تنور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے۔ سب لوح، بے زبان، سچے اور مخلص مسلم عوام خاموشی سکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح نامعلوم منزل کی طرف ہنکائے جارہے ہیں اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے۔

کیا آج کوئی اسلامی ملک، کوئی اسلامی حکومت اور کوئی بڑی اسلامی یونیورسٹی اس آواز پر لبیک کہہ سکتی ہے؟ اور اپنی ساری کوششیں، توجہات اور ذرائع ووسائل اس اہم تعمیری اور انقلابی آغاز پر مرکوز کر سکتی ہے؟ جو بالآخر عالم اسلام کو سب سے بڑے خطرہ اور چیلنج سے بلکہ مکمل تخریب کے اس عمل سے (جو جاری ہے اور جس سے عمومی، ہمہ گیر اور دوررس قومی تباہی وبربادی اقوام ومذاہب اور تہذیب وتمدن کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی) بچا سکتی ہے؟

وماعلینا الاالبلاغ المبین

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پیغام
فیصل ایوارڈ کمیٹی کے نام

فیصل ایوارڈ کمیٹی سعودی عرب نے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوئؒ کو ایوارڈ حاصل کرنے پر مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ ۱۲ فروری کو تقسیم انعام کے جلسہ میں شرکت کی دعوت دی تھی، مگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی غیر معمولی مصروفیتوں اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کی وجہ سے تشریف نہ لیجا سکے تھے البتہ اپنی طرف سے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مدظلہ العالی کو مکلّف فرمایا کہ وہ ان کی قائم مقامی کریں اور مندرجہ ذیل پیغام اس انعامی تقریب کے موقع پر حاضرین تک پہنچادیں۔ ذیل میں اس پیغام کا اردو ترجمہ نذر قارئین ہے۔

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ سید نا محمد و آلہ وصحبہ اجمعین.

معزز صدر جلسہ اور حاضرین بزم! السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ

ہم آپ کے اور عالمی فیصل ایوارڈ کی اس سلیکشن کمیٹی کے شکرگزار ہیں جس کے منتخب انعام یافتہ حضرات میں ہمارا بھی نام شامل ہے۔

آپ حضرات کا یہ انتخاب اگر کسی بات کی شہادت دیتا ہے تو وہ مکمل اور بھرپور اعتماد ہے جو اسلام کے اس خادم کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے جو حسب توفیق الٰہی اپنی مقدرت بھر دین کی خدمت میں مشغول ہے۔ مختلف میدانوں میں اسلام کی سربلندی کے لئے کام کرنے والوں کی ہمت افزائی و سرپرستی کے لئے جس طرح یہ حکومت اور فیصل ایوارڈ کمیٹی کام انجام دے رہی ہے اس سے ہم سب خوب واقف ہیں، نیز اس ایوارڈ کی معنوی قدر و قیمت اور اس بلند و پاکیزہ جذبات سے بے خبر نہیں جو اس کی تہ میں کارفرما ہیں۔

دین کی خدمت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی نیت سے یہ کام بغیر کسی اجرت اور معاوضہ کے تصور کے انجام دیا جائے، سلف صالحین، اور اللہ کے مخلص بندوں کا طرز عمل ہمیشہ اس معاملہ میں یہی رہا ہے کہ وہ اس دنیا میں دین کی کسی خدمت کا ادنیٰ

معاوضہ حاصل کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتے تھے بلکہ اس بات سے چوکنار ہا کرتے کہ خدا نخواستہ ان کے دینی کاموں میں دنیاوی نفع کا شائبہ بھی آسکے، لیکن آج کے دور میں اسلام خود عالم اسلام میں اجنبی بن کر رہ گیا ہے اور جس اسلام نے پوری انسانیت پر احسانات کی بارش کی تھی اب اسی کے ساتھ احسان فراموشی اور بے مہری سے کام لیا جارہا ہے اور اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اسلام کے خلاف سرگرم مخالف طاقتوں کی سرپرستی کی جارہی ہے اور الحاد و بے دینی کو بڑھایا جارہا ہے۔ ان اسباب ومحرکات کی بناء پر اسلام کا درد رکھنے والوں کی سرپرستی و ہمت افزائی کے لئے جو چند اقدامات کئے ہیں ان میں عالمی فیصل ایوارڈ کمیٹی کا قیام سرفہرست ہے، جس نے اس دین حنیف کی خدمت کرنے والوں کے لئے بطور ہمت افزائی ایک مخصوص سالانہ انعام دیئے جانے کا فیصلہ کیا، یہی احساسات مجھ پر اس وقت غالب تھے جب میں نے اس انعام کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا جو میری ادنیٰ خواہش وطلب کے بغیر بالکل خلاف توقع تھا۔ اس ایوارڈ کا انتساب جس شہید ملک فیصل کے نام نامی سے ہے اور اس کی تہہ میں جو پاکیزہ جذبات کارفرما ہیں ان سب کا تقاضا تھا کہ میں شکروسپاس کے جذبات کے ساتھ اس کی قدر کی توفیق عطا فرمائے۔

چند ناگزیر اسباب اور پہلے سے طے شدہ ضروری پروگرام کی وجہ سے خود اس انعام کو قبول کرنے اور ذاتی طور پر شکریہ ادا کرنے سے قاصر رہا۔ میری طرف سے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی ریڈر ملک عبدالعزیز یونیورسٹی اس مبارک موقع پر آپ کی خدمت میں حاضر ہورہے ہیں۔

اس انعام کی جو غیر معمولی معنوی قدر و قیمت ہے وہ اس کی مالی حیثیت کے مقابلہ میں بہت بلند ہے۔

---

(۱) اس پیغام کو سنانے کے بعد ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے کہا،
ولی عہد معظم! اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا کہ مولانا ندوی کی طرف سے اس رقم کے مندرجہ ذیل طریقہ سے تقسیم کا اعلان کروں۔
روسی جارحیت کی وجہ سے ہمارے بے شمار افغانی بھائیوں کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ سعودی حکومت نے ان بے گھر پناہ گزینوں کی امداد و اعانت کے لئے بڑی فیاض امداد دی ہے اس لئے مولانا ندوی نے انعامی رقم کا نصف حصہ پناہ گزینوں کے فنڈ میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔
بقیہ نصف رقم میں سے ایک ربع مکہ مکرمہ میں حفظ قرآن کے مدارس کے لئے اور باقی چوتھائی رقم مکہ مکرمہ ہی کے مدرسہ صولتیہ کے لئے، تاکہ یہ دونوں ادارے دینی تعلیم کے کاموں کو سرگرمی سے انجام دیتے رہیں۔

جہاں تک اس ایوارڈ کی مادی قدر و قیمت کا تعلق ہے میں آپ کی اجازت سے اس انعام کو ملت کے ان کاموں پر صرف کرنا پسند کروں گا جن کا اعلان ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی! سے ایوارڈ لیتے وقت کریں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

مردوہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم ۔ امابعد ۔فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ انھم فتیۃ آمنوا بربھم وزدنٰھم ھدًی وربطنا علیٰ قلوبھم اذ قاموا فقالوا ربنا رب السموت والارض لن ندعوا من دونہ الٰھا لقد قلنآ اذاً شططاً۔

حضرات! یہ سورۂ کہف کی ایک آیت ہے اس کا عنوان اگر اس زمانہ کے اسلوب اور اسٹائل میں مقرر کروں تو کہوں گا ''قصہ سات جواں مردوں کا۔'' (۱) اس قصہ میں نسل انسانی کے نوجوان عنصر کے لئے خصوصی پیغام اور ایک اعلیٰ نمونہ ہے، جو ہر زمانہ میں کام دے سکتا ہے اور جو صرف دماغ و دل پر نہیں، بلکہ صلاحیتوں، حوصلوں اور عزائم پر بھی ایک تازیانے کا کام دے سکتا ہے، وہ کبھی شبنم ٹپکاتا ہے، کبھی پھول کی جھڑیاں لگاتا ہے، مجھے بھی آج نوجوانوں کے سامنے نوجوانوں کا قصہ سنانا ہے، اور میں کیا سناؤں گا، قرآن مجید سناتا ہے، یہ وہ نوجوان ہیں جن کو قرآن نے ان کا تذکرہ کر کے لافانی بنا دیا، اور ہر دور کے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ اور آئیڈیل۔ بات بڑی مختصر، بڑی سادہ، لیکن بڑی عمیق اور سبق آموز۔

قصہ یہ ہے کہ رومن امپائر کے ایک حصہ میں جو شام و فلسطین کہلاتا ہے، ایک دعوت پیدا ہوئی جس کو لانے والے سیدنا مسیح علی الصلوٰۃ والسلام تھے جو ہم مسلمانوں کے نزدیک بھی خدا کے پیغمبر برحق ہیں، انہوں نے توحید کی دعوت دی، اس وقت ساری دنیا میں شرک پھیلا ہوا تھا اور ہر طرف گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس اندھیرے میں ایک روشنی چمکی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شرک، نسل پرستی، رسم پرستی، توہم پرستی، ظاہر پرستی اور انسانیت کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی، جس کی اصل اساس توحید اور سچی خدا پرستی تھی، اس دعوت کو کچھ لوگوں نے تسلیم کیا اور وہ اس کے حامی و داعی بن گئے، انہوں نے اپنے قلمرو سے باہر قدم نکالا و رومی

---

(۱) قرآن مجید میں آتا ہے کہ کسی نے کہا چار تھے پانچواں ان کا کتا تھا، کسی نے کہا چھ تھے، ساتواں ان کا کتا تھا، کسی نے کہا سات تھے، آٹھواں ان کا کتا تھا۔ اس کے بعد قرآن مجید نے آگے کوئی ہندسہ نہیں بتایا، اس سے مفسرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ تعداد میں سات ہی تھے۔

شہنشاہیت کے مرکز کے قریب جا کر دعوت پیش کی۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ سن رسیدہ اور پختہ کار لوگوں کے مقابلہ میں (جن کے پاؤں میں تجربات، مفادات، رسم ورواج اور خوف وامید کی بھاری بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں، اوران کو کسی نئے تجربے اور انقلابی اقدام سے باز رکھتی ہیں) نوخیز اور جواں سال (جن کے پاؤں میں یہ بیڑیاں نہیں ہوتیں) اوران کی وابستگیاں، اوران کا اٹیچمنٹ ان چیزوں کے ساتھ نہیں ہوتا جن کے ساتھ عموماً بڑی عمر والوں کا ہوا کرتا ہے، نئی اور صالح دعوت کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔قرآن مجید ان نوجوانوں کی عمر کا تعین نہیں کرتا اور یہی قرآن مجید کا طریقہ ہے۔

اگر وہ کہتا کہ ۱۸۔۲۰ سال کے نوجوان تھے، تو اس سے اوپر اور اس سے نیچے عمر والوں کو بہانہ مل جاتا کہ ہمارا قصہ نہیں ہے، قرآن کہتا ہے ''انھم فتیۃ'' وہ چند نوجوان تھے، جو حضرات عربی کا ذوق رکھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ ''فیۃ'' کے لفظ میں عمر کی جوانی کے ساتھ دل و دماغ اور حوصلوں اور عزم وارادہ کی جوانی کی طرف بھی اشارہ آ گیا ہے۔ اس لئے اس کے ترجمہ میں، میں نے ''جواں مرد'' کا لفظ اختیار کیا، ''فتیۃ'' ''فتی'' کی جمع ہے ''فتی'' کی جمع ''فتیان'' بھی آتی ہے، لیکن ''فتیۃ' جمع قلت کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس طرح قرآن اشارہ دیتا ہے کہ وہ گنتی کے چند نوجوان تھے اور یہی ہمیشہ ہوا ہے کہ جب خدا پرستی اور اصلاح حال کی صحیح دعوت آئی ہے تو اس کے ماننے والے ابتداء میں تھوڑے ہوئے ہیں، جن کو خدا نے اس کی توفیق دی اور ان کو یہ ہمت ہوئی۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اسمائے حسنیٰ اور صفات میں بھی ''رب'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ''انھم فتیۃ امنوا بربھم'' یہ بات بہت معنی خیز ہے، اس لئے کہ حکومتوں کو اپنے یہاں کے باشندوں کے رازق ہونے کا بھی (کبھی زبان قال سے اور کبھی زبان حال سے) دعویٰ ہوتا ہے اور ان کے ساتھ اس طرح کے خیالات اور عقیدے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ اگر اپنی پرورش کا سامان کرنا ہے اور عزت وراحت کی زندگی گذارنی ہے، تو ان حکومتوں سے اپنے کو متعلق کرنا پڑے گا۔ان کا حاشیہ بردار ہو کر رہنا، اوران کے رکاب میں چلنا پڑے گا۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہوگا۔اس کے بغیر رزق اور خوشحال وفارغ البال زندگی کے دروازے یکسر بند ہیں، قرآن جو لفظ کہتا ہے، وہ اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینہ کا کام دیتا ہے۔ پوری پوری کتابوں کا مضمون ایک

لفظ میں آجاتا ہے۔ یہ جواں مرد انسانوں کے اس جنگل میں کھڑے ہوگئے، جہاں اس رومن امپائر کا جھنڈا لہرا رہا تھا جو اس وقت دنیا کی سب سے منظم، سب سے متمدن، دنیا کو اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ قانون دینے والی، دنیا کی سب سے وسیع خطہ پر حکومت کرنے والی شہنشاہی تھی۔

انگریزی محاورہ کے مطابق اس حکومت کی ناک کے نیچے اور بالکل آنکھوں کے سامنے چند نوجوان کھڑے ہوجاتے ہیں اور اس دعوت کو قبول کرکے اس کا اعلان کرتے ہیں، جو اس وقت کا صحیح مذہب اور اس عہد کا اسلام تھا۔ اس وقت تک مسیحیت میں تحریف نہیں ہوئی تھی۔ اس کے وہ داعی وہاں پہنچے تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام کے صحیح علمبردار تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا رازق اور ہماری پرورش کا ذمہ دار حکومت نہیں ہے، ہمارا رازق اور پروردگار خدا ہے، اور وہی ہماری پرورش کا ذمہ دار ہے۔ ''ربنا رب السموت والارض''۔ ہماری پرورش کرنے والا وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، یہ بات اس منظم سلطنت میں کہی گئی تھی، جس نے وسائل معیشت پر قبضہ کر رکھا تھا، گویا وہاں کے باشندوں کی قسمت و روزی کی مالک بن گئی تھی اور بظاہر نفع وضرر کی ساری طاقتیں اس کے ہاتھ میں آگئی تھیں۔ اس وقت دانشمندی اور حقیقت پسندی کا ایک ہی ثبوت تھا کہ حکومت کے دامن سے وابستہ ہوکر حکومت کے عقیدہ کو اختیار کرکے کم سے کم اس عقیدہ پر سکوت اختیار کرکے اس قلمرو میں اچھی زندگی گذاری جائے، انہوں نے پوری یونانی دیومالا اور رومی دیومالا کا انکار کیا جو اس وقت کی رومی تہذیب وتمدن و معاشرت اور عقائد و اعمال میں سرایت کرچکی تھی اور پورا معاشرہ مشرک اور توہم پرست بن گیا تھا۔ یونان اور روما (اور قدیم ہندوستان میں بھی) صفات الٰہی کا تصور دیوتاؤں کی شکل میں کیا جاتا تھا اور ان کے نام پر بڑے بڑے معبد اور ہیکل بنے ہوئے تھے۔ یہ محبت کا دیوتا ہے، یہ شفقت کا، یہ روزی دینے کا، یہ جنگ کا، یہ ہیبت وجلال کا، یہ بارش کا، ان نوجوانوں نے بیک زبان ان سب کا انکار کیا اور کہا:

ربنا رب السموت والارض لن ندعوا من دونه الها لقد قلنآ اذا اشططاً ھؤلآء قومنا اتخذوا من دونه آلھة لولا یأتون علیھم بسلطن بین فمن اظلم ممن افترىٰ على الله كذباً O (الکھف ص ۱۴، ۱۵)

ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، ہم اس کے سوا کسی کو معبود سمجھ کر نہیں پکاریں گے۔ (اگر ایسا کیا) تو اس واقت ہم نے بعید از عقل بات کہی، ہماری قوم کے ان سب لوگوں نے اس کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں یہ (ان کے خدا ہونے پر) کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لائے تو اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو خدا پر جھوٹ افتراء کرے۔

یہاں قرآن مجید نے ایک اور حقیقت بیان کردی وہ یہ کہ پہلا قدم آدمی کی طرف سے اٹھتا ہے، پہلے ہمت اس کی طرف سے ہونی چاہئے۔ اس کے بعد اللہ کی طرف سے مدد آتی ہے۔ ''**امنوا بربهم وزدنهم هدى**'' (وہ اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا) اگر آدمی اس کا منتظر رہے کہ کوئی چیز خود بخود دل میں نفوذ کر جائے، اس کے گلے منڈھ دی جائے تو یہ صحیح نہیں۔ پہلے خود فیصلہ اور ہمت کرنی ہوگی اس کے بعد خدا کی مدد آتی ہے۔ فرماتا ہے ''**وربطنا على قلوبهم**'' (ہم نے ان کے دلوں کو سہارا دیا) اس لئے کہ ان کا واسطہ اس زمانہ کی سب سے عظیم اور قہرمان سلطنت سے تھا۔ وہ سرکاری مذہب کو چھوڑ کر نیا مذہب اختیار کر رہے تھے۔

یہ اصحاب کہف کا واقعہ ہے، مجھے شرق اردن کے سفر ۱۹۷۳ء میں اس غار کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، جہاں وہ محوخواب ہیں، اردن کے آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر محقق فاضل رفیق وفا الدجانی صاحب نے ان کی زیارت کرائی اور علمی وفنی دلائل سے ثابت کیا کہ یہی اصحاب کہف کی جگہ ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ اس واقعہ کو صدیوں تک نظم کیا جاتا رہا ہے، اور وہ وہاں کی ادبیات کا ایک جزء بنا رہا ہے، میں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''معرکہ ایمان و مادیت'' میں تقابلی مطالعہ کی روشنی میں اس پر نظر ڈالی ہے۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان نوجوانوں میں سے اکثر اہل دربار کی اولاد تھے، یعنی سلطنت کے خاندانی نمک خوار تھے، کسی کے باپ، کسی کے چچا، کسی کے بڑے بھائی اس وقت رومن امپائر کے کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اس لئے یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ اور نازک بن گیا کہ بات صرف اتنی نہ تھی کہ چند بے تعلق اور سر پھرے نوجوان کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے بغاوت کا نعرہ لگایا اور کہہ دیا کہ ہم سرکاری مذہب کو نہیں مانتے، ہم نے ایک نیا دین قبول کیا ہے۔

یہ وہ لوگ تھے، جن کے ساتھ پورے پورے خاندان اور خاندانوں کی قسمت اور عزت

وابستہ تھی۔ ان کے اس اقدام سے ان کے والدین، ان کے خاندان کے بزرگ اور ذمہ دار نازک پوزیشن میں مبتلا ہو گئے، ان سے براہ راست سوال کیا جا سکتا تھا کہ تم نے اپنے فرزندوں اور خوردوں کو اس باغیانہ اقدام سے کیوں نہیں روکا؟ دوسری طرف خود ان کے بزرگان خاندان کے لئے ایک بڑی آزمائش تھی کہ وہ ان نوجوانوں کے متکفل تھے، وہ ان سے بڑی امیدیں رکھتے تھے اور ان کو ان کا مستقبل شاندار نظر آتا تھا۔ ایک جگہ قرآن مجید نے اس نفسیاتی کیفیت کو جو خاندان کے بزرگوں اور ذمہ داروں کو نوجوانوں کے اس طرح کے اقدام سے پیش آتی ہے بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے، جب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمود میں توحید اور دین حق کی دعوت پیش کی تو قوم کے سر برآوردہ لوگوں نے بڑے درد اور دل کی چوٹ کے ساتھ کہا کہ صالح! تم سے تو آئندہ کے لئے بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں، خیال تھا کہ تم سیدھے سیدھے اس لائن پر چل کر (جس پر قوم چل رہی ہے) اس میں کچھ امتیاز پیدا کر کے اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے اور اپنی قوم کے لئے عزت وافتخار باعث ہو گے۔

''قالو یٰصلح قد کنت فینا مرجوا قبل ھذا'' (صالح تم ہماری امیدوں کا مرکز تھے) تم نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا، تم یہ نئی دعوت لے کر کھڑے ہو گئے اور پوری قوم کو مخالف بنایا۔ ''مرجوا'' کا تقریباً وہی مفہوم ہے جو انگریزی میں لفظ (Promising) کا ہے جو کسی ایسے ہونہار طالب علم، یا نوجوان کے لئے بولا جاتا ہے، جس کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے۔

یہ نوجوان گنتی میں بہت تھوڑے تھے، اور بعض قرائن وقیاسات کی بناء پر سات سے زیادہ ان کی تعداد نہیں تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ کئی سو آدمیوں کی قسمت وابستہ تھی، صرف ایک کے ساتھ پورا پورا خاندان اور برادری کا سلسلہ تھا اور وہ سب ان کے اس اقدام کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئے تھے اور شک کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تھے۔ وہ کتنے خاندانوں کی امیدوں کا مرکز تھے اور کتنے گھروں کی ترقیاں وخوش حالیاں ان سے وابستہ تھیں؟ اس کی طرف لوگوں کی کم نظر جاتی ہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ سات آٹھ کا معاملہ کیا؟ پکڑے گئے تو پکڑے گئے اور مارے گئے تو مارے گئے!

اگر زندگی کے آسائشوں سے محروم ہوئے تو سات ہی آدمی تو محروم ہوئے، یہ نہیں

سوچتے کہ معاملہ کبھی ایک اکیلے آدمی کا نہیں ہوتا، متمدن زندگی میں فرد واحد (اکائی) کا تصور مشکل ہے۔ شعراء تو اس کا تصور کر سکتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں اکثر فرد واحد کا وجود نہیں ہوتا۔ اس کے تعلقات وروابط کتنے لوگوں سے ہوتے ہیں، اس لئے فرد واحد فرد واحد نہیں ہوتا۔ اگر یہ سات بغاوت کرتے ہیں تو سمجھئے کہ ستر خاندان زد میں آجاتے ہیں۔ اس لئے مسئلہ بہت اہم تھا اور اسی لئے قرآن مجید نے اس کو بطور مثال پیش کیا ہے، اس وقت تاریخ کی کتابوں میں یہ تفصیل نہیں مل سکتی کہ کس طرح سے ان کو ڈرا دھمکایا گیا اور کس کس طرح ان کو لالچیں دی گئیں اور سبز باغ دکھائے گئے۔

ایسے اقدامات سے روکنے کے لئے (خاص طور پر جبکہ مقابلہ میں نوخیز اور نوجوان ہوں) ترہیبات (ڈرانے والی چیزوں) کے ساتھ ترغیبات (راغب کرنے والی چیزیں) بھی ہوتی ہیں اور اکثر ترہیبات کے مقابلہ میں ترغیبات زیادہ موثر اور کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ ایک بزرگ نے جن کا دونوں چیزوں سے واسطہ پڑا تھا، فرمایا کہ توڑے کوڑوں سے زیادہ نازک ہوتے ہیں، طاقتیں اور حکومتیں کبھی کوڑے سامنے لاتی ہیں، اور کبھی توڑے (اشرفیوں کی تھیلیاں) ان نوجوانوں کے سامنے کوڑے بھی آئے ہوں گے اور توڑے بھی، انہوں نے کوڑوں کو بھی سہ لیا اور توڑوں کا بھی توڑ کر لیا اور یہ اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو قوت وسکون اور صبر وتحمل اور قربانی وایثار کی دولت عطا فرمائی۔ وربطنا علیٰ قلوبھم۔

ہمیشہ ملک ومعاشرہ اس وقت بچا ہے جب کچھ لوگوں نے اپنے مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں، وہ ناسمجھدار اور غیر متوازن بھی نہیں تھے، ان کی گفتگو بتاتی ہے کہ وہ صحیح الحواس، صحیح الدماغ دانہ اور فرزانہ نوجوان تھے۔ لیکن بات یہ تھی کہ ان کی روح صرف اس بات سے تسکین نہیں پاسکتی تھی کہ ان کو روٹی کپڑا ملتا رہے، ان کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ تو کسی امیر گھر کے کتے کا راتب ہے۔ اس کو بعض اوقات ایسا اچھا دودھ ملتا ہے جو بہت سے غریب گھرانوں کے بچوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا اور وہ ایسے ناز ونعم سے رکھے جاتے ہیں جس کا بہت سے انسان (جو اشرف المخلوقات ہیں) خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، لیکن ہزار ناز پروردہ کتے ایک ایسے فاقہ کش انسان پر قربان جس کو معرفت الٰہی اور ایمان کی دولت حاصل ہے، اور اللہ نے اس کو اپنے ہم جنس انسانوں کی فکر اور درد نصیب کیا ہے وہ طے کر لیتے ہیں کہ ہمیں اپنی جگہ بنانی نہیں ہے

اور جانوروں کی طرح کھاپی کر دنیا سے رخصت نہیں ہو جانا ہے، ہمیں اپنے کو بھی اس خطرے اور بلاکت سے بچانا ہے جو غلط عقائد، غلط مقاصد، غلط اعمال اور خراب اخلاق کی صورت میں ہمیں پیش آنے والا ہے اور اپنی قوم، ملک اور معاشرہ کو بھی ان مصیبتوں اور خطروں سے بچانا ہے جوان کے سر منڈلا رہے ہیں، انسانی تاریخ اس کی شہادتیں پیش کرتی ہیں کہ ایسے باہمت افراد کامیاب ہو جاتے ہیں اور پوری پوری قوم اور ملک کو اپنی آسائش اور ملک کی قربانی دے کر بچالے جاتے ہیں۔ انسانیت کی آبرو انہیں کے دم سے ہے اور امن وامان صلاح وفلاح، حق و صداقت اور دعوت حق کا تسلسل انہیں سے قائم ہے۔

ہمارا ملک اخلاقی طور پر اس وقت احتضار کی کیفیت ''سکرات'' سے دوچار ہے، وہ کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے۔ پورے ملک میں کرپشن وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے، کارکردگی، فرض شناسی، محنت کوشی، جفاکشی، اپنے ملک سے سچی محبت اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ہمدردی عنقا ہے۔ انتظامیہ میں دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اس لئے بیٹھا ہوا ہے کہ اپنی جیب بھرے۔ وہ قابل رشک انسان ہے جو جیب کے بجائے کاغذ کا پیٹ بھرنے (اپنا وقت پورا کرنے) کی فکر میں ہے، اگر کوئی سامنے آتا ہے تو غور سے دیکھا جاتا ہے کہ اس سے کتنی بڑی رشوت لی جاسکتی ہے۔ غور سے اس لئے نہیں دیکھا جاتا کہ اس کے چہرے پر کیا اتار چڑھاؤ ہے، وہ کس مصیبت میں مبتلا ہے؟ بلکہ اس لئے دیکھا جاتا ہے کہ چہرہ کیا بتا رہا ہے کہ وہ کس (Standard of Living) سے تعلق رکھتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ مدت کے بعد اپنے وطن آنے والے مسافر کو بجائے وطن پہنچنے کی خوشی کے سہم چڑھ جاتا ہے کہ معلوم نہیں اس کو کس ذلت اور کس مصیبت سے واسطہ پڑے اور کس کو کیا رشوت دینی پڑے۔

یہ کیوں نہیں ہوتا کہ ہندوستانی اپنے ملک کی سرحد پر (خواہ وہ ہوائی یا زمینی) آکر عزت و سکون محسوس کرے اور خوش ہو کہ ہم اپنے گھر آئے، میں آپ کو یہ دعوت نہیں دیتا کہ آپ کالج چھوڑ کر قوم وملک کی خدمت میں لگ جائیں، آپ ٹھوس خدمت جبھی کرسکیں گے جب آپ اچھی طرح پڑھیں گے، تعلیم میں امتیاز حاصل کریں گے اور یہاں سے نیک نام ہو کر نکلیں گے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اچھے کارگذار، فرض شناس، محبت وطن اور اگر مسلمان ہیں تو اچھے مسلمان بنیں، آپ کے اندر مدد کا جذبہ ہونا چاہئے۔ آپ کے اندر کام سے وہ خوشی ہونی

چاہئے جو آرام کرنے سے نہیں ہوتی۔ اس وقت پورے ملک کا نظام ڈھیلا ہو گیا ہے اور عام زندگی مشکل ہوگئی ہے، کس کس محکمہ، کس کس شعبہ زندگی کا رونا رویا جائے۔

میں اپنے مسلمان بچوں سے خاص طور پر کہتا ہوں کہ کسی کا یہ اخلاقی یا شہری فرض ہو، تمہارا تو یہ مذہبی فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ویل للمطففین O الذین اذا اکتالو علی الناس یستوفون O واذا کالوھم اوزنو ھم یخسرون O" (ناپ اور تول میں کمی کرنے والے کے لئے خرابی ہے، جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں) کتنی بڑی حقیقت خدا کے بیان کی ہے، یہ صرف دودھ کی دوکان یا پرچون کی دوکان کا معاملہ نہیں۔ "تطفیف" (کم تولنا اور ڈنڈی مارنا) کا عمل پوری زندگی میں ہوسکتا ہے۔ آج ہمارا پورا انتظامی ڈھانچہ اور معاشرہ "مطفف" بن گیا ہے۔ سب کا مرض "تطفیف" ہے، اپنا حق پورا وصول کرنا، یا وصول کرنے کے لئے لڑنا، اور دوسروں کا فرض نہ ادا کرنا، یا ادھورا ادا کرنا، اگر آپ کو ہندوستان میں باعزت زندگی گذارنی اور اپنا مقام پیدا کرنا یا اپنا مقام محفوظ رکھنا ہے تو اس کا ذریعہ صحیح دینداری بلند و بے داغ کردار اور عملی نمونہ پیش کرنا ہے۔ اگر آپ اس ملک کی قیادت بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ بھی یہی ہے کہ آپ اپنے دین کی تعلیمات، قرآن کی ہدایت، اپنے پیغمبر ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے اسوہ و سیرت پر چلیں اوران جواں مردوں کی تقلید کر کے (جن کا قصہ قرآن کی سورۂ کہف میں بیان کیا گیا ہے) اپنے مستقبل اور ترقی کے امکانات کو خطرہ میں ڈال کر ملک کو (اور اگر اللہ ہمت بلند اور وسیع نظر کرے) تو انسانیت کو خطرے سے بچانے کی کوشش کریں۔ اکبر نے صحیح کہا ہے:

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانہ نے تمہیں
مرد وہ ہے جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

وما علینا الا البلاغ المبین

فقہ وقضا کی صلاحیت میں علماء گجرات کا امتیاز واختصاص

الحمد لله رب العالمين والصلاة و السلام على سيد المرسلين وخاتم النبين محمد و آله وصحبه اجمين ومن تبعهم باحسان و دعا بدعوتهم الیٰ يوم الدين.

حضرات علمائے کرام برادران اسلام وحاضرین جلسہ اہل عرب جب کسی عمل یا کسی کارروائی کے متعلق یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ برمحل اور برموقع ہوئی تو کہتے ہیں "جاء في مكانه وفي اوانه" یہ بات اپنے صحیح محل ومقام اور مناسب موقع اور وقت پر پیش آئی (یا پیش کی گئی)

اس حقیقت پسندانہ جملہ کی روشنی میں پہلے اس حقیقت اور واقعہ کا اعتراف واعلان کیا جاتا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ بارہواں اجلاس اپنے صحیح محل ومقام پر ہو رہا ہے اور پھر عرض کیا جائے گا کہ وقت اور ضرورت کے تقاضہ کی بناء پر منعقد کیا جا رہا ہے اور وہ ایک فریضہ کی ادائیگی اور حقیقت پسندی اور فرض شناسی کا ثبوت ہے۔

جہاں تک اجلاس کے محل ومقام کی مناسبت اور اس اہم اجلاس کے یہاں منعقد کرنے کے جواز بلکہ معقولیت اور صحیح انتخاب کا سوال صوبہ گجرات (جو اس صوبہ کا قدیم تاریخی اور علمی دنیا میں معروف نام ہے) کے بارہ ہمیں ہندوستان کے اسلامی عہد کے سب سے بڑے مؤرخ وسوانح نگار پدر بزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی کتاب کے چند اقتباسات پیش کرنے پر قناعت کی جائے گی جو گجرات کے بارہ میں پائے جاتے ہیں۔

علوم وفنون میں اگر گجرات شیراز تھا تو حدیث کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا، علم حدیث کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ یہاں فقہ میں بھی شاندار کارنامے انجام پائے تھے ہندوستان کے کسی دوسرے علاقہ کی علمی اور تمدنی سرگرمیوں کی تاریخ اتنی مسلسل اور طویل نہیں ہے جتنی گجرات کی"۔

اس اجلاس وموضوع کی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ گجرات کا فقہ حنفی اور اصول فقہ میں بھی امتیازی حصہ ہے یہاں مفتی رکن الدین ناگوری نے جونہروالہ کے مفتی تھے فقہ حنفی کی دو سو چار کتابوں کو پیش نظر رکھ کر فتاوی حمادیہ تصنیف کی جس کے حوالے فتاوے عالمگیری میں جابجا ملتے ہیں۔

اسی طرح مفتی قطب الدین (م۹۹۹ء) کا ذکر کئے بغیر بھی رہا نہیں جاتا جن کو حرم شریف میں درس دینے کا شرف حاصل ہوا، علامہ قاضی سوکانی صاحب نیلا الاوطار نے اپنی کتاب البدر الطابع" میں بڑے بلند الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حرمین شریفین اور دیار عرب میں جن کے فضل کمال کا سب سے زیادہ اعتراف کیا گیا اور جن سے استفادہ کو باعث فخر وشرف سمجھا کہ وہ زیادہ تر علمائے گجرات تھے وکفی به فخراً وشرفا۔

اس سلسلہ میں وزیر آصف خاں کا نام لینا کافی ہوگا جن کو یہ شرف وخصوصیت حاصل ہے کہ علامہ ابن حجر مکی نے ان کے حالات پر مستقل رسالہ لکھا، جس میں وہ لکھتے ہیں جس زمانہ میں آصف خاں مکہ معظّمہ میں آ کر رہے تھے عجب طرح کی رونق مکہ معظمہ میں پیدا ہوگئی تھی، علماء وفقہاء ان کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے گھر گھر علم کا چرچا ہوگیا تھا مکہ والوں نے تحصیل علم میں پوری کوشش کی تھی انہوں نے اہل علم پر اپنے احسان وکرم کے دائرہ کو اس قدر وسیع کر دیا تھا جس کی نظیر ان کے معاصرین میں بلکہ ایک مدت سے مفقود تھی علامہ عز الدین عبدالعزیز مکی نے آصف خاں کی مدح میں چھیاسی شعر کا قصیدہ لکھا۔

علوم دینیہ بالخصوص فقہ وقضاء وافتاء کی صلاحیت میں علمائے گجرات امتیاز واختصاص کا نتیجہ تھا کہ سلطنت دہلی نے بھی ان کے اس امتیاز واختصاص سے فائدہ اٹھایا، اور ان کو قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز کیا قاضی شیخ الاسلام گجراتی دارالملک دہلی کے قاضی تھے ۱۰۸۶ھ میں عالمگیر نے ان کو مجبور کر کے قاضی القضاۃ کا عہدہ عنایت کیا اس عہدہ جلیلہ کے فرائض انہوں نے نہایت آزادی اور راست بازی کے ساتھ انجام دیئے اور حق بات کے ظاہر کرنے میں کسی بادشاہ کے سامنے بھی نہیں چوکے ان کے بعد ہی ان کے داماد قاضی ابوسعید ۱۰۹۴ھ میں ان کی جگہ اقضی القضاۃ کے عہدہ کے لئے گجرات ہی کے علماء کا منتخب ہونا اس کے علمی وفنی امتیاز کا کھلا ثبوت ہے۔

شخصی، خاندانی وموروثی سلطنت کے دور میں والیان سلطنت اوران کے وزراء کا نہ صرف متبع شریعت وسنت ہونا بلکہ صلاح وتقویٰ میں اور شرع ودین کی واقفیت میں ممتاز ہونا پوری قلمرو زیر حکومت علاقہ اور خواص وعوام کے طبقہ پر اثر انداز ہوتا ہے اوراس سے پوری قلمرو میں دین کا احترام اور شریعت پر عمل کرنے کا جذبہ اور رجحان پیدا ہو جاتا ہے اس سلسلہ میں بھی گجرات کو ایک محدود لیکن طویل مدت تک یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہاں بعض ایسے سلاطین صاحب اقتدار اور فرمانروائے ملک رہے ہیں جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کے صوبوں کی تاریخ اور سلاطین وقت کی سوانح (سلطان محی الدین اورنگ زیب کو مستثنیٰ کر کے جن کو بعض فضلائے عرب نے سادس الخلفاء الراشدین کا لقب دیا ہے) میں مشکل سے ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں مظفر شاہ حلیم گجراتی (م۹۳۲ھ) کی ذات ہے مولانا سید عبدالحیٔ صاحب ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

فضل وکمال کے ساتھ تقویٰ وعزیمت کی دولت بھی اس نے خداداد پائی تھی تمام عمر نصوص احادیث پر عمل رہا، ہمیشہ باوضو رہتا نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا روزے عمر بھر نہیں چھوٹے۔

ان سلاطین میں بعض ایسے سلاطین گزرے ہیں جن کی خدمت دین اشاعت علم اوراس کی سرپرستی کا دائرہ گجرات کے حدود سے نہیں بلکہ ہندوستان کے حدود سے بھی نکل کر مرکز و مصدر علم دین حجاز مقدس تک وسیع تھا وکفی بہ فخرا و شرفا مولانا سید عبدالحی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

محمود شاہ دوم (م۹۶۱ھ) کی توجہ وسرپرستی سے مکہ معظمہ میں ایک عظیم الشان مدرسہ باب عمرہ سے متصل قائم کیا گیا جس میں علامہ شہاب الدین ابن حجر مکی اور معز الدین عبدالعزیز زمزمی وغیرہ علمائے مکہ تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے علاوہ اس کے کئی رباط اور مکتب مکہ معظمہ میں تعمیر کئے گئے۔ محمود شاہ نے اس پر قناعت نہیں کی بلکہ اس نے خلیج کنبایہ (کھمبائیت) میں ایک بندرگاہ کی آمدنی محض حرمین محترمین میں رہنے والوں کے واسطے وقف کردی تھی یہاں سے ایک لاکھ اشرفیوں کی قیمت کا مال جدہ بھیجا جاتا تھا اوراس کے بھیجنے میں جو کچھ صرف ہوتا تھا وہ خزانہ شاہی سے دیا جاتا تھا اس مال کے فروخت سے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ سب اہل حرمین محترمین پر تقسیم کردی جاتی تھی۔

حضرات! ان قابل فخر تاریخی حقائق اور گجرات کے شاندار علمی و دینی دور کا تقاضا ہے کہ حفاظت وحمایت شریعت بلکہ غیرت دینی وحمیت اسلامی کا جو قدم ہندوستان بلکہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اٹھایا جائے، اور مسلمانوں کو پوری شریعت پر عمل کرنے جس میں وہ عائلی قانون (پرسنل لا) بھی داخل ہے، جس کی بنیاد کتاب وسنت کے نصوص آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ پر ہے اور اپنے معاشرتی معاملات، ازدواجی وعائلی زندگی کے مختلف مراحل اور تقاضوں کے سلسلہ میں شرعی وقانونی طور پر خود کفیل ہونے اور اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کی دعوت دی جائے تو اہل گجرات اس پر لبیک کہیں اور اس کے لئے اپنے صوبہ کی فضا کو موافق ومعاون بنائیں بلکہ اس کی کامیابی اور نفاذ کے لئے اگر ہندوستان کے کسی گوشہ سے بھی صدا لگائی گئی ہے اور اس کے لیے جدوجہد شروع کی گئی ہے تو اس کے ساتھ پورا تعاون واشتراک کریں۔

حضرات! اب جب اسلام کے عائلی قانون کا تذکرہ آ گیا ہے تو مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عائلی قانون کی بلندی وبرتری، اس کے انسانیت کے احترام، فطرت انسانی سے مطابقت، عورت کے اسلام میں مرتبہ اور اس کے حقوق کا اعتراف اس کے ساتھ انصاف بلکہ رعایت وفیاضی کے بارہ میں بھی کچھ عرض کیا جائے اور قوانین مروجہ، دنیا کے مختلف مذاہب وتہذیبوں اور معاشرتی وازدواجی زندگی کے رائج الوقت نمونوں اور مناظر کو سامنے رکھ کر تقابلی مطالعہ کی روشنی میں کچھ غیر مسلم مفکرین ماہرین قانون تمدن تہذیب علم کے مؤرخین اور فضلاء کے اقوال پیش کئے جائیں جنھوں نے اسلام کے عائلی قانون کی برتری انصاف پروری احترام انسانی نہیں بلکہ احترام نسوانی کا برملا اعتراف کیا ہے، اس کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی جاتی ہے کہ عام طور پر غیر اسلامی ذرائع ابلاغ پریس اور یک طرفہ ناقدین نے اس کے بارہ میں عام طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کا عائلی قانون طبقہ نسواں کے ساتھ انصاف پر مبنی نہیں ہے، وہ قدیم تہذیب ومعاشرت اور اس عہد کی یادگار ہے جب عورت کو وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا جس کی وہ مستحق ہے اور یہ قانون اب اس ترقی یافتہ دور میں باقی رہنے اور چلنے کے قابل نہیں ہے جب حقائق سے پردہ اٹھ گیا ہے قدیم رسم ورواج داستان پارینہ بن گئے ہیں عورت زندگی میں برابر کی شریک ہے اور اب ترقی یافتہ مغرب ہی اس سلسلہ میں قابل تقلید واستفادہ ہے۔

اس پروپیگنڈہ کا کچھ اثر مسلمان بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر بھی ہوا ہے اور ایک طرح کے احساس کہتری میں مبتلا ہو گیا ہے اور اس میں اپنے عائلی قانون پر افتخار ہی نہیں اعتماد و اطمینان اور دفاع کا جذبہ بہت جگہ سرد پڑ گیا ہے ہم اس موقع پر چند مغرب ماہرین قانون مؤرخین تمدن وتہذیب اور مغربی دانشوروں کے اقوال پیش کرتے ہیں جنہوں نے صاف اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام کا عائلی قانون دوسرے قوانین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ منصفانہ حقیقت پسندانہ اور کہیں زیادہ طبقۂ نسواں کے احترام اور اسکے ساتھ انصاف ومراعات پر مبنی ہے یہ بیانات ہمارے مرعوب تعلیم یافتہ طبقہ کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دینے کے لئے کافی ہیں جس نے آزاد تقابلی مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی اور وہ یک طرفہ سطحی بیان سے متاثر ہے۔

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ایک مغربی فاضلہ کا بیان پیش کرتے ہیں اس لئے کہ اس سلسلہ میں خواتین زیادہ حساس جذباتی زود احساس اور رقیق الشعور واقع ہوتی ہیں، اس لئے کہ یہ ان کے طبقہ کا قضیہ ہے اور وہ اپنے طبقہ کی طرف سے دفاع اور اس کی حمایت اپنا فرض سمجھتی ہے۔

مسز اینی بسنٹ جو جنوبی ہند کی ایک ثقافتی ادارہ (تھیا سوفیکل سوسائٹی) کی صدر رہی ہیں ،انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا وہ اپنی کتاب ''ہندوستان کے عظیم مذاہب'' ہین لکھتی ہیں:

قرآن مجید کی آیت ہے، **ومن يعمل من الصالحات من ذكر او انثى وهو مؤمن فاؤ لئك يد خلون الجنة و لا يظلمون نقيرا** (النساء ۱۲۴)

(اور جو کوئی نیکیوں پر عمل کرے گا (خواہ) مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان ہو تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا) پیغمبر محمد ﷺ کی تعلیمات عام اخلاقی ہدایات میں محدود نہیں بلکہ عورتوں کی وراثت کیلئے پورا قانون قرآن مجید میں موجود ہے اور وہ قانون اپنے عدل وانصاف اور آزادی کی وسعت اور کارفرمائی میں اس مسیحی وانگریزی قانون سے کہیں زیادہ فائق ہے جس پر اب سے بیس سال پہلے تک برطانیہ میں عمل ہوتا رہا ہے اسلام نے عورت کے لیے جو قانون بنایا ہے وہ ایک مثالی قانون کا درجہ رکھتا ہے اس نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور امکانی حد تک ان کی مدد کا ذمہ لیا ہے، اور ان کے کسی ایسے حصہ پر (جو

وہ اپنے اعزاء و بھائیوں اورشوہروں سے پائیں) دست درازی کا سد باب کر دیا ہے۔
ایک دوسری جگہ لکھتی ہیں:۔
یک زوجگی اور تعدد ازدواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر ڈالنا نہیں چاہتے جسے اس کے اولین محافظ سڑکوں پر صرف اس لئے پھینک دیتے ہیں کہ اس سے ان کا دل بھر جاتا ہے اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا، عظیم و نامور فرنچ مصنف و دانشور گستاؤلیبان اپنی شہرۂ آفاق کتاب تمدن عرب میں لکھتا ہے:
میراث کے وہ اصول جو قرآن میں صراحت کے ساتھ آئے ہیں وہ کتاب ہندوستان کے عظیم مذاہب عدل وانصاف کا ایک واضح مظہر ہیں ان کے اور ان حقوق وقوانین کے درمیان مقابلہ کرنے سے جو فرانس وانگلستان میں عورت کے بارہ میں ہیں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی نے شادی شدہ خواتین کو جن کے بارہ میں مغرب میں دعویٰ کے وہ حقوق دیئے ہیں جن کی نظیر ہمارے قوانین میں نہیں ملتی اسلام کا اثر مشرق میں عورت کی پوزیشن پر بہت گہرا اور وسیع تھا اس نے عورت کی معاشرتی پوزیشن کو گھٹانے کے بجائے بہت بلند کر دیا ان تمام دعاوی ومزعومات کے خلاف جو بغیر کسی دلیل ومطالعہ کے یورپ میں دہرائے جاتے ہیں قرآن نے عورت کو وہ وراثتی حقوق عطا کئے ہیں جو ہمارے مغربی قوانین سے کہیں بہتر ہیں اسلام میں عورتوں کے مرتبہ واہمیت پر اس سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ عربوں کے تمدن کے عروج کے زمانہ میں ان میں کثرت سے ایسی خواتین نظر آتی ہیں جو بڑا بلند علمی وادبی مقام رکھتی تھیں۔
عہد عباسی میں ان کی ایک بڑی تعداد مشرق میں اور عہد اموی میں اسپین (اندلس) میں پائی جاتی تھی۔
والیٹر اپنے مضمون میں جو فلسفہ قرآن کے عنوان سے ہے ڈکشنری آف فلاسفی میں لکھتا ہے:۔
ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں کہ قرآن عورت کا وہ امتیاز مانتا اور بیان کرتا ہے جو اس کو فطرت کی طرف سے ملا ہے لیکن قرآن اس بارہ میں تورات سے مختلف نظر آتا ہے کہ وہ عورت کی فطری کمزوری کو خدائی سزا نہیں مانتا جیسا کہ سفر التکوین الاصحاح الثالث نمبر ۱۶ میں ہے۔

یہ غلط بیانی اور تلبیس کی بات ہے کہ محمد ﷺ) جیسے عظیم شارع کی طرف عورتوں کے حق میں زیادتی و ناانصافی منسوب کی جائے حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ:۔

فان کرهتموهن فعسى ان تكرهوا شيئا ويجعل الله فيه خيرا كثيرا

اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو عجب کیا کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھدے۔

نیز

ومن آيته ان خلق لكم من انفسكم ازواجا لتسكنوا اليها وجعل بينكم مودة ورحمة ان فی ذلک لأيتٍ لقوم يتفكرون (الروم: ۲۱)

اور اسی کی نشانیوں میں ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں، ایک دوسرا مغربی مصنف اپنی کتاب میں لکھتا ہے: اگر معاشرتی نقطۂ نظر سے یورپ میں عورت ایک بلند مرتبہ و مقام پر پہنچ گئی ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کی پوزیشن مذہبی و قانونی حیثیت سے چند سال پہلے تک (اور بعض مقامات پر اب تک) اپنے مرتبہ و مقام میں اس سے کم ہے جو مسلمان کو علم اسلامی میں حاصل ہے۔

مسٹر لکھتے ہیں:۔

بلا شبہ عورتوں کی حیثیت کے بارہ میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگیز تبدیلی کے مظہر ہیں اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اس سے پہلے حاصل نہیں تھی طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے وہ عدت کو اس میں شامل کرنا ہے۔

حضرات! ان نقول واقتباسات کے جو اسلام کے عائلی قانون کی نہ صرف مقبولیت، انصاف پسندی بلکہ امتیاز و برتری کی شہادتوں پر مشتمل تھے پیش کرنے کے بعد اہل دین واہل دانش کے اس تاریخی اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں

کہ فلسفہ اخلاق فلسفہ انفسیات اور فلسفہ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق ورابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی اور مذہب معاشرت کے بغیر مئوثر ومحفوظ نہیں رہ سکتا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں اپنے معاملات میں مسلمان نہیں اپنے عائلی وخاندانی روابط وتعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں۔

اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اسکو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کا کرنا چاہئے، اور یہ ہمارا شہری آئینی جمہوری اور دینی حق ہے اور ہندوستان کا دستور اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف س کی اجازت دیتا ہے بلکہ اسکی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقاء اپنے حتوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

مگر ابھی آئینی اور حکومتی سطح پر کوئی ایسا اقدام یا خطرہ سامنے نہیں آیا تھا جس کا کھلے طور پر نوٹس لیا جائے اور اس خطرہ کو رفع کرنے یا اس سے محفوظ رہنے کی منظم اور جمہوری طریقے پر کوشش کی جائے کہ اچانک سپریم کورٹ کی طرف سے یکساں عائلی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا گیا، اور حکومت کو توجہ دلائی گئی کہ وہ دستور ہند کے اس رہنما اصول کو نافذ کرے کہ اس سے ملک میں اتحاد معاشرت میں یکسانی اور وحدت پیدا ہوتی ہے اور اس سے ان بعض خطرات کا ازالہ ہوتا ہے جو بعض فرقوں (بلکہ صحیح معنی میں اکثریت) کو پیش آرہے ہیں۔

سپریم کورٹ کے اس شگوفہ کو چھوڑنے نے جو دستور ہند کے بنیادی اصول اور دفعہ مذہب میں عدم مداخلت کے بالکل منافی اور اقلیت کے لئے ایک چیلنج ہے مسلمانوں کو خاص طور پر دین کا علم اور ملی غیرت رکھنے والوں اور ان میں بھی خصوصی طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں کو چونکا بلکہ لرزا دیا جنہوں نے مطلقہ کو دائمی نفقہ دینے کے خلاف مہم چلائی تھی اور سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو منسوخ کرانے میں جو اس نے شاہ بانو کیس میں کیا تھا غیر معمولی اور تاریخی کامیابی

حاصل کی تھی۔

سپریم کورٹ کی حکومت کو اس توجہ دہانی اور پریس میں اس کے آجانے کے بعد سے مسلمانوں میں (بلا اختلاف فرقہ واریت، حلقہ خیال اور سیاسی تنظیم و پارٹی) ایک کھلبلی سی مچ گئی اور شاہ بانو کیس سے بھی زیادہ اس سے مذہب میں صریح مداخلت کے خطرات پیدا ہو گئے اس لئے کہ شاہ بانو کیس ایک جزئیہ سے تعلق رکھتا تھا اور وہ مطلقہ کو دائمی نفقہ دینے کا مسئلہ تھا جس کی شریعت اسلامی میں کوئی قید و شرط نہ تھی، لیکن یونیفارم سول کوڈ پوری شریعت اسلامی، نکاح و طلاق تعدد ازدواج کی اجازت نفقہ و میراث سب کے لئے ایک چیلنج اور ان کے ازالہ اور سد باب کے لئے دروازہ کھولتا تھا اور مسلمانوں کے لئے (جو ایک مکمل آسمانی شریعت منزل من اللہ کتاب اور عادلانہ و مطابق فطرت معاشرتی قانون رکھتے ہیں) خطرہ کی ایک گھنٹی بلکہ زندگی کی پوری چلتی ہوئی گاڑی کے لئے خطرہ کا اور روکنے کا ایک سگنل تھا۔

پھر سپریم کورٹ کی یہ توجہ دہانی بالکل ایک بے وقت بے ضرورت اور بے فائدہ کام تھا کہ اس سے ملک کے حالات میں کوئی بہتری باہمی اعتماد کی فضا اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے کوئی جذبہ اور جوش نہیں پیدا ہوتا تھا، بلکہ ملک میں ایک نئے انتشار کا اندیشہ اور صف آرائی کا خطرہ تھا اس لئے کم سے کم مسلمان اپنے عائلی قانون کو بجا طور پر عقائد و فرائض کی طرح دین کا ایک جزء اور قرآن کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اس عائلی قانون کی بنیادیں اس کے اہم اجزا قرآن مجید میں (نصوص کی صورت میں) صراحۃً موجود ہیں، پھر اس سے ملک کے مختلف فرقوں اور مذاہبوں میں کسی طرح بھی اتحاد اور وحدت نہیں پیدا ہو سکتی کہ اس کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں، اور دن رات اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ایک ہی عائلی قانون رکھنے والے ایک دوسرے سے برسر پیکار اور دست و گریباں ہیں۔

اس سلسلہ میں کچھ فیصلے اور اقدامات ضروری ہیں جو اس ملک میں جو آئینی حیثیت سے اور اعلان کی حد تک سیکولر ہے لیکن عملی اور واقعاتی طور پر وہ اکثریت کے مذہب تہذیب و معاشرت اور رجحانات کے تابع ہوتا جا رہا ہے اور یہاں تدریجی طور پر ملک کا رخ اکثریت کے ترجمان و پسندیدہ نظام تعلیم طرز عمل اور عائلی قوانین و رسوم کی طرف پھیرا جا رہا ہے۔

۱۔ پہلا ضروری اقدام و فیصلہ یہ ہے کہ اس ملک میں جا بجا شرعی دار القضاء قائم ہوں

جہاں سے عائلی اختلافات وتنازعات اور واقعات وحوادث کا شرعی فیصلہ معلوم کیا جائے اور اس پر عزم وخلوص اور دیانت داری کے ساتھ عمل کیا جائے اس سے مسلمان خاندان اس طوالت، مصارف کثیر اور سب سے بڑھ کر شریعت کی مخالفت کے امکان وخطرہ سے بچ جائیں گے جس کا عدالتی فیصلوں سے خطرہ ہے اور جس کے بار بار تجربے ہو چکے ہیں پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شرعی فیصلہ پر فریقین اکثر راضی ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے بغل گیر ہوئے ہیں اور وہ محاذ آرائی ختم ہوگئی ہے جو اس سے پہلے موجود تھی پھر اس سے ان کو وہ اجر وثواب ملتا ہے جو حکم خداوندی کے سامنے سر تسلیم جھکا دینے سے حاصل ہوتا ہے اور وہ خدا کے حکم سے اس سرتابی اور بغاوت سے بچ جاتے ہیں جس کے بارہ میں قرآن مجید کے صاف الفاظ ہیں۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاؤ لئلک ھم الفسقون (المائدہ - ۴)

اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔

اس سلسلہ میں اسلام کے عائلی قانون پر کتاب کی تدوین مکمل ہو چکی ہے اور ضرورت ہے کہ وہ جلد زیور طبع سے آراستہ ہو اور اس کا انگریزی وہندی میں ترجمہ بھی ہو جائے اور اسی کی روشنی میں ایسی عدالتوں "اسلامی دارالقضاء" میں فیصلے ہوں۔

۲۔ دوسرا کام اصلاح معاشرہ کا کام ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام صرف چند عقائد فرائض اور عبادات مفروضہ کی ادائیگی میں محدود نہیں وہ ایک پورا نظام حیات ومعاشرہ ہے جس کا تعلق دونوں انسانی جنسوں (ذکور واناث) اور ہر عہد اور ہر ملک کے مسلمانوں سے ہے مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت (اپنے تمام اقسام ومراحل کے ساتھ) شریعت کے اس سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہئے جو اللہ کے آخری رسول ﷺ قیامت تک کے لئے لے آئے اور جس کے بارہ میں واضح الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ:۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً .

آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور تمہارے لئے

اسلام کو بطور دین پسند کرلیا۔ اور اس حکمت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ہر نبی کو انسانی لباس میں (بشر کی حیثیت سے) بھیجا تا کہ وہ اپنی امت متبعین اور اپنے ملک ومعاشرہ اور اپنے عہد کے زندہ انسانوں اور مختلف الانواع طبقات کے لیے نمونہ اور مثال وقابل تقلید ہستی بنے خود سید المرسلین وخاتم النبیین ﷺ کو بھی نوع بشر کے لئے اسوۂ کامل بنا کر بھیجا اور آپ کو ان تمام مراحل اور زندگی کے شعبوں سے گذارا جو انسانی زندگی کے فطری وضروری شعبے ہیں یعنی صحت ومرض شباب وکہولت فراغت ومجاہدہ صلح وجنگ ازدواجی زندگی اولاد کی پیدائش بچی اور ان میں بعض کی وفات بھی پھر بعض دختران خاندان نبوت کے فریضہ ازدواج کی ادائیگی، پھر ان سب مراحل وشعبوں کے بارہ میں (حدیث وسیرت کے ذریعہ) مستندترین معلومات مہیا کرنے اور محفوظ رکھنے کا غیبی نظام فرمایا جس کی مثال صالحین ومتقین مصلحین ومعلمین کا ذکر گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں بھی نہیں ملتی اور پھر اس سب کے بعد فرمایا:

لقد لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیرا (الاحزاب ۲۱)

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے یعنی اسکے لئے جو ڈرتا ہو اللہ اور روز آخرت سے اور ذکر کثرت سے کرتا ہو۔

پھر اس کے بعد آپ ہی کی حیات طیبہ مبارکہ میں دار الہجرہ مدینہ میں وہ اسلامی معاشرہ قائم ہوا جو زندگی قدرت واستطاعت، فراغت وعسرت شباب وکہولت خاندانی وقبائلی اختلافات ذوق وصلاحیت کے تنوع کے ساتھ ایک زندہ متحرک حساس عمل واختیار کی صلاحیتوں کے تنوع کے ساتھ آپ کی حیات طیبہ میں دس سال تک اور آپکی وفات کے بعد خلافت راشدہ کے عہد میں ایک مثالی معاشرہ تھا اس میں قدرۃ وفطرتاً شادیاں بھی ہوتی تھیں نکاح بھی ہوتے تھے اور طلاق بھی بیٹی کو نکاح کے بعد رخصت بھی کیا جاتا تھا اور بہو کو بیاہ کر گھر بھی لایا جاتا تھا مہر بھی متعین ہوتا تھا اور کسی نہ کسی شکل ومقدار میں جہیز بھی دیا جاتا تھا والدین کے انتقال کے بعد میرث بھی تقسیم ہوتی تھی اور املاک وجائداد میں حصہ بھی دیا جاتا تھا تجارت زراعت اور انواع معیشت میں مشارکت اور حصہ داری بھی ہوتی تھی غرض زندگی اپنے تنوع کے ساتھ موجود تھی اور مستندترین تاریخی ذرائع تاریخ ومستند ومتواتر روایات کے ذریعہ) اس کی ایسی تصویر محفوظ ہے

جس میں ان سب کے نمونے انواع والوان مظاہر ومناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جوعشرہ مبشرہ میں ہیں مہاجر ہیں اور قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں اوراس کا پورا امکان ہے کہ اوپر ان کے خاندان کے اور بنی ہاشم (خاندان رسالت) کے رشتے بھی ہوئے ہوں ایک دن معمول کے مطابق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو آپ ان کے لباس میں عطر کی ایسی خوشبو پاتے ہیں جو عام طور پر اس سے پہلے نہیں ہوتی تھی آپ ﷺ سوال فرماتے ہیں کہ عبدالرحمن کیا بات ہے آج تمہارے کپڑوں میں بہت عطر لگا ہوا ہے وہ جواب دیتے ہیں یارسول اللہ میں نے نکاح کیا ہے،اس پر حدیث وروایات کی کسی کتاب میں یہ نہیں ملتا کہ آپ نے شکایت واستعجاب کا کوئی لفظ فرمایا ہو کہ عبدالرحمٰن! اتنی جلدی یہ بے تعلقی یا بے مروتی تم نے ہمیں خبر بھی نہیں کی اور نہ دعوت اور نہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے معذرت وشرمندگی کا کوئی جواب منقول ہے حالانکہ یہ مسلم ہے اور تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یثرب (جواب مدینہ طیبہ ہے) کوئی ایسا بڑا شہر نہیں تھا جہاں اطلاع دینے کے لئے کوئی بڑا فاصلہ طے کرنا پڑتا اور یہ بھی ایک تجربہ ومشاہدہ کی بات ہے کہ ایک شہر یا ایک نسل و پیشہ کے لوگ جب ترک وطن کر کے کسی دوسرے ملک یا شہر میں جاتے ہیں تو عام طور پر قریب ہی رہتے ہیں اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کے مزاج اور روایات سے واقف ہوتے ہیں اور خواتین کو بھی ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں آسانی ہوتی ہے،آپ یہ سننے کے بعد کہ عبدالرحمٰن ابن عوف نے نکاح کیا صرف یہ فرماتے ہیں کہ اولم ولو بشاۃ (دیکھو ولیمہ ضرور کرنا چاہے ایک بکری کا ہو)

یہ واقعہ اور روایت اس پر پوری روشنی ڈالتی ہے کہ عقد ونکاح کوئی ایسی ہنگامہ خیز اور زلزلہ انگیز تقریب یا واقعہ نہیں ہے کہ سارے شہر کو پوری برادری کو اور اہل تعلق کو اس کی خبر کی جائے اور ان کو مدعو کرنا ضروری سمجھا جائے ورنہ یہ سخت قابل شکایت بات ہوگی اور پھر اس میں ایسے اہتمام اور دھوم دھام سے کام لیا جائے جس سے نکاح کرنے والے یا اس کے سرپرست یا خاندان کی حیثیت عرفی کا اظہار وتعین ہو۔

میدنہ طیبہ کے اس مثالی اور معیاری معاشرہ اور طرز زندگی کے بعد عرصہ دراز تک (جب تک مسلمان بیرونی تمدنوں اور طرز معاشرت سے متاثر نہیں ہوئے اور ان میں اظہار شان و

شوکت کی بیماری نہیں آئی) یہی طرز نکاح وازدواج اورس کی سادگی اور محدودیت قائم رہی، عام طور پر مساجد میں نکاح ہوتے تھے بعض مرتبہ کسی نماز کے بعد اچانک اعلان کردیا جاتا تھا کہ نماز کے بعد حاضرین تشریف رکھیں، فلاں کا نکاح ہوگا اکثر خاندان کے تمام افراد کو بھی اس کی پہلے سے خبر نہیں ہوتی تھی۔

لیکن جب مسلمان ان ملکوں میں جا کر بسے جہاں دوسرا نظام معاشرت طریقہ ءشادی وغمی اور طرز زندگی رائج تھا جس میں عزت وافتخار شہرت ونا موری اور حب جاہ کا جذبہ کام کررہا تھا یا وہ اس ملک کے قدیم روایات کے مطابق تھا جس میں دین ومذہب کا کم اور رسم ورواج کا زیادہ دخل تھا اور جو وہاں کے مذاہب کے علم برداروں اور اجارہ داروں کے تساہل وتغافل اور ایک حدتک تعاون کا نتیجہ تھا تو مسلمان جن کو اس معاشرہ وماحول پر اثر ڈالنا چاہئے تھا اور اسکی اصلاح کرنی چاہئے تھی وہ الٹے اس معاشرہ وماحول اور طرز زندگی سے متاثر ہوئے اور انہوں نے نکاح کے اس مسنون فریضہ کو جو نہایت سادگی اور سہولت سے ادا کیا جاسکتا تھا ایک ہفت خواں سر کرنے کے مرادف بنا دیا جس کے لئے بعض اوقات سودی قرض لینے املاک کو فروخت کرنے یا رہن رکھنے کی نوبت بھی آجاتی اور وہ تمام قبائح ومنکرات اس میں شامل ہوجاتے ہیں جن سے شریعت نے روکا ہے اور پیغمبر خدا ﷺ اور آپ کے دین وشریعت کے صحیح ترجمانوں نے ان کی مذمت کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل مذمت اور لائق توجہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ جہیز دینے کے مطالبہ کا ہے جس کو خود مسلمانوں نے اختیار کرلیا ہے کہیں اس کا نام تلک ہے کہیں گھوڑا جوڑا اس سلسلہ میں وہ قابل مذمت اور لائق نفرت اقدامات بھی پیش آنے لگے ہیں اور بیاہی خاتون کے ساتھ احتجاج اور مقاطعہ کے وہ طریقے اختیار کئے جانے لگے ہیں جو نہ صرف شرعا واخلاقا مذموم ہیں بلکہ وحشت وجاہلیت کی یادگار ہیں جب دوست کی معبود کی طرح پرستش ہوتی تھی اور اس کے حصول کے لئے سب کچھ جائز سمجھا جاتا تھا۔

پھر اسی طرح طلاق کے بارہ میں ترکہ کی تقسیم اور میراث کے بارہ میں رفیقہ حیات کے حقوق کی ادائیگی اور معاشرت کے بارہ میں بہت سی کوتاہیاں مسلمانوں کے معاشرہ اور عائلی زندگی میں ایسی داخل ہوگئی ہیں جنھوں نے اسلامی معاشرہ کا امتیاز اور وقار کھودیا ہے اور کثیر التعداد مشکلات پیدا کردی ہیں جو محض اس شریعت سے روگردانی اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے جو ایک

نعمت خداوندی کے طور پر انسان کو دی گئی تھی۔ ان حقائق کے پیش نظر جنھوں نے اسلام کی عمومیت ابدیت مطابق فطرت ہونے اور نعمت خداوندی ہونے پر پردہ ڈال دیا ہے اور مسلمان معاشرہ کو صدہا مشکلات میں اور قبائح میں مبتلا کر دیا ہے ایک عالمگیر تو نہیں لیکن ہند گیر مہم چلا نے کی ضرورت ہے یہ کام اصلاح معاشرہ کے عنوان سے مسلم پرسنل لا بورڈ نے شروع سے اپنے پروگرام میں داخل اور اپنے فرائض میں شامل کیا تھا اس سلسلہ میں پٹنہ میں لکھنو میں میرٹھ میں بستی میں اور بعض دوسرے مقامات پر اصلاح معاشرہ کے نام سے کامیاب اور کثیر الازدحام کانفرنسیں ہوئیں جن میں پوری طاقت وتاثیر کے ساتھ عقائد وفرائض اسلام کی پابندی کے ساتھ اس کے معاشرتی نظام اور عائلی زندگی کے احکام قبول کرنے کی دعوت دی گئی اور صفائی کے ساتھ اس آیت کی روشنی میں مکمل اور مسلمانوں کو کامل اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔

یـاایها الذین آمنو ادخلوا فی السلم کافة و لا تتبعوا خطوات الشیطٰن انه لکم عد و مبین (البقرة :۲۰۸)

اے ایمان والو! سلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

ضرورت ہے کہ یہ کام ہند گیر پیمانہ پر ہو جا بجا اصلاح معاشرہ کے وسیع اور مؤثر جلسے ہوں اس میں صوبہ گجرت کے جس کی شاندر علمی ودینی تاریخ اور اس کے اس امتیاز وتفوق کا ذکر خطبہ کی ابتداء میں آچکا ہے جو اس کو صرف اس برصغیر میں نہیں بلکہ (ایک طویل عرصہ تک) عالم عربی واسلام میں حاصل رہا ہے ہر طرح شایان شان قرین قیاس اور حسب توقع ہے **واللہ ھو المو فق والمعین** ۔

آخر میں میں اس اعزاز کے لئے جو صدارت کی شکل میں ناچیز کو حاصل ہوا اور اس توجہ والتفات اور حسن استماع کے لئے جس کا مؤ مر حاضرین جلسہ نے اظہار کیا اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

الـحـمـد للہ الـذی هـدانا لهذا و ما کنا لنهتدی لو لا ان هدانا اللہ لقد جاء ت رسل ربنا بالحق.

وما علینا الا البلاغ المبین

عالم اسلام میں احساس کہتری کا مرض اوراس کے اثرات ونتائج

۱۴۔ ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۴۔ مارچ ۱۹۹۸ء کو المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلباء اور حاضرین وشرکاء مجلس کے سامنے یہ تقریر کی گئی۔

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتو كل عليه ، و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريک له و نشهد ان سيدنا محمدا عبده و رسوله. ارسله الله بالحق بشيرا و نذيراً . و داعياً الى الله باذنه و سراجاً منيراً . اما بعد.

عزیز طلباء! المعہد العالی ودار العلوم ندوۃ العلماء وحاضرین۔

میں بے تکلفی کے ساتھ اس پر اپنی مسرت کا اظہار کرتا ہوں کہ مجھے اپنے عزیز طلباء سے خطاب کرنے اور اس وقت جن حقائق کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور آئندہ جن حقائق کا سامنا کرنا ہے ان کی لئے ان کے ذہن کو تیار کرنے کا موقع مل رہا ہے یہ نہ صرف ندوۃ العلماء کے مقاصد میں داخل ہے بلکہ اس وقت پوری ملت اسلامی کے صاحب فکر صاحب علم اور صاحب صلاحیت طبقہ کے فرائض میں ہے اور یہ صورت حال کا صحیح جائزہ بھی ہے اور اس کا پورا مقابلہ اور اس کا مداوا بھی ہے۔

اس سے پہلے تقریر اس موضوع پر تھی کہ امریکا واسرائیل نے (اس میں خاص طور پر امریکہ جو قیادت وسیادت کی حیثیت رکھتا ہے) عالم اسلام کو بے کار بے اثر بنانے کے لیے بڑا عمیق لیکن بڑا وسیع اور بڑا منظم منصوبہ بنایا ہے عالم اسلام امریکا واسرائیل کے مقابلہ میں ایک حریف طاقت ہے اسرائیل امریکا کا وکیل اور ایجنٹ ہے اور اس کا ایک کارندہ ہے ان دونوں کی

طرف سے یہ منصوبہ بنایا جارہا ہے کہ ان کے مقابلہ میں کوئی محاذی طاقت کوئی آنکھ ملانے والی جمعیت باقی نہ رہے خاص طور پر جب سے کمیونزم کا زوال ہوا ہے (جو سرمایہ دار طاقتوں اور امریکا کا حریف تھا) اب اس کو جو کچھ خطرہ ہے وہ عالم اسلام سے ہے گزشتہ تقریر میں بتایا گیا تھا کہ وہ ایک حریف ہے اس نے ایک نقشہ بنایا ہے وہ اس وقت ایک سلبی حصہ تھا نشان دہی کا جائزہ کا مگر اب ہم ایجابی حصہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ اس کے لیے تیاری کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اندر اسلام کی خدمت کے لئے صلاحیت پیدا کرے پھر توفیق دے۔

صورت یہ ہے کہ اس حریف نے اسلامی ممالک بلکہ مرکز قیادت و مرکز توجہ میں سب سے زیادہ جو مؤثر دعوت اور مؤثر انقلاب انگیز چیز ہوسکتی ہے وہ عالم اسلام کے لیے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں احساس کمتری پیدا کیا جائے اس کو انگریزی میں (INFERIORITY COMPLEX) کہتے ہیں خاص طور پر اس طبقہ میں جو کہ ملک کی رہنمائی کرسکتا ہے (قیادت کی جگہ لینے والا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہی ہوتا ہے یونیورسیٹوں کے فضلاء کا یعنی انٹلکچول کلاس مثقف طبقہ) ان کی حقیقت شناسی کی داد دینی چاہئے کہ جو طبقہ کسی ملک کی زمام اختیار واقتدار لے سکتا ہے سیاسی طور پر بھی انتظامی طور پر بھی ذہنی وفکری طور پر بھی صحافی طور پر بھی وہ طبقہ ہے پڑھا لکھا طبقہ تعلیم یافتہ طبقہ یونیورسیٹوں کے فضلاء کا طبقہ یہی طبقہ زمام قیادت سنبھال سکتا ہے یہ طبقہ فکری قیادت بھی ہاتھ میں لے سکتا ہے اس میں جو چیز زیادہ موءثر ہوسکتی ہے عالم اسلام کو کمزور بنانے کے لئے اور مستقبل کی ضمانت کے لئے مستقبل میں مسلمانوں کے غیر مؤثر ہونے کے لئے اور حریف نہیں بلکہ حلیف بن جانے کے لئے اور ان مغربی تہذیب کے پوری طور پر (اگر بے ادبی نہ ہو تو کہا جائے) کلمہ پڑھنے والا بنانے کے لئے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کردینے کے لئے نہیں بلکہ اس کے داعی بن جانے اور اس کا مبلغ ہو جانے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ موءثر ہے وہ احساس کہتری ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ خیال پیدا ہوجائے کہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں اسلام کا کوئی مستقبل نہیں باقی عوام کا طبقہ تاجروں کا طبقہ کاشتکاروں کا طبقہ مزدوروں کا طبقہ جو جسمانی محنت سے کام لیتے ہیں ان طبقوں میں ایسی صلاحیت نہیں ہے جو اس کو حریف بنا کر میدان میں لے آئے اس تعلیم یافتہ طبقہ ہی

میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ملک کو بالکل ایک نئی فکر دے اور پورے ملک کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر کھڑا کر دے اور حریف کیمپ کو حلیف و مددگار کیمپ بنا دے اس میں اپنے دین کے بارہ میں اپنے بارہ میں اپنے ماضی کے بارہ میں احساس کمتری اور مستقبل کے بارہ میں مایوسی پیدا ہو جائے اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے بلکہ دماغ میں یہ بات تحلیل کر دی جائے کہ اب اسلام کا کوئی دور نہیں رہا اسلام کوئی ایسی مؤثر طاقت نہیں وہ عالمی وقیادی طاقت نہیں ہے جس سے کسی حریف کو خطرہ ہو اسلام نے اچھا کام کیا تھا وہ شکریہ کے قابل ہے چھٹی صدی عیسوی میں اس نے بت پرستی کی کھلی مذمت اور اس کی تردید کی دختر کشی کی مذمت اور مخالفت کی بڑی ناانصافی تھی کہ لڑکیاں دفن کر دی جاتی تھیں بہت اچھا کام کیا کچھ اخلاقی تعلیم بھی دی۔

لیکن اب دنیا نے ترقی کی جو منزلیں طے کر لی ہیں اور تمدن کی جس منزل پر یہ دنیا پہنچ گئی ہے اور جو سائنس کی ایجادیں اور کسی چیز کو پھیلانے اور کسی چیز کو دل و دماغ میں اتارنے کے جو نئے وسائل پیدا ہو گئے ہیں صحافت کی ٹیلی وژن کے انٹرنیٹ کے اس کے بعد اب مسلمانوں میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے کوئی ایسا امکان و وسیلہ نہیں ہے جو دنیا کو نیا پیام دے سکے اور دنیا کو ایک متبادل چیز دے سکے اس مغربی تہذیب کے مقابلہ میں لادینیت کے مقابلہ میں روشن خیالی کے مقابلہ میں ترقی پسندی کے مقابلہ میں اور پھر جو عالمی وحدت پیدا کی جارہی ہے اس کے مقابلہ میں بہت بڑی ذہانت کی اور دور بینی کی ضرورت ہے۔

ان مفکرین مغرب کا یہ انتخاب صحیح تھا کہ مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کیا جائے کہ ان کے اندر خود اپنے بارہ میں اپنے مستقبل کے بارہ میں اپنی صلاحیت کے بارہ میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں دنیا میں صرف قیادت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں بلکہ اپنے دین کے ساتھ باقی رہنے کی صلاحیت پر بھی ان کا یقین متزلزل ہو جائے ان کے اندر یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اسلام کا دور ختم ہو چکا ہے ایک زمانہ تھا جب ترقی نہیں ہوئی تھی مسلمان فاتحین نے ملکوں کو تسخیر کر لیا حکومتیں قائم کیں، اسلامی تمدن بھی پھیل گیا اور بعض ملکوں کی زبان بھی بدل گئی یہاں تک کہ وہ اسپین تک پہنچ گئے مغرب اقصیٰ تک پہنچ گئے لیکن اب زمانہ بہت بدل گیا ہے بہت ترقی کر گیا ہے ان لوگوں کے پاس نہ قومی طاقت ہے اور نہ اس کے پاس سائنس کے وسائل میں ترقی ہے اور نہ ان کے پاس وہ وحدت ہے جو اس وقت عالم مسیحی میں ہے یہ بڑی

چالاکی کی بات تھی مسلمانوں میں کمتری پیدا ہو جائے وہ کہیں کہ ہم کو زندہ رہنے کی اجازت دی جائی اچھا بھائی نماز بھی پڑھ لیا کرو خاموشی کے ساتھ اپنے دینی فرائض ادا کرو حج کو بھی چلے جایا کرو لیکن عصر حاضر کے نقائص بتانے ان پر تنقید کرنے اور ان کی مذمت کرنے اور انکے مقابلہ میں متبادل نظام پیش کرنے کی اجازت نہیں ہے مغربی تہذیب کو چلینج کرنا یا ان ممالک کی پوزیشن پر ان کے اقدامات پر تنقید کرنا ان کے بجائے متبادل نظام قائم کرنا کہ مسلم اکثریت کے ملک میں ان ہی کی قیادت ہو اور وہاں کے حکمراں وہی ہوں جو کہ دینی طور پر پورا یقین رکھتے ہوں خود شریعت کے پابند ہوں اور جن کے اندر اسلامی قانون کے نفاذ کا جذبہ ہو بالکل اس کا خیال نہیں کرنا چاہئے یہ کتنی بڑی چالاکی و ذہانت دور بینی اور نفسیات شناسی کی بات تھی آپ یقین مانئے کہ ہتھیار کے ذریعہ کسی ملک کو فتح کرنا اتنا کامیاب منصوبہ نہیں ہے جتنا کہ یہ آپ جانتے ہیں کہ جن ملکوں کو ہتھیار کے ذریعہ فوجی طاقت کے ذریعہ فتح کیا گیا وہ ملک آزاد ہو گئے خود ہندوستان ان ہی ملکوں میں ہے لیکن جب یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے (خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کی دل و دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے) کہ ہمارا دور ختم ہو گیا بس ہم اس کو غنیمت سمجھیں کہ ہمیں اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی ہے بس یہی بہت کافی ہے یورپ بھی اس طریقہ کار میں شامل تھا لیکن امریکا کے مقابلہ میں اب ذرا پیچھے آ گیا ہے اس میں مغرب کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو کسی ملک کی قیادت کا اہل ہوتا ہے مغربی زبان جانتا ہے یونیورسٹی کا فاضل ہوتا ہے اسکالر ہوتا ہے اور سیاسی نظاموں پر نظر رکھتا ہے اس سے اتنا متاثر ہے اور اس کی اندر گہرائی کے ساتھ یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اور کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں بس یہ غنیمت ہے کہ ہم نماز روزہ کر لیں اور ہمیں شرعی طریقہ پر نکاح وطلاق کی آزادی حاصل ہو اور ہمیں کوئی چھیڑے نہیں ہماری نسل کشی نہ ہو یہی غنیمت ہے۔

یہ نا انقلاب تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں ایسا پیدا ہوا کہ اس کے سامنے اگر کوئی بات کہی جائے تو مسلمان خود اس کی تردید کرنے لگے اس وقت جو خلاء پیدا ہوا ہے جو دنیا کے لئے انسانیت کے لئے خودکشی ہے مسلمان قیادت سے ہٹ گئے اور یہ قیادت ان قوموں کے ہاتھ میں چلی گئی جن کے اندر نہ خدا پر ایمان ہے نہ خدا کا خوف ہے نہ انسانیت کا احترام ہے نہ انصاف ہے۔

یہ سمجھا جانے لگا کہ مسلمان کوئی فیکٹر نہیں ہیں، کوئی عامل نہیں ہیں موثر نہیں ہیں وہ ایکٹ وشل ہیں، مسلمانوں کی صرف اتنی پوزیشن ہے کہ کوئی کام ان کے سپرد کر دیا جائے کر لیں، کوئی محاذ جو بہت پرامن ہو اور جو غیر خطرناک ہو، اس پہ ان کو کھڑا کر دیا جائے تو وہ کھڑے ہو جائیں باقی یہ کہ دنیا کی تاریخ کا محاسبہ اس طرح کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کے منصب قیادت سے جانے یا محروم ہو جانے کی وجہ سے دنیا کو یہ نقصان پہنچا، اس پیمانہ سے محاسبہ کیا جائے تو دنیا کا نہیں بلکہ خود مسلمانوں کا جو ذہین اور اونچا طبقہ ہے اس کا ذہن اس کو قبول ہی نہیں کرتا۔

اس کے سمجھنے کے لئے ایک بات آپ کو بتاتا ہوں کہ جب میری کتاب **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**،، مصر میں چھپی، جس کو اس سطح سے لکھا گیا تھا کہ دنیا کو کیا فائدہ پہنچا تھا مسلمانوں کی ترقی سے، جب مسلمان دعوت وقیادت کے منصب پر فائز ہوئے اس میں دنیا کو ایمانی حیثیت سے اخلاقی حیثیت سے، انسانی حیثیت سے انتظامی وتنظیمی حیثیت سے آپس کے تعلقات کی حیثیت سے اور اپنے منصوبوں اور عزائم کے لحاظ کیا فائدہ پہنچا؟ اس لحاظ سے تاریخ کا مطالعہ بہت کم کیا گیا تھا اور معاف کیا جائے اس پر بہت کم لوگوں نے قلم اٹھانے کی ضرورت سمجھی تھی یا جراءت کی تھی، جب یہ کتاب مصر میں چھپی اور ۱۹۵۱ء کے شروع میں جنوری میں ہمارا قاہرہ جانا ہوا تو ہماری موجودگی میں ایک مقبول اور بڑے اخبار میں مضمون نکلا کہ ابھی ایک کتاب نکلی ہے جس کا نام **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**،، ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نام رکھا کیسے گیا مسلمانوں کے تنزل اور پستی سے دنیا کو کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے کیا مسلمان اس پوزیشن میں ہیں کہ ان کے تنزل سے دنیا کو نقصان پہنچے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ استاذ ندوی نے کیسے اپنی کتاب کا نام **ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین** رکھا اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ یہ چیز دماغ میں کتنی بیٹھ گئی تھی اور علمی حلقہ میں پھیل گئی تھی کہ مسلمانوں کو ایکٹر سمجھا جائے یا کوئی تمدنی ڈرامہ ہو رہا ہے سیاسی ڈرامہ ہو رہا ہے تو اس میں ایک ایکٹر یہ بھی ہے جو ڈیوٹی بتادی گئی ہے کہ آپ کو یہ کرنا ہے وہ کرتے رہیں گے لیکن یہ بجائے ایکٹر کے عامل ومئوثر ہوں یہ ہو نہیں سکتا۔

یہ علامہ اقبال ہی کی خصوصیت ہے ان کا بڑا امتیاز ہے کہ انہوں نے خود اپنے اشعار میں

اس کا اظہار کیا، وہ کہتے ہیں کہ ابلیس کی ایک مجلس شوریٰ ہوئی جس میں معاصر دنیا کا جائزہ لیا گیا کہ اس وقت ابلیسی نظام کے خلاف دنیا میں کیا خطرات ہیں یعنی ابلیسی نظام کو کیا چیز چیلنج کرتی ہے تاکہ اس مجلس (مجلس ابلیسی) کے ارکان اسکے مقابلہ کی تیاری کریں تو کسی نے خطرہ بتایا سرمایہ داری کا کسی نے اشتراکیت کا مجلس ابلیسی کا جو صدر مجلس تھا وہ سب کا جواب دیتا رہا کہ اس کا جواب سوچ لیا گیا ہے یہ علاج ہے جب یہ کہنے کا موقع آیا کہ اصل خطرہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا۔ یہ اقبال کا کمال ہے کہ انہوں نیا بلیس کی زبان سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

یہ جو ذیلی اور وقتی خطرے ہیں ان سے ہم نہیں ڈرتے ہم نے سب کا علاج سوچ لیا ہے سرمایہ داری کے خلاف، اشتراکیت کے خلاف انتظام کرلیا ہے، لیکن ہمیں اصل ڈر یہ ہے کہ وہ قوم بیدار نہ ہوجائے جس کا کام احتساب کائنات ہے جو پوچھتی ہے یہ کیوں ہو رہا ہے یہ حلال ہے، یہ حرام ہے یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ شیطانی کام ہے یہ ملکوتی کام ہے، یہ خدا کے منشاء کے مطابق ہے، یہ خلاف ہے، میں اس سے ڈرتا ہوں، چنانچہ اس نے کہا کہ۔

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
تابساط زندگی پر اسکے سب مہرے ہوں مات

تم اس کو اس میں لگادو کہ وہ عبادت کرتے رہیں اور ذکر بھی کرتے رہیں تصوف کا اس کے ذہن میں ناقص نقشہ تھا اس کے مطابق اس نے کہا کہ ذکر وفکر صبح گاہی میں رہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکے جتنے مہرے ہیں سب مات ہوجائیں گے اور ہم بالکل آزادی کے ساتھ اپنا کام کرسکیں گے۔

عزیزو! بات یہ ہے کہ دو چیزیں ہیں جن پر ہم کو توجہ دینی ہے ایک یہ کہ اس احساس کمتری کو دور کیا جائے اس کے لئے فکری طور پر بلند معیار فکر سے اور علمی طرز تحریر اور بلند معیار سے کتابیں لکھی جائیں اور تقریریں کی جائیں دورے کئے جائیں تعلیم یافتہ طبقہ سے ملا جائے کہ اس کے اندر سے دین کے بارہ میں اور امت اسلامیہ کے بارہ میں احساس کمتری نکل جائے اس کے دل میں جو مایوسی بیٹھ گئی ہے اور تحقیر کی نظر، شرمندگی کی نظر جو اس کے اندر آگئی ہے کہ

ہاں سب ٹھیک ہے لیکن اس وقت اس کے متعلق بلند باتیں کرنا اور یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہونا چاہئے مسلمانوں کے پاس طاقت ہونی چاہئے یہ منکر ہے یہ معروف ہے یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے اس بحث کا موقع نہیں ہے یہ بات انہوں نے تعلیم یافتہ میں عام طور پر اور صاحب قلم صحیفہ نگار صحافتی طبقہ میں اور ملکوں کی جو لیڈرشپ ہے اس میں خاص طور پر یہ بات ایسی پیوست کردی ہے کہ ہم مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں اس ترقی یافتہ دنیا میں اس سیاست وسائنس کے دور میں امریکا کی سربراہی وقیادت کے دور میں اب مسلمانوں کا جو اپنے دین کے داعی ہوں اپنے دین کی برتری اور صلاحیت کار اور صلاحیت بقاء کے پورے پورے قائل ہیں ان کا کوئی موقع نہیں۔

یہ ہے اصل مرض جو سب سے بڑی بیماری ہے اس عہد کی کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے مستقبل کی طرف سے بالکل مایوسی آگئی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ ہم نماز روزہ کرلیں یہ بھی غنیمت ہے لیکن بلند نگاہی، حوصلہ مندی اور احساس برتری اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

خود ان ملکوں میں یہ حال ہے کہ وہ طبقہ حاوی ہوگیا ہے جو اسلام سے بالکل مایوس ہے اور مایوس ہی نہیں بلکہ اسلام کا نام لینے والوں کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہے، اس کے لئے الجزائر کی مثال لے لیجئے وہاں سول وار ہورہی ہے موجودہ صاحب اقتدار طبقہ کے درمیان اور دین پسندوں کے درمیان اور بے رحمی کے ساتھ دین دار مسلمان مارے جاتے ہیں الجزائر کو عالموں نے آزاد کرایا شیخ عبدالحمید بن بادیس نے آزاد کرایا عبدالقادر الجزائری نے اسے آزاد کرایا، جہاں اللہ کے نام پر شہادت کے شوق میں مسلمانوں نے فرانس کو نکالا اور الجزائر کو آزاد کرایا وہاں اسلام آج سب سے بڑا خطرہ بن گیا ہے، حکومت کا حریف بن گیا ہے، جیسے کبھی فرانس تھا اس کے بعد میں آیئے مصر میں، اخوان المسلمین کی تحریک شروع ہوئی بڑی روح پرور حیات افروز اور حوصلہ آفریں تحریک تھی جو عرصہ کے بعد عالم عربی میں پیدا ہوئی تھی اس کا انجام یہ ہوا ہے کہ امام حسن البناءؒ کو شہید کردیا گیا، سید قطب جو بڑے طاقتور لکھنے والے تھے بہت جری تھے اسلامی خیالات کے اظہار میں بڑے ادیب تھے ان کو شہید کیا گیا، یہ امریکا برطانیہ، اسرائیل نے نہیں کیا بلکہ خود مسلمان حکمرانوں نے کیا جمال عبدالناصر اور انور السادات نے کیا۔

شام جو اس وقت دروزیوں کے قبضہ میں ہے حافظ الاسد دروزی عقیدہ کا ہے، وہ شام

جہاں یرموک ہے، جہاں صحابہ کرام اور شہداء کی اتنی بڑی تعداد میں قبریں ہیں کہ مدینہ منورہ کے علاوہ کہیں نہیں ہیں، جہاں خالد بن الولیدؓ آرام فرما ہیں جہاں ابوعبیدہؓ آرام فرما ہیں جہاں بلال حبشیؓ آرام فرما ہیں جہاں کیسے کیسے علماء اور ائمہ فن ہوئے، وہ شام بھی اب دروزیوں کے رحم وکرم پر ہے حافظ الاسد نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''ہم کرسی توڑ سکتے ہیں چھوڑ نہیں سکتے''

ایک بات تو یہ ہے جس کی تیاری کرنی ہے، احساس کمتری کو دور کیا جائے آپ پڑھئے ان چیزوں کو جن سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور اس ترقی یافتہ دنیا کی کمزوری سامنے آتی ہے اور اس سازش کا پتہ چلتا ہے جو صرف اسلام ہی نہیں بلکہ حقانیت کے خلاف صداقت کے خلاف انسانیت کے خلاف کی گئی ہے اس کا گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت اللہ تعالیٰ آپ کو موقع دے کہ اتنی انگریزی آجائے کہ آپ ان کتابوں کا مطالعہ کریں جو مغربی تہذیب اور مغربی اقتدار کی تنقید میں لکھی گئی ہیں آپ کو معلوم ہو جائے کہ سب سے بڑا منصوبہ یہ ہے کہ اسلام کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا جائے بے اثر بنا دیا جائے وہ بس ایک تاریخی چیز رہ جائے، ہاں اپنے وقت میں اس نے بڑا کام کیا لیکن اب زمانہ بڑا ترقی کر گیا ہے اس میں وہ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ ہے مغربی تہذیب کی کمزوریاں آپ کو معلوم ہوں، علمی انداز میں معلوم ہوں اور تحقیقی وتحلیلی انداز میں معلوم ہوں کہ مغربی تہذیب میں کیا کمزوریاں ہیں اس وقت انگریزی میں بڑا لٹریچر ہے، قابل اعتراف اور قابل داد ہے خود یورپین مصنفین نے اس سلسلہ میں بڑی جرأت سے کام لیا ہے اور بہت صفائی کے ساتھ انہوں نے مغربی تہذیب کی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے ہم نے ایک کتاب دیکھی اس میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تہذیب میں یہ خرابیاں ہیں اور صفائی کے ساتھ اس میں مغربی تہذیب پر تنقید کی گئی ہے، ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ پیرس یا لندن میں وہاں کے رہنے والے نے ایک ہندوستانی فلاسفر سے کہا کہ ہمارا ہوائی جہاز اتنے منٹ میں پیرس پہنچ گیا اور ہمارا بحری جہاز اتنے گھنٹے میں فلاں جگہ پہنچ گیا، ہم نے اتنی ترقی کی تو انہوں نے کہا کہ ہاں تم کو ہوا میں چڑیوں کی طرح اڑنا آ گیا اور مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرنا آ گیا مگر آدمیوں کی طرح زمین پر چلنا نہ آیا ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ انہوں نے اس تہذیب پر، اس ترقی پر جراءت مندانہ طریقہ پر تنقید بھی کی ہے، ان چیزوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف ندوۃ العلماء کا نہیں بلکہ عالم اسلام کا ایک بہت ہی اہم مفید

بلکہ انقلاب انگیز طرز عمل ہوگا ،مہم ہوگی کہ آپ ایک طرف تو تعلیم یافتہ طبقہ سے احساس کمتری دور کریں جو احساس کمتری ان کے اندر پیوست ہو گیا ہے وہ کہتے ہیں:

ارے صاحب شکر کیجئے ،آپ کیا باتیں کرتے ہیں، مسجدیں تو موجود ہیں کوئی توڑتا نہیں، بابری مسجد کا قصہ تو الگ ہے مدرسے بھی اپنا کام کر رہے ہیں عید کی نماز آزادی کے ساتھ ہوتی ہے، حج کو بھی جاتے ہیں، بس اسی پر قناعت کیجئے یہ سوچئے کہ آپ کو کوئی موقع ملے قانون سازی کا اور آپ کو نئے نظام تمدن کے پیش کرنے کا ،کوئی اصلاحی مشورہ دینے کا اس کا بالکل موقع نہیں ہے ،تو اس چیز کو دور کرنے کی ضرورت ہے، وقت کا سب سے اہم فریضہ ہوگا کہ تعلیم یافتہ طبقہ سے احساس کمتری کو دور کیا جائے مغربی تہذیب کا پول کھول دیا جائے مغربی تہذیب کی جو حقیقت ہے وہ سمجھائی جائے کہ وہ ایک نفس پرستی اور جاہ پسندی ہے وہ ایک سطحیت ہے اور کچھ نہیں ،اس کے لئے تیاری کی ضرورت ہوگی ، مطالعہ کی ضرورت ہوگی ، اس میں آپ اسلام ایٹ دی کراس روڈس محمد اسد کی کتاب ،مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی کتابیں اور مضامین جو انہوں نے شروع میں لکھے تھے خود مجلس تحقیقات ونشریات، کی مطبوعہ کتابیں پڑھئے اور خود پہلے اپنے ذہن ودماغ کو آزاد کیجئے مغربی تہذیب کے نئے تمدن اور نئی تہذیب کے اثر سے اس کے جلال اس سے مرعوب ہونے کو دور کیجئے پھر اس کے بعد اپنے اندر صلاحیت پیدا کیجئے ذہنی طور پر، عملی طور پر کہ آپ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی متاثر کرسکیں، مطمئن کرسکیں کہ اب اس کا بھی زمانہ نکلنے والا ہے، اس کی روح پرواز کرنے والی ہے وہ ناکامی کی طرف بڑھ رہی ہے، کوئی رومی تہذیب تھی کوئی یونانی تہذیب تھی ،کوئی فرعونی تہذیب تھی جیسے ان سب کا خاتمہ ہو گیا اب اس کا بھی خاتمہ ہوگا یہ بہت بڑا کام ہے خاص طور سے اس شعبہ میں جو طلبہ ہیں جو اس سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بنیادی فرائض میں ہے کہ ان دو چیزوں کی تیاری کریں ایک احساس کمتری کو دور کرنے کے لئے علمی وفکری مدلل انداز میں ایک مغربی تہذیب کے تسلط کو جو ذہنی مرعوبیت ہے اور دلوں میں مغربی تہذیب کی جو تقدیس بیٹھ گئی ہے اس کو دور کیا جائے ،اس کے بغیر ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ کا فکری طور پر اسلام کا گرویدہ ہونا اور اسلام کے عروج کے لئے کوشش کرنا ناقابل قیاس ہے۔

آپ اس کے لئے اپنے اساتذہ سے جو الحمدللہ اس پر نظر رکھتے ہیں اور جب کبھی اہل علم

سے ملاقات ہو تو ان سے ان ماخذ و مصادر کا علم حاصل کریں کہ جن کو پڑھ کر آپ کے ذہن سے خود مغربی تہذیب کی برتری کا احساس اور اس سے مرعوبیت نکل جائے اور آپ دوسروں کو بھی متاثر کر سکیں اور یہ سمجھیں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جب تک اسلام کی پورے طور پر حقانیت، صداقت و وحدت (یعنی وہی واحد نجات دہندہ ہے وہی باعث سعادت و سلامتی ہے) کا خیال وعقیدہ پیدا نہیں ہوگا اس وقت تک یہی حال رہے گا کہ ایک ہٹا دوسرا آیا دوسرا ہٹا تو تیسرا آیا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی اسلامی ملک میں بھی اسلام کو پورے طور پر اپنی افادیت ثابت کرنے، اپنی ضرورت تسلیم کرانے اور اپنی برتری وصداقت کا کلمہ پڑھانے کی نوبت نہیں آئے گی، اللہ تعالی آپ کو توفیق دے کہ آپ اس میدان کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں کہ تعلیم یافتہ طبقہ سے احساس کمتری دور ہو اور اسلام سے جو ایک مایوسی دل میں بیٹھ گئی ہے کہ اب اس کا وقت نہیں رہا اب اس کا دور نہیں رہا اب تو ان ترقی یافتہ ممالک کا دور سیادت ہے جو سائنس میں بھی اور سیاست میں بھی ماہر ہیں، اسلامی ملکوں پر بھی انہیں کا قبضہ ہوگا جو مغربی تہذیب کے ترجمان بلکہ کارندہ اور ایجنٹ ہوں گے جیسا کہ اکثر ہو رہا ہے ہمارے اسلامی ملکوں میں وہی لوگ حکمرانی کر رہے ہیں جو امریکا و مغرب کے ایجنٹ ہیں، امریکا کے نمائندہ ہیں اس کے کارکن ہیں، مسلمانوں کے نام سے کام ہو رہا ہے لیکن کام ہو رہا ہے امریکا کا مغربی تہذیب کا اور اسلام سے اور زیادہ دوری بڑھتی جا رہی ہے، اللہ تعالی ہمیں توفیق دے۔

وآخر دعوانا نحمد لله رب العالمين۔

علم کا بھی ایک قانون ہے

دوسری دفعہ بھٹکل آمد کے موقع پر اساتذہ وطلباء اور منتظمین جامعہ سے حضرت مولانا امت برکاتہم کا خصوصی خطاب جو ہر مدرسے اور دینی ادارے سے تعلق رکھنے والے فرد کے لئے پیام راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم۔ امابعد۔

صحیح راہ کی ضرورت:

میرے عزیز واور بھائیو! آپ کو شاید معلوم ہو یا معلوم نہ ہو جو لوگ تفسیر پڑھتے ہیں او ران کی تفسیر کی کتاب شروع ہو چکی ہے یا کم سے کم سورہ بقرہ اور اس کا ترجمہ وتفسیر انہوں نے پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ جاہلیت میں جولوگ حج کو نکلتے تھے ان کا ایک صرف اور ضابطہ یہ بن گیا تھا جو خود ساختہ تھا شریعت میں نہیں تھا لیکن انہوں نے اپنی طرف سے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کرلی تھی کہ جب تک کہ حج سے فارغ نہ ہوں حج کے ارکان مین مشغول ہوں اور اس دوران اگر ضرورت ہو گھر آنے کی ،کوئی بات کہنے کی تو گھر کے دروازے سے نہ آئیں کہ ابھی تو اللہ کے گھر سے ہو کر نہیں آئے تو اپنے گھر میں قاعدے سے کیسے داخل ہوں تو چھتوں پر سے یا دیواروں کی طرف سے من ظہورھا پشت سے وہ گھر میں آیا کرتے تھے اور اس کو وہ بڑی نیکی کا کام سمجھتے تھے کہ اس میں بیت اللہ کا ادب واحترام ہے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے لیس البران تاتو البیوت من ظهورها یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ ولکن البر من اتقی وأتوا البیوت من ابوابها گھروں میں گھروں کے دروازوں سے آؤ یہی قاعدہ ہے اور یہی عقل سلیم اور ذوق سلیم کی بات ہے اور قانون قدرت ہے کہ جس چیز کا جو مدخل ہے اس سے آدمی آئے قرآن مجید تو پوری زندگی کی کتاب اور پوری زندگی کے لئے کتاب ہدایت ہے ہر طبقہ کے لئے ہر مشغلہ ہر میدان اور ہر مرحلہ کے لئے وہ ایک دستورالعمل

اور ایک ہدایت نامہ کا کام دیتا ہے قرآن کے یہ دو لفظ بڑے اہم و آتو البیوت من ابوابھا یہ پوری زندگی پر حاوی ہے اس میں پوری زندگی کی حکمت بتادی گئی یہ صرف گھر کا معاملہ نہیں ہر چیز کا معاملہ یہی ہے کہ جو اس کا دروازہ ہے اس دروازہ سے آنا چاہئے اگر کوئی شخص پیشہ سیکھنا چاہے کوئی صنعت دیکھنا چاہے لیکن صنعت کے استاذوں سے نہ سیکھے اور صنعت کے آداب کا خیال نہ کرے اور صنعت کے اوزار مہیا نہ کرے اور تدریج کے ساتھ درجہ بدرجہ مرحلہ وار اس کو نہ سیکھے اور یہاں تک کہ ان کی وردی استعمال نہ کرے لوہاروں کی ایک وردی ہے اور سقاؤوں کی ایک وردی ہے سپاہیوں کی ایک وردی ہے اور ڈاکٹروں کی ایک وردی ہے تو وردی تک بعض اوقات ضروری ہوتی ہے ورنہ وہ اپنے پیشہ میں کامیاب نہیں ہوگا اس کو پیشہ نہیں آئے گا نہیں آنے کا تو جب یہ معمولی چیزوں کا حال ہے اگر کوئی کہتا ہے کہ فضول باتیں ہیں ہمیں لوہاری کا فن سیکھنا ہے یا ہمیں فوج میں بھرتی ہونا ہے لیکن وردی کا جھگڑا ہم مول نہیں لیتے یہ پہنو یہ نہ پہنو اور صاحب لیفٹ رائٹ فضول بات ہے ہم اپنی ذہانت سے کام لیں گے ہم دوسرا طرز ایجاد کریں گے وہ یوں ہی رہ جائیگا اچھا سپاہی بن نہیں سکتا ایسے ہی لوہار نہیں بن سکتا نجار (کارپینٹر) نہیں بن سکتا اس کے لئے بھی و اتوا البیوت من ابوابھا کی ضرورت ہے جو اس کا دروازہ ہے ادھر ہی سے آؤ۔

حروف تہجی کی اہمیت

یہ و آتو البیوت من ابوابھا ساری زندگی، دین و دنیا سب پر حاوی ہے کہ اللہ نے اور فطرت انسانی نے فطرت سلیم نے سالوں سال کے تجربہ سے جو اصول مقرر کئے ہیں اور جو اس کے مداخل اور مخارج ہیں اگر کوئی شخص اس کا پابند نہ ہو ان کا کوئی احترام نہ کرے وہ بھی کامیاب نہیں ہو سکتا اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک شخص کہے کہ حروف تہجی کا جھگڑا عجیب ہے اب ''ا'' (الف) کا کون جھگڑا مول لے کہ پہلے الف ب ت پڑھے ہم براہ راست پڑھنا شروع کر دیتے ہیں تو وہ کتنا ہی ذہین ہو کبھی اس کو پڑھنا نہیں آئے گا جو ا، ب، ت نہیں پہچانتا یا نہیں پہچانا وہ کبھی ایک سیکنڈ نہیں بول سکتا آپ کسی وقت بھی تجربہ کر کے دیکھئے کہ آپ کے زمانے کا کوئی بقراط سقراط ہو جو بڑھا ہوا نہ ہو خواندہ نہ ہو، آپ اس کو ایک کتاب دیجئے اردو کی دیجئے یا انگریزی کی دیجئے یا عربی کی دیجئے یا یہیں کی کسی زبان کی دے دیجئے اور کہئے کہ رات

پھر نہیں آپ کو ایک مہینہ کی مہلت دی جاتی ہے آپ کے پاس کوئی دوسرا آدمی نہیں جائے گا۔ یہ کتاب ہے اور آپ ہیں ہم آپ کو کمرے میں بند کر دیتے ہیں تالہ لگا دیتے ہیں کھانے پینے کا سب سامان کھڑکی سے ہم پہنچاتے ہیں اور وہاں پہلے سے موجود اور زندگی کی سب ضروریات ہیں ایک مہینہ نہیں چھ مہینے آپ اس میں رہئے اور یہ صفحہ حل کر دیجئے اس صفحہ کو آپ پڑھ دیجئے اور اس نے حروف تہجی نہیں پڑھے ہوتو آپ یقین مانئے کہ جب وہ نکلے گا تو ویسے ہی جاہل ہوگا جیسے وہ داخل ہوا تھا اسلئے کہ وأتوا البيوت من أبوابها پر اس نے عمل نہیں کیا حروف تہجی بڑے حقیر ہیں کیا حقیقت ہے ا ب ت بچوں کو پڑھایا جاتا ہے لیکن بڑے بڑے علامہ امام غزالی امام رازی بھی محتاج تھے کہ پہلے حروف تہجی پڑھیں پھر احیا علوم الدین اور تفسیر رازی تک پہونچیں وہ احیا علوم اور تفسیر رازی تک ہرگز نہیں پہونچ سکتے اگر انہوں نے حروف تہجی نہ پڑھے ہوتے ایسے ہی ہر فن کا، ہر علم کا، ہر شعبہ کا ایک قانون ہے اس قانون پر چلنا ہوگا۔ یہ ہمارا علم اول تو تجربہ علم ہے مجرد علم کا حال بھی یہی ہے کہ بہت سی چیزیں تو اس میں مشترک ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری دنیا الگ ہے ان کی دنیا الگ لیکن آپ دیکھیں گے تو زیادہ حصہ دنیاوی اور دینی تعلیم میں مشترک ہے مثلاً درجہ بدرجہ پڑھنا استاد سے پڑھنا محنت کرنا استاد کا احترام کرنا۔

یورپ میں استاد و شاگرد:

میرے بھائیو! بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یورپ وغیرہ میں استادوں کا کوئی احترام کرنا نہیں ہوتا ہے آپ یہاں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں پر قیاس نہ کیجئے کا یہ نہ مشرق کے ہیں اور نہ مغرب کے اور نہ دنیا کے اور نہ دین کے یہ تو کچھ نہیں یہ تو خود رو ہیں جنگلی درخت ہیں، میں یورپ گیا ہوں میں نے وہاں کی یونیورسٹیاں دیکھیں مجھے تو حیرت ہوگئی کہ میں کیمبرج آکسفورڈ گیا ضرورت کے لئے بتاتا ہوں آپ کو کہ وہاں معلوم ہوا کہ وہاں ابتک ٹیوٹوریل سسٹم جاری ہے ایک استاد کو اتالیق بنالینا۔ جب آپ کسی آفس میں چلے جائیں اور آپ داخلہ کرائیں بی اے اور ایم اے میں تو آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کس استاد کا انتخاب کرتے ہیں آپ کا مشیر کون ہوگا۔ تو بتانا پڑتا ہے کہ فلاں استاد فلاں پروفیسر کی نگرانی میں اور اس کے مشورہ سے علم حاصل کرنا ہے۔ پھر اس پروفیسر سے بالکل ایسا تعلق ہو جاتا ہے جیسے مرید و پیر کا تعلق ہوتا ہے یعنی طالب علم اس کے مشورے سے کتابیں پڑھتا ہے کتابیں پڑھ کر نوٹس اسکو

دکھاتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ طالب علم کتاب کی صحیح اہمیت سمجھتا ہے اور اس کا جو اصل مغز لب لباب ہے اس کو لے رہا ہے پھر اس کے بعد مضمون اس کو تیار کرنا پڑتا ہے وہ بالکل اس سے ایسا وابستہ ہو جاتا ہے جیسے پہلے ہمارے مدارس میں تھا کہ ہر استاد کے ساتھ چند طلباء ہوتے تھے کہ جو بالکل مربوط ہو جاتے تھے اساتذہ سے۔

اور شعراء تک کا یہ حال تھا کہ ان کے راویہ ہوتے تھے چنانچہ تاریخ ادب میں آتا ہے کہ فلاں فلاں کا راویہ تھا یعنی اس کے اشعار کو اخذ کرنے والا یاد کر لینے والا سنانے والا اس کے ساتھ ساتھ شامل کر لیتے تھے کہ یہ میرا راویہ ہے میں انہیں قصیدہ سناؤں گا اس سے سن لو وہ یہی ہمارے زمانہ تک طالب علم تقسیم ہو جاتے تھے استادوں میں چار طالب علم ایک استاد کے ساتھ لگ گئے ہیں خادم بھی ہیں وہ اس کی خدمت بھی کرتے ہیں جیسے بنائی ہو تو چائے بنائیں گے اس کے آرام کا خیال کریں گے بازار سے اس کی چیزیں لائیں گے اور ہمارے یہاں تو یہ بھی تھا کہ اس کا حساب کتاب بھی دے دیں گے وہ جو اس کے بعد جو کچھ لکھوائے گا اس کو جیب گے وہ جو مواد نکلوائے گا اس کو نکالیں گے، ہم سب لوگوں نے ایسا ہی پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ سسٹم آج تک وہاں کی اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹیوں میں رائج ہے اس کے بغیر وہ طالب علموں کو گویا قبول نہیں کرتے پہلے بتانا پڑتا ہے کہ تمہارا ٹیوٹر کون ہے یعنی تمہارا خاص استاد کون ہے جس کے ساتھ تم وابستہ ہو گے اور اس کے مشوروں پر چلو گے یہی ہمارے علم کا حال ہے۔

علم دین کا امتیاز:

کچھ چیزیں تو مشترک ہیں لیکن پھر اس کے بعد ایک سرحد ایسی آتی ہے ایک ایسی جگہ آتی ہے جہاں سے ہماری سرحد الگ ہو جاتی ہے وہ کیا مثلاً اللہ کی رضا کی طلب ہو اخلاص ہو دعا ہو خدا سے کہ اے اللہ ہم سے تو جو محنت ہو سکتی ہے ہم کریں گے اصل تو دینے والا ہے علم کا۔

حضرت امام شافعیؒ کا شعر یاد کیجئے:

شکوت إلی وکیع سوء حفظی

فأوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم نور من الله

ونور الله لایعطی لعاصی

میں نے اپنے استاد وکیع سے شکایت کی کہ میرا حافظہ کمزور ہے تو انہوں نے کہا کہ گناہوں سے اجتناب کرو بہت زیادہ گناہوں سے دور رہو اس لئے کہ علم جو اللہ کا نور ہے اللہ کا نور نافرمان کو نہیں دیا جاتا۔ یہاں سے ہماری سرحد الگ ہو جاتی ہے وہ سینما جائیں اور کسی اخلاقی کمزوری یا کسی بے راہ روی کے شکار ہو جائیں تو بھی فرق نہیں پڑتا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ فرق پڑتا ہے، لیکن خیر مان لیا نہیں فرق پڑتا ویسے ہی وہ فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو جائیں گے فرسٹ آئیں گے نوکری مل جائے گی لیکن فرق اس میں بھی پڑتا ہے مگر مان لیجئے کہ نہیں فرق پڑتا لیکن ہمارے یہاں تو کھلا ہوا فرق ہے کہ وہ شخص جو استاد کا ادب کرتا ہے اس کی دعائیں لیتا ہے اور اس کے ساتھ بالکل گویا بندھ جاتا ہے اس کا گویا ملازم ہو۔ آپ تاریخ میں پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات ایک ہی آدمی ایک استاد کے ساتھ مخصوص ہو گیا وہ بس بالکل اس کا عاشق بن گیا اور بالکل اس کے علم کو ایسا جذب کر گیا جیسے اسپنج ہوتا ہے وہ پی لیتا ہے اس طرح پی لیا اس کے علم کو پھر چھوڑ دیا اپنے شاگردوں میں۔

علم کے آداب:

تو عزیزو! یہ ہمارا علم جو ہے جس علم کے طالب علم ہیں اس کے لئے یہ جامعہ قائم کیا گیا ہے یہ علم خاص آداب رکھتا ہے، یہ پہلوانی کا علم نہیں ہے کہ آدمی کہے کہ کون ہوتا ہے استاد کیا استادوں کا ادب کیا پرانی دقیانوسی باتیں کرتے ہو، اللہ نے ہمیں ذہن دیا ہے حافظہ دیا ہے محنت صحت ہماری اچھی ہے ہم سب کر کے دکھا دیں گے نہیں ایسا نہیں بعض لوگ کم صلاحیت کے ساتھ ایسے کامیاب ہو گئے ہیں کہ دنیا میں ان کا ڈنکا بج گیا مجھے یاد ہے کہ لاہور میں ایک صاحب تھے انہوں نے غلط لائن اختیار کی تھی اور کالج میں پڑھاتے تھے ان کی ذہانت اور معقولات میں ان کی دسترس مسلم تھی یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال بھی ان کو مانتے تھے لیکن جو فیض ان سے پہنچنا چاہئے تھا جو علوم وسنت کا اجرا ان سے ہونا چاہئے تھا اور جو اشاعت ہونی چاہئے تھی جو ان لوگوں میں بیٹھ کر خشیت پیدا ہونی چاہئے تھی وہ لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی کہنے لگے کہ مولوی حسین احمد مدنی تو ہمارے ساتھ تھے تو ان کا شمار غبی طالب علموں میں تھا وہ کچھ وہاں نمایاں نہ تھے یہ بڑے نمایاں تھے ان سے کیا فیض پہنچا ذہانت کے باوجود۔ ایسے ہی ایک صاحب کہنے لگے ارے مولوی الیاس تو جب دیکھو نفلیں پڑھتے تھے پڑھنے کے زمانے میں نفلیں پڑھتے تھے

مولوی الیاس صاحب نے کیا کر دکھلایا دنیا کو ہلا کر رکھ دیا یہاں تک کہ امریکہ اور افریقہ میں بھی ان کی دعوت مقبول ہوئی تو بھائی بڑے تجربے کی بات بتاتا ہوں تھوڑی صلاحیت سے وہ طریقہ اختیار کر کے و أتوا البیوت من ابوابها پر عمل کر کے آدمی وہاں پہنچ سکتا ہے جہاں وہ لوگ جن کو اپنی ذہانت پر ناز ہے اور اپنے قوت مطالعہ پر اور محنت پر وہ نہیں پہنچ سکتے ان کے پڑھنے پڑھنے میں برکت نہیں ہوگی کہ لوگوں کو نفع پہنچے علم کے ساتھ سنتوں کا اجرا ہو بدعات کا محو ہو معصیتوں سے نفرت پیدا ہو طاعت میں رغبت پیدا ہو نور آئے یہ بات پیدا نہیں ہوگی یہ بات جب پیدا ہوگی کہ آدمی اس طریقہ پر عمل کرے جو استاد بتائے۔ ایک صاحب تھے بہت بڑے علامہ شام کے علامہ بیطار کہنے لگے کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ اپنے استاد کے پاس نہیں جا سکے بڑی سخت سردی تھی، شام میں بڑی سردی پڑتی ہے، برف پڑتی ہے کہنے لگے ہم مجبور ہوگئے دوسرے وقت گئے تو کہنے لگے کیوں نہیں آئے ہم نے کہا سردی بہت تھی اوپر سے ایک گھڑا پانی اور ڈال دیا کہنے لگے کہ یہ سردی ہے کہنے لگے کہ ہم لوگوں نے برداشت کیا اور کوئی شکایت نہیں کی اور پھر جانے لگے اب وہ علامہ بیطار بن گئے انہوں نے خود سنایا یا ایسے ہی ایک صاحب نے ان کے ہم عصروں میں سے سنایا تو یہ اس زمانہ کا طریقہ تھا کہ استاد خدمت بھی لیتے تھے اور پڑھاتے بھی تھے اور پھر استاد استاد ہی نہیں ہوتا تھا ایک طرح کا پیر ہوتا تھا اس کے پاس رہتے کہ نماز کیسے پڑھتا ہے کیا خشوع وخضوع ہے سنتوں کا کہاں تک اہتمام کرتا ہے مسجد آتا ہے تو پہلا قدم کون رکھتا ہے نکلتا ہے تو کون سا قدم نکالتا ہے یہ باتیں بھی سیکھتے تھے استادوں سے۔ اور اب یہ باتیں کم ہوگئیں۔

قحط الرجال کا دور:

آج دیکھئے کوئی غیر معمولی شخص کوئی سطح سے بلند کوئی علامہ کوئی کوہ قامت کوہ پیکر ایسی کوئی ہستی نہیں پیدا ہو رہی ہے اس وقت کوئی امام مزنی، امام نووی، شیخ الاسلام ابن عبد السلام حافظ ابن حجر عسقلانی نہیں بن سکتا تو کوئی حافظ ابن حجر ھیثمی بن جائے ان جیسا ان سے دوسرے تیسرے نمبر کا ادیب ہے لیکن نہیں بن رہے ہیں لوگ یہاں سے مصر تک اور اب تو مصر بھی خالی ہے اس زمانہ میں از ہر بڑے لوگ پیدا کرتا تھا بڑے فضل لوگ راسخ العلم لوگ پیدا کرتا تھا وہاں بھی خزاں کا دور آ گیا اور سیاسی اغراض اور سیاسی مقاصد نے اس کو بالکل بے اثر کر کے رکھ

دیا ہے اور وہاں بھی لوگ پیدا نہیں ہو رہے ہیں اور ہر ملک میں یہ احساس کیا جا رہا ہے کہ اب اس پایہ کے عالم پیدا نہیں ہو رہے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے درس کی پابندی استاد کا احترام، مطالعہ کرنا مطالعہ دیکھے بغیر نہ پڑھنا اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ طالب علموں کا شعار دیکھے بغیر نہ پڑھنا اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحب فرماتے تھے کہ طالب علموں کا شعار یہ ہو گیا ہے نہ دیکھ کر پڑھنا نہ پڑھ کر دیکھنا، دیکھ کر پڑھنا یہ مطالعہ کر کے پڑھیں گے اور پڑھ کر کے اس کو رواں کریں دیکھیں بار بار پڑھیں دونوں چیزیں ختم ہو گئیں بس چند باتیں ہیں جو قصہ نہیں ہے اگر ان پر عمل ہو جائے تو آج بھی اللہ کا قانون یہی ہے جو سینکڑوں ہزاروں برس پہلے تھا اہم اہل علم اب بھی دین کے لوگ پیدا ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کھانے کو تو دے رہا ہے پہلے لوگ کیا کھاتے اور اس سے کیا ذہانت ان کی ترقی کرتی تھی بیچاروں کو ہفتوں مہینوں نہ گھی ملے نہ چکنائی ملے نہ فروٹ ملے نہ گوشت یہ سوکھی روٹی کھا کے انہوں نے اتنے بڑے کام لئے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ بعض ایسے گذرے ہیں کہ کھڑے ہو گئے نان بائی کی دکان پر اور روٹی توے پر ڈالنے کی جو خوشبو ہوتی ہے اس سے طاقت حاصل کی اور آ کر پھر پڑھنے لگے۔ بس وہی بات ہے کہ **واتوا البیوت من ابوابھا** کہ بیت علم میں باب علم سے داخل ہو، باب علم ایک ہی قواعد ضوابط پر چلنا احترام کرنا نظام کے ساتھ رہنا مطالعہ دیکھنا محنت کرنا اور بھائی اگر تم نے یہ کر لیا تو سمجھو گے انشاء اللہ نام روشن کرو گے اپنے ملک کا بھی اور اپنی ملت کا بھی اور نہیں تو بس شد بد ہو جائے گی مشکل سے کوئی مسئلہ بتا سکو گے کوئی کتاب پڑھا سکو گے یا علمی کام کر سکو گے میں سمجھتا ہوں کہ بس یہ کافی ہے، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ شر و آفات سے بچائے اخلاص عطا فرمائے اپنے کلام کا حاملین کلام کا اپنے رب کا احترام و ادب نصیب فرمائے۔ (آمین)

و آخر دعوانا الحمد اللہ رب العالمین۔

اصل مسئلہ ترجیح کا ہے

دوسری دفعہ سرزمین بھٹکل آمد پر مورخہ ۲ جنوری ۱۹۸۳ء کو وہاں کی سب سے بڑی اور معروف دینی درس گاہ جامعہ اسلامیہ کے علماء، طلبہ میں حضرت مولانا قدس سرہ کا ایمان افروز بیان ہوا جو ہر مدرسے اور دینی ادارے سے تعلق رکھنے والے فرد کے لئے پیام راہ کی حیثیت رکھتا ہے

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین خاتم النبیین وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین اما بعد.

اول سلام:

عزیزو! جب کوئی کہیں سے آتا ہے تو پہلے سلام کرتا ہے، ہم آپ کے پاس دور سے آئے ہیں، ہمیں بھی چاہئے کہ آپ کو سلام کریں، اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں اس کی حیثیت محض سلام کی ہے باقی سلام کے بعد کلام بھی ہوتا ہے وہ شاید بعد میں ہو میں تو اس وقت صرف ہدیہ سلام پیش کر رہا ہوں، جیسا کہ حکم ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

فاذا دخلتم بیوتا فسلموا علی انفسکم تحیة من عند الله مبارکة طیبه

(جب تم گھروں میں داخل ہونے لگو تو اپنے لوگوں کو جو لوگ وہاں موجود ہوں ان کو سلام کر لیا کرو جو دعا کے طور پر اللہ کی طرف سے مقرر ہوا ہے بابرکت اور عمدہ چیز ہے۔

موقعہ سے فائدہ اٹھائیے:

عزیزو! آج کل عام رواج ہے، جب ادارے ہوتے ہیں تو باہر کے لوگ آتے ہیں بلائے بھی جاتے ہیں، خود بھی آتے ہیں، لیکن بہت سے آنے والوں کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیوں آئے ہیں اور اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اسی طرح بہت سے رہنے والوں کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ آمد محض ایک رسمی ورواجی آمد ہے یا اس سے کوئی دینی علمی فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ہماری حیثیت اور ہمارے

رفقاء کی حیثیت باہر سے آنے والے مہمانوں یا مشاہیر کی آمد یا لیڈروں کی آمد نہیں بلکہ اپنوں کی آمد ہے، اس جامعہ کا تعلق شروع سے ندوۃ العلماء اور وہاں کے کارکنوں سے رہا ہے بلکہ حقیقت میں اس کی بنیاد ایک ندوی فاضل مولانا عبدالحمید صاحب ندوی مرحوم نے ڈالی ہے، وہ یہاں آئے، انہوں نے کچھ تعلیمی خدمت شروع کی تو یہ خدمت برگ و بار لائی جو لوگ آج جامعہ کے روح رواں ہیں وہ زیادہ تر تو ان ہی کے فیض یافتہ ہیں تو گویا اس جامعہ کی بسم اللہ ہی ہوئی ندوہ کے تعلق سے، پھر اس کے بعد جب جامعہ کی بنیاد ڈال دی گئی تو ندوہ ہی کے تعلق والوں کو بلایا گیا اور اس کے بعد برابر آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے، یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ندوہ اور غیر ندوہ میں کچھ فرق ہے بلکہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کم سے کم اس وقت جو لوگ آئے ہیں، یہ سب گھر ہی کے لوگ ہیں، ایسے ہی ہیں جیسے ایک خاندان کی شاخیں ہو جاتی ہیں کوئی قریب رہتا ہے کوئی دور رہتا ہے ایک شاخ کے لوگ دوسرے شاخ کے لوگوں سے ملنے جاتے ہیں، وہ ملنا خاندانی قسم کا ہوتا ہے، ویسے ہی خاندانی قسم کا سفر یہ بھی ہے اور اس میں اپنے ایک عزیز کی تقریب میں شریک کی نیت بھی شامل ہوگئی ہے، تو آپ ہم لوگوں کو باہر کے اجنبی یا تماشا کی حیثیت سے نہ دیکھئے کہ آپ کہیں کہ فلاں بھی آیا فلاں بھی آیا، بلکہ ذہن میں یہ ہونا چاہئے کہ یہ لوگ دو چار دن رہیں گے، ان سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اب جامعہ اس درجہ کو پہنچا کہ دور دور سے لوگ آتے ہیں اور اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اپنی چیز سمجھتے ہیں، اسی کے ساتھ نیت بھی درست کرنا بہت ضروری ہے اور ہماری بھی نیت یہ ہونی چاہئے کہ ہم اپنے عزیزوں سے اور اپنے خاندان کے بچوں سے ملنے آئے ہیں آپ کی بھی نیت یہ ہونی چاہئے کہ ہمارے خاندان میں کچھ بڑے کچھ ہمارے مشیر یا جن کو خدمت کا جذبہ ہے شوق ہے وہ آئے ہیں ان کے دوران قیام میں جلسے ہوں گے تقریریں ہوں گی، عمومی خطاب ہوں گے شاید ہمارے دوست منیری صاحب نے اس کا نظام بنایا ہو لیکن اس کے علاوہ ہمارے ساتھیوں سے آپ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں ان میں بعض دارالعلوم کے استاذ ہیں اور وہ آپ سے عمر میں اور تعلیم میں قریب ہیں مناسبت رکھتے ہیں ان میں وہ تفاوت نہیں ہے جو ہمارے آپ کے درمیان ہے آپ ان کے ساتھ زیادہ بے تکلفی سے مل بھی سکتے ہیں بات بھی کر سکتے ہیں، ان کو بتلائیے کہ آپ نے اب تک کیا پڑھا پھر ان سے پوچھئے اور مشورہ لیجئے کہ

اس کے بعد کس طرح پڑھیں کس ترتیب سے پڑھیں وہ کتابوں کا انتخاب کر دیں، ان سے کہئے کہ ہمارا فلاں مضمون کچھ کمزور ہے، کیا ہے یا فلاں مضمون سے زیادہ مناسبت نہیں کیسے مناسبت پیدا ہو سکے گی، اس کے مبادی کیا ہیں، کس طرح شروع کریں اس سے کس طرح مناسبت پیدا کریں، سب سے پہلے اور سب سے اہم تفسیر، حدیث، فقہ اور صرف ونحو غیرہ کے مضامین ہیں اس کے بعد جس کو شوق ہو وہ ادب وانشاء کے بارے میں بھی مشورہ کر سکتا ہے، اس وقت جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں، الحمد للہ وہ لکھتے پڑھتے ہیں، ان کے مضامین چھپتے ہیں، آپ لوگ بھی دیکھتے ہوں گے، ان لوگوں سے پورا فائدہ اٹھایئے، تین چار دن وہ لوگ یہاں قیام کریں گے ان دنوں میں ذہن کو حاضر رکھئے اور اس وقت کو قیمتی سمجھئے کوشش بھی کیجئے دعا بھی کیجئے کہ اتنی دور سے جو سفر ہوا ہے یہ مفید اور کارآمد ہو، یہ نتیجہ خیز ہو اس لئے کہ یوں ہی کوئی اتنی دور کسی سے ملنے کے لئے نہیں جایا کرتا ہے، جب کوئی ملنے آتا ہے اتنی دور سے تو بہت غنیمت سمجھنا چاہئے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے، آپ لوگوں کو اس سے خوش ہونا چاہئے جیسے سیاسی لوگ خوش ہوتے ہیں بڑے بڑے لیڈرون کے آنے پر۔ آپ کو خوش ہونا چاہئے اساتذہ اور ماہرین فن کی آمد پر، ایسے مواقع کم ملتے ہیں اور مل جائیں تو انہیں ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

ہاتھی یا علم حدیث:

ایک لطیفہ سناتا ہوں ایک مرتبہ لکھنؤ سے بارہ بنکی گیا جو لکھنؤ سے پندرہ سولہ میل دور ہوگا، لکھنؤ سے میں وہاں گیا تو میرا وہاں خطاب پیام انسانیت کے سلسلہ میں تھا اور اسی روز وہاں سابق وزیر اعظم مسز گاندھی آئی ہوئی تھیں، لوگ منتشر تھے، تقسیم ہو گئے تھے، اکثر لوگ وہاں سے تماشا ہی دیکھنے کے لیے چلے گئے کیونکہ بارہ بنکی چھوٹی جگہ ہے چھوٹا ضلع ہے، اس میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی آئیں تو بڑی بات تھی، جتنے مجمع کی توقع تھی اتنا مجمع ہمارے جلسہ میں نہیں تھا، پھر بھی بہت سے لوگ آئے وہ قابل داد تھے تو میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں وہ حسب حال ہے، ایک مرتبہ امام مالکؒ مؤطا کا درس دے رہے تھے، مدینہ میں ایک ہاتھی آ گیا اور مدینہ میں ہاتھی ہوتا نہیں عرب ہی میں ہاتھی نہیں ہوتا، شور مچ گیا، ہاتھی آیا ہاتھی۔ جاء الفیل جاء الفیل وہ ہمیشہ پڑھ رہے تھے الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل الم یجعل کیدھم فی تضلیل۔ انہوں نے اور جانور تو دیکھے تھے۔ گھوڑا

تو ان کے گھر کی چیز تھی، اونٹ بھی ان کے گھر کی چیز تھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا، تو بے اختیاری اور غیر ارادی طریقہ پر لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے، یہ امام مالکؒ کا حلقہ درس تھا، وہاں بہت منتخب لوگ تھے، پھر بھی لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے، لیکن ان کے ایک شاگرد یحییٰ حلقہ درس سے نہیں اٹھے، وہ امام مالک کے خدمت ہی میں بیٹھے رہے۔

امام مالک نے کہا کہ اے یحییٰ تم نہیں گئے تمہارے ملک میں بھی تو ہاتھی نہیں ہوتا کہا ہم ہاتھی دیکھنے نہیں آئے ہیں، ہم آپ کو دیکھنے آئے ہیں، انہوں نے غالباً دعا دی اس کا نتیجہ کہ ایسا دنیا میں کم پیش آیا ہے کہ یحییٰ بن یحییٰ مسعودی کی وجہ سے اس سارے شمالی افریقہ میں امام مالک کا مسلک پھیلا اور اس علاقہ کے سبھی لوگ مالکی ہیں، یہ موجودہ روایت مؤطا کی جو ہم تک پہنچی ہے یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی روایت ہے اور ایسا کم ہوتا ہے کہ علاقہ کا علاقہ ملک کے ملک ایک مسلک کے ہوں، لیکن آپ تصور کیجئے کہ لیبیا جس میں مالکیہ کی بڑی تعداد ہے، لیبیا سے شروع ہو کر جو شمالی پٹی چلی گئی ہے، مراکش پر بلکہ آبنائے جبل الطارق پر ختم ہوتی ہے، یہ پورا علاقہ سو فیصد مالکی ہے، بے شک اس میں ابن بادیس کا بھی بہت بڑا دخل ہے، جس نے مذہب مالکی کو سرکاری مذہب بنا دیا لیکن بیج لایا ہوا ہے یحییٰ بن یحییٰ کا، ایک بات تھی ذرا سی بات اللہ کو پسند آئی، ہاتھی دیکھنے نہیں گئے تو ان کے علم اور ان کی ذات سے اتنی برکت ہوئی، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے امام مالک کے درس حدیث کو ہاتھی کا تماشا دیکھنے پر ترجیح دی۔

ترجیح کی بات:

عزیزو! سارا معاملہ ترجیح کا ہے، تم کس کو کس پر ترجیح دیتے ہو؟ سارا قرآن اسی سے بھرا ہوا ہے، اللہ کے حکم کو، ترجیح دیتے ہو یا خواہش کو ترجیح دیتے ہو، رسول کے کہنے کو ترجیح دیتے ہو یا رسم ورواج کو ترجیح دیتے ہو، مصلحت کو ترجیح دیتے ہو یا حکم الٰہی کو ترجیح دیتے ہو، اسلام کا معاملہ شریعت کا معاملہ ہے، یحییٰ بن یحییٰ نے ہاتھی پر امام مالکؒ کو ترجیح دی تو اللہ نے اور بہت سے داعیوں پر ناشرین علم پر ان کو ترجیح دی اور جس کتاب کے وہ حامل وشارح بنے اس کو اچھی اچھی کتابوں پر ترجیح دی گئی سب کتابیں اچھی ہیں، ہدایہ اگر وہاں پہنچتی یا وہاں مسند امام ابوحنیفہ ہوتی وہ بھی خیر سب سراپا نور، لیکن صرف اس ایک عمل کا اثر یہ ہوا کہ اس حامل علم کو ترجیح دی گئی دوسرے حاملین علم پر، اور اس محمول کو ترجیح دی گئی دوسرے محمولات پر دوسری جو علم کی سوغاتیں

تھیں، علم کے تحائف تھے ان پر ان کو ترجیح دی، سارا معاملہ ترجیح کا ہے آج بھی اتفاق سے آپ کے شہر میں ایک بڑی شخصیت آئی ہوئی ہے، آج ہی اللہ نے آپ کو یہ ایک منظر دکھلایا، امتحان میں تو نہیں ڈالا کہ وہی وقت ہوتا ہمارے بھی آنے کا لیکن منظر آپ کو دکھایا کہ یہاں ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیت آئی اور ہم طالب علم بھی آئے۔ اگر آپ کے دل میں ان طالب علموں کی عزت ہے، ہمارے آنے سے آپ کو زیادہ خوشی ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی یہ خوشی رنگ لائے گی یقین مانئے اگر آپ نے کہا الحمد للہ آج ہمارے کچھ بزرگ، ہمارے کچھ مشفق ہمارے کچھ خیر خواہ ہمارے لیے دعا کرنے والے لوگ آئے ہیں، ہم بڑے خوش نصیب ہیں تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند آئے گی اور کچھ تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے معاملہ میں علم نافع کا فیصلہ فرماوے۔

شعائر اللہ کا احترام:

یہ جو کچھ آپ شریعت کو دیکھتے ہیں، یہ سب احترام کی باتیں ہیں، کرنا کرانا تو بعد کا مرحلہ ہے اور ضروری ہے لیکن پہلا مرحلہ احترام کا معاملہ ہے اللہ اور رسول کو اللہ و رسول سے نسبت رکھنے والی چیزوں کو کس نظر سے دیکھا جائے، یہی حقیقت ہے شعائر اللہ کی، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے **ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب** تو تعظیم شعائر اللہ دلیل ہے قلوب میں تقوی کی، قلب میں اللہ کی عزت ہے تو جو چیز اللہ کے لیے کہلاتی ہے اس کے لیے بھی عزت ہوگی ایسے ہی ہم لوگ کوئی چیز نہیں اور کون کیا چیز ہے، سوائے اللہ کے اور اللہ کے رسول کے صحابہ کے اور کبار اولیاء اللہ کے سب برابر ہیں، ایک طرح لوگ ہیں، لیکن سارا انحصار جو ہے وہ نظر پر ہے، طریقہ فکر پر ہے، نقطہ نظر پر ہے اور ذہنی کیفیت پر ہے **ومن یعظم شعائر اللہ** میں ذہنی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے، ایک بزرگ کو بہت بڑے مدارج عالیہ ملے، مجھے اس وقت ان کا نام یاد نہیں، فضیل بن عیاض یا جنید بغدادی کا نام یاد آتا ہے، کسی نے پوچھا کہ حضرت اتنا بڑا درجہ اللہ نے نصیب فرمایا، کیا بات ہے کہنے لگے بات تو اتنی ہے کہ میں چلا جا رہا تھا ایک جگہ میں نے ایک کاغذ پڑا دیکھا، اس پر اللہ کا نام لکھا تھا میں نے اٹھایا، آنکھوں سے لگایا اس کو ایک جگہ عزت کے ساتھ کسی دیوار وغیرہ میں حفاظت سے رکھ دیا، اللہ کو یہ ادا پسند آئی اور اللہ نے مجھے یہ مرتبہ عطا کیا۔

اصل میں تعظیم جو ہے محبت وقعت کا اس پر انحصار ہے، اس کی دلیل ہے یہی علم کا حال ہے۔

بے حرمتی کا انجام:

ایک عجیب واقعہ جو بڑا عبرتناک ہے، شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو، حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے شاگردوں میں ایک صاحب تھے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے دہریہ ہوگئے تھے کلکتہ میں رہتے تھے گورکھپور کے رہنے والے تھے، شاہ اسماعیل شہید کے ساتھ پڑھے ہوئے تھے، بڑا عجیب وغریب واقعہ ہے جب حضرت شاہ اسماعیل صاحب حج کو جانے لگے تو ٹیپو سلطان، وہ ٹیپو سلطان جو آپ ہی کے علاقہ کے تھے، ان کے پوتوں کے وہ اتالیق تھے، جن کی وجہ سے ٹیپو سلطان کے پوتوں پر کچھ اثر ہو رہا تھا تو ٹیپو سلطان کی پوتی یا صاحبزادی نے حضرت سید احمد شہید سے کہلایا کہ ہمارا خاندان تو آپ ہی کے خاندان کا متوسل ہے۔

ہمارے اجداد مادری میں شاہ ابواللیث صاحب جو سید صاحب کے حقیقی ماموں تھے سفر حج سے واپسی پر ۱۲۰۸ھ میں ٹیپو سلطان (م ۱۲۱۴ھ ۱۷۹۹ء) کی حیات میں کوڑیا بندر پر (منگلور) میں اترے اور مختصر علالت کے بعد وہیں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان ٹیپو کے اس مجاہد خاندان کے حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی اس شاخ اور سید صاحبؒ کے اجداد مادری سے عقیدت وارادت کے مستحکم تعلقات تھے۔ تو صاحبزادی نے کہلایا کہ ہمارے بھائی صاحبان پر بڑا اثر پڑ گیا ہے، فلاں مولوی صاحب اور وہ ملحد ہو گئے ہیں، آپ ذرا توجہ فرمائیں اور ان کی اصلاح فرمائیں، الحمد للہ ان کی اصلاح ہوئی وہ سب بیعت ہو گئے تو ان مولوی صاحب کے الحاد کی طرف جانے کی وجہ بھی ایک عجیب وغریب معلوم ہوئی، زیادہ کرید کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب بخاری کا درس دے رہے تھے، بڑے زور کی ہوا چلی، بار بار ورق الٹتے تھے، آپ سب جانتے ہیں بخاری کے اوراق جو بڑے ہوتے ہیں تو اس کے ورق کی آواز سے سبق میں انتشار ہوا، شاہ صاحب نے کہا بھائی! اس پر ہاتھ رکھ لو یا کوئی چیز رکھ لو تو کسی نے ہاتھ رکھا کسی نے کوئی دینی کتاب رکھی، بس اس شخص نعوذ باللہ اس پر پاؤں رکھ دیا، یہ کرنا تھا کہ لائن بدل گئی تو سارا معاملہ عزت واحترام کا ہے، سب

وہیں سے ہوتا ہے وہیں سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے۔ لیکن جو قلبی کیفیت ہے وہ بڑی چیز ہے چنانچہ یہی دیکھا کہ جن لوگوں میں استاد و کتاب کا احترام تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت نفع پہنچایا عالم کونسا بڑا ہے اس کو اللہ جانتا ہے بلکہ ہمیں بھی کچھ تھوڑا بہت معلوم ہو سکتا ہے، کم علموں کو بھی کہ بعض لوگ ان سے زیادہ ذی علم ہیں بہت زیادہ ذہین ہیں لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا، فائدہ ان سے ہوا جن کا علم اتنا نہیں تھا وجہ کیا تھی، وہی اساتذہ کا ادب واحترام اور ان کی دعائیں بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی ایک مرتبہ دورے پر تھے تو سب شاگردوں نے کہا کہ مصنف ہدایہ آئے ہیں، مصنف ہدایہ آئے ہیں ایک شور مچ گیا، جو جہاں تھے سب کام چھوڑ کر ہر طرف سے طلباء ملنے آئے سلام کرنے آئے کہ ہمارے استاد آگئے ہیں، صرف ایک طالب علم جو اچھے ممتاز تھے وہ نہیں آئے تو انہوں نے کہا کہ بھئی فلاں آدمی نہیں آئے خیر اس کے بعد کسی موقعہ پر وہ ملے تو انہوں نے کہا ہم تو تمہارے دیار میں آئے تھے تم ملنے نہیں آئے؟ تو اس نے کہا حضرت! والدہ بیمار تھیں چھوڑ کر نہیں آسکے تو انہوں نے کہا انشاء اللہ تمہاری عمر دراز ہوگی، یہ بڑا اچھا فعل ہے برکت ہوگی تمہاری عمر میں، لیکن درس میں رونق نہیں آئے گی تم نے ایک اچھا کام کیا اس کا اثر عمر درازی میں ظاہر ہوا چونکہ وجود کا تعلق ماں سے ہے جب وجود ہے تو عمر بھی ہے تو وہ جو جسمانی تعلق ماں سے ہے تو جسمانی فیض تم کو پہنچے گا کہ تمہاری عمر دراز ہوگی لیکن وجود معنوی جس سے تھا، وجود روحانی جس سے تھا گویا اس پر تم نے ترجیح دی ہے ترجیح کا معاملہ ہے تو درس میں رونق نہ ہوگی، یہ زبان سے نکل گیا تو لکھا ہے لوگوں نے کہ ان کے درس میں سب کچھ تھا لیکن رونق نہیں تھی یعنی لوگ آئیں اور استفادہ کریں، تلامذہ کی کثرت ہو، بس بھائیو! میں نے سلام کے موقعہ پر یہ باتیں کیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک عمل کی توفیق عنایت فرمائے آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ اجمعین

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعوت وتبلیغ اور مطالعہ کے لیے مستند کتب

کتاب	زبان	مصنف
حیاۃ الصحابہ	۳ جلد اردو ترجمہ	مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ مولانا محمد احسان صاحب
حیاۃ الصحابہ	۳ جلد انگریزی	
فضائل اعمال	اردو	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فضائل اعمال	انگریزی	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فضائل صدقات مع فضائل حج	اردو	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فضائل صدقات	انگریزی	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فضائل نماز		شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فضائل قرآن		شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فضائل رمضان		شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فضائل حج		شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فضائل تبلیغ		شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فضائل ذکر		شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
حکایات صحابہ		شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
شمائل ترمذی		شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
منتخب احادیث	اردو	مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ مترجم مولانا محمد سعد مدظلہ
منتخب احادیث	انگریزی	مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ مترجم مولانا محمد سعد مدظلہ